شیعہ اور جابر حکمران

علامہ محمد جواد مغنیہ (لبنان)

شیعہ اور جابر حکمران

علامہ محمد جواد مغنیہ (لبنان)

ترجمہ، تدوین، حواشی

رضا حسین رضوانی

مجمع علمی اسلامی تجریش۔ تہران

فہرست اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵	۱۷	انھیں اور اُن کی اہلیہ کو قتل کر دیا	انھیں قتل کر دیا
۲۷	۴	ذاتی اعتراض	ذاتی اغراض
۶۶	۱۰	۳۰ جلدوں	۴ جلدوں
۱۱۸	۷	چنانچہ اُس نے بڑی انھیں	چنانچہ اُس نے بڑی جانفشانی سے انھیں
۱۶۳	۴	تفضیل علیؑ سنی ہم نے	تفضیل علیؑ ہم نے سنی
۲۲۶	۵	حامد بن قحطبہ	حمید بن قحطبہ
۲۴۷	۲۲	رَأْسُ الْفَتٰی فِیْ حَسَرِ اُمِّہٖ	رَأْسُ الْفَتٰی فِیْ حِجْرِ اُمِّہٖ
۳۰۴	۶	سید مرتضیٰ علم الہدیٰ	شیخ مرتضیٰ انصاری

انتساب

بہترین لوگوں کے نام
جو "رسول رحمتؐ" کے منشور میں دیے گئے
حقوق، انصاف، مساوات اور آزادی
پر دل کی گہرائیوں سے ایمان رکھتے ہیں

تالیفات علامه محمد جواد مغنیه

۱. الوضع الحاضر فی جبل عامل
۲. مع الشیعه الامامیه
۳. الفصول الشرعیه
۴. اهل البیتؑ
۵. الاسلام مع الحیاة
۶. اللّٰه والعقل
۷. الآخرة والعقل
۸. النبوة والعقل
۹. المهدیؑ والعقل
۱۰. الفقه علٰی المذاهب الخمسة
۱۱. الزواج والطلاق علٰی المذاهب الخمسة
۱۲. نظرات فی التصوف
۱۳. الوصایا والمواریث علٰی المذاهب الخمسة
۱۴. مفاهیم انسانیه فی کلمات الامام الصادقؑ
۱۵. المجالس الحسینیة
۱۶. فضائل الامام علیؑ
۱۷. معالم الفلسفة الاسلامیة
۱۸. فلسفة المبداء والمعاد
۱۹. مع علماء النجف الاشرف
۲۰. مع بطلة کربلا
۲۱. هذه هی الوهابیة
۲۲. علیؑ والقرآن
۲۳. تفسیر القرآن. تفسیر الکاشف (۷ جلد)
۲۴. الشعیة والحاکمون (کتاب حاضر)

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

ایک حکمران کے لئے خواہ وہ کتنا ہی قابل اور تجربہ کار کیوں نہ ہو عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا ممکن نہیں بجز یہ کہ

(۱) وہ قوم سے مشورہ کرتا ہو، اسے اعتماد میں لیتا ہو، اُس کی امنگوں کا احترام کرتا ہو اور قومی مفاد کے معاملات میں قوم کو ساتھ لے کر چلتا ہو۔ یا

(۲) وہ دینی امور کی باریکیوں اور دنیاوی امور کی نزاکتوں کو جانتا ہو، قومی مصلحتوں کو پوری طرح سمجھتا ہو اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہو۔ نیز اُس نے خود کو خدا کی راہ اور قوم کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہو۔

اس میں وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود ہوں جو شیعہ دبستان فکر ایک دینی و دنیوی سربراہ کے لئے معتبر گردانتا ہے۔ وہ افضل الناس اور الٰہی صفات کا حامل ہو تاکہ روئے زمین پر نیابت الٰہی کی ذمے داریاں ادا کر سکے۔ چنانچہ جب کہا جاتا ہے کہ حکمران کی نافرمانی خدا کی نافرمانی کے مترادف ہے تو اس سے ایسا ہی حکمران مراد ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی حکمران میں مذکورہ دونوں شرائط نہ پائی جاتی ہوں تو قدرتی طور پر وہ اپنی قوت قاہرہ سے عوام کو فتح کرنے کی کوشش کرے گا جس سے لامحالہ ریاست میں جبر و تشدد، گھٹن اور ناانصافی کا دور دورہ ہوگا۔

بے شک حکمران کے بارے میں شیعہ نکتہ نظر علمی لحاظ سے بالکل صحیح ہے لیکن فی زمانہ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی ایسا حکمران نہیں ملے گا۔ اس لئے ضروری

ہے کہ آج کا حکمران عوامی جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اور قومی مفادات کا سودا کئے بغیر ریاستی امور انجام دے۔ حکمران اور عوام کے درمیان کشمکش اور کشاکش کا بنیادی سبب تمام تر اختیارات کا ایک آمر اور جابر حکمران کے ہاتھوں میں مرتکز ہونا ہے جس سے ظلم، جبر اور کرپشن بڑھتا ہے۔ اگرچہ آمریتوں میں بلا لحاظ دین و مذہب لوگوں پر ظلم وستم ہوتا ہے لیکن زیر نظر کتاب میں صرف اُن مظالم کا تذکرہ کیا گیا ہے جو طول تاریخ میں شیعوں پر روا رکھے گئے ہیں کیونکہ شیعہ عقیدے کی رو سے دینی اور سیاسی رہنما سربراہی کا اہل اُسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ معصوم عن الخطا ہو یا پھر ایک ایسا شخص ہو جو اپنی اہلیت اور ذاتی خوبیوں کی بنا پر معصوم کی پسند کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ بصورت دیگر اسے ''دین'' کے نام پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ ہاں! اگر لوگ اُس رہنما پر اعتماد کرتے ہوں اور وہ عوام کی توقعات پر پورا اترتا ہو تو اُسے ''عوام'' کے نام پر حکومت کرنے اور قوم کی خدمت کرنے کا استحقاق حاصل ہے۔[1]

اس کے برعکس دوسرے اسلامی دبستان ہائے فکر میں حکمران کے لئے ایسی شرائط موجود نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک حکمران کے خلاف جو ''دین'' کے نام پر حکومت کرتا ہو ''خروج'' یعنی بغاوت کرنا جائز نہیں ہے چاہے وہ آمر، جابر اور فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ اس موضوع پر ہم نے اس کتاب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ماضی میں چونکہ حکمران لوگوں پر ''اسلام'' کے نام پر حکومت کرتے تھے اور وہ شیعہ عقیدے کی رو سے حکمرانی کی شرائط پر پورا نہیں اترتے تھے اس لئے شیعہ اُن حکمرانوں کو غاصب جانتے تھے اور اُن کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔ جوں جوں شیعیت پھیلتی جاتی تھی اور اسے لوگوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہو رہی تھی طاغوتی حکمرانوں کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں۔ چنانچہ شیعوں کو اُن کے ہاتھوں طرح طرح

۱۔ یہ بات PEOPLES REPUBLIC اور ISLAMIC REPUBLIC یعنی عوامی جمہوریہ اور اسلامی جمہوریہ کا فرق واضح کرتی ہے۔

کی سزائیں اور ایذائیں سہنی پڑتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی حکمران خاص کر آمر حکمران عوام کے کسی طبقے کی مخالفت برداشت نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ''شیعہ'' تاریخ کے جابر اور آمر حکمرانوں کے ظلم کا نشانہ بن گئے اور انھوں نے شیعوں کو دیوار سے لگا دیا۔ اُن کی کوشش تھی کہ ریاستی طاقت کے بل بوتے پر شیعوں کو کچل کر رکھ دیں تاکہ اُن کے خلاف آواز اٹھانے والا کوئی زندہ نہ بچے۔

زیر نظر کتاب اس بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک پر سے پردہ اٹھاتی ہے جو جابر حکومتوں نے شیعوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ یہ کتاب اُن لوگوں کے اس شرمناک طرز عمل کو زیر بحث لاتی ہے جس کے نتیجے میں اسلام اور اسلامی اتحاد کمزور ہوگئے اور جمہور مسلمانوں کے دلوں میں شیعہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت پیدا ہوگئی جو کئی صدیوں تک قائم رہی۔ نیز اس کتاب میں اُن حکمرانوں کے مظالم پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھوں نے عوامی آرزوؤں کا خون کیا اور حکومت کے حقداروں کا حق غصب کرکے سیاسی بساط پر ناجائز قبضہ جمایا۔ اس کتاب میں شہادتگہ عدل میں قدم رکھنے والے اُن سرفروشوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جو آمریت کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور جنھوں نے آمریت کے خلاف معرکہ آرائیوں میں اپنی اور اپنے پیاروں کی جانوں کا قیمتی نذرانہ پیش کیا۔ آخر اُن کا خون رنگ لایا جس کے نتیجے میں تاج اچھالے گئے اور تخت گرائے گئے۔ ملوکیت اور آمریت روبہ زوال ہوئی تو یکے بعد دیگرے جابر بادشاہوں کا صفایا ہوگیا اور اُن کے اقتدار کی بساط لپیٹ دی گئی۔

شیعہ ایک دینی حکمران میں پائی جانے والی شرائط کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے یہ شرائط اپنی فقہی اور اعتقادی کتابوں میں درج کی ہیں۔ شیعہ علماء یہی باتیں اپنے طلباء کو دینی مدارس میں پڑھاتے ہیں، اہل ایمان کو مساجد میں بتاتے اور مجالس میں سمجھاتے ہیں۔ شیعہ برملا کہتے ہیں کہ جو حکمران ''دین'' کے نام پر حکومت کرتا ہو اور مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط پر پورا نہ اترتا ہو وہ خدا کا، اُس

کے فرشتوں کا اور اُس کے نبیوں کا دشمن ہے۔ اس سلسلے میں اہل تشیع شیعہ اور سنی حکمرانوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک اُس شیعہ حکمران کا جرم جو صحیح طریقے سے حکومت نہ کرتا ہو زیادہ سنگین ہے کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے خلاف عمل کرتا ہے۔ شیعیت اس سلسلے میں حکمران کے علم اور عدل کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ شیعیت میں یہ چیز بھی ناجائز ہے کہ مفضول کو افضل پر فوقیت دی جائے۔[۱]

پس افضل لوگوں کے ہوتے ہوئے جو غیر افضل لوگ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو جاتے ہیں وہ غاصب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ عقیدے کے مطابق آل بویہ، فاطمی، حمدانی اور صفوی حکومتیں دینی حکومتیں نہیں بلکہ سیاسی حکومتیں تھیں۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفاء بھی ''دینی نہیں بلکہ سیاسی حکمران تھے۔''

یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ دین کی رو سے شیعہ اس بات کے خلاف نہیں ہیں کہ عوامی رائے اور مرضی سے ایک جمہوری حکومت تشکیل پائے جو انسانی حقوق کا دفاع کرے نیز سرحدوں کی حفاظت اور ملک کے نظم و نسق کی ذمے داری سنبھالے۔ تاہم ایسی حکومت کو دینی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

لہٰذا اس کتاب الشیعہ والحاکمون کے سرورق پر لفظ ''حاکمون'' استعمال کرنے سے ہماری مراد فقط سنی حکمران نہیں بلکہ تمام جابر اور آمر حکمران ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ سنی حکمرانوں نے شیعوں پر جو ظلم و تشدد کیا تھا اُس کی

۱۔ شیعوں کے نزدیک غیر افضل، افضل سے برتر نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں اَفَمَنْ یَّھْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَھِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّھْدٰی فَمَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ. (سورۂ یونس: آیت ۳۶) سے استدلال کرتے ہیں۔
زید شہید کے پیرو حضرت علیؑ کو افضل مانتے تھے مگر اُن کے نزدیک افضل کی موجودگی میں غیر افضل کا امام ہونا جائز تھا۔ زیدیوں کے نزدیک اولاد فاطمہؑ میں سے جو شخص حق کے دفاع کی خاطر قیام کرے وہ امام بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ عالم، متقی، دلاور اور سخی ہو۔

وجوہات سیاسی تھیں، دین سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

قصہ کوتاہ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ ہے کہ قاری کو اپنے عقیدے، اظہار رائے اور عمل میں آزادی حاصل ہو تاکہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر ضرورت پڑے تو اسے چاہیے کہ اپنی متاع جان بھی لٹا دے بلکہ اس سے بڑھ کر بھی قربانی کے لئے تیار رہے۔

اگر اس کتاب سے وہ مقصد حاصل ہو جائے جس کا میں متمنی ہوں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو یہ میری کوتاہی ہوگی۔ تاریخ کے گہرے مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ اگر حکمران آمر اور جابر نہ ہوتے تو اسلام اس انداز سے پھیلتا کہ آج اس روئے زمین پر ایک بھی غیر مسلم نہ ہوتا۔

آخری بات یہ ہے کہ جب لوگ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں تو اُن کے رنگ ڈھنگ بدل جاتے ہیں اور اُن کا دامن اچھے اوصاف سے خالی ہو جاتا ہے۔ (اقتدار میں آنے سے پہلے لوگ جن سیاستدانوں کو معتبر خیال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کو نہیں توڑیں گے وہی سیاستدان اقتدار میں آنے کے بعد توڑ جوڑ کی ڈپلومیسی کرنے لگ جاتے ہیں) اس قاعدے سے صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنھیں خدا گمراہی سے محفوظ رکھتا ہے البتہ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

میں خداوند عظیم سے دعا کرتا ہوں کہ وہ محمدؐ و آل محمدؐ کے طفیل ہمیں نیک اوصاف اور اچھے اخلاق سے خود کو آراستہ کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

بیروت ۱۹۶۲ء　　　　محمد جواد مغنیہ

مسلمانوں کے مابین اختلافات

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسلام کے بانی تھے۔ آپ کے زمانے میں سب مسلمان متحد تھے اور کسی فرقے کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرتؐ وہ واحد مرجع تھے جن سے قرآن مجید اور دینی مسائل کے بارے میں رجوع کیا جاتا تھا۔ اگر مسلمانوں کے مابین کسی مسئلے میں اختلاف ہوجاتا تو اسے دور کرنے کے لئے آنحضرتؐ بنفس نفیس اُن کے درمیان موجود تھے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے فیصلے پر اعتراض کرتا یا اپنی رائے دیتا کیونکہ خداوند عالم نے حکم دیا ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَى اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ ''اے ایمان والو! اگر تمہارے مابین کسی مسئلے میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دو۔'' (سورۂ نساء: آیت ۵۹) لہٰذا رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں سب مسلمان اپنے مسائل آپ کے سامنے پیش کر سکتے تھے اور اُن کے درمیان مختلف آراء کے ظہور کا مسئلہ ہی درپیش نہیں تھا۔

رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد سارے مسلمان ان چھ عقائد میں متحد تھے۔

۱۔ خدا ایک ہے۔
۲۔ حضرت محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔
۳۔ قرآن مجید خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔
۴۔ قیامت کے دن مُردوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

۵۔ قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا۔
۶۔ جنت اور جہنم برحق ہیں۔

ان چھ باتوں کا تعلق اسلام کے بنیادی عقائد سے ہے۔ جہاں تک اعمال یعنی نماز، روزہ، حج اور زکات کا تعلق ہے رسول اکرمؐ نے بنفس نفیس یہ اعمال انجام دیئے تھے۔ تاہم بعد میں مسلمانوں میں اُن معاملات میں اختلاف پیدا ہوا جن میں ''اجتہاد'' کیا جاسکتا تھا۔ ان معاملات کا تعلق عقائد کی جزئیات اور فقہی مسائل سے تھا مگر ان اختلافات نے ایک شخص کے مسلمان ہونے کی بنیاد پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا گیا کیونکہ

(۱) اختلاف ''توحید ذات'' کے بارے میں نہیں بلکہ ''توحید صفات'' کے بارے میں تھا یعنی خدا کی صفات اُس کی عین ذات ہیں یا زائد برذات

(۲) اختلاف حضرت رسالت پناہؐ کی رسالت کے بارے میں نہیں بلکہ آپ کی عصمت کے بارے میں تھا یعنی کیا آپ رسول بننے سے پہلے بھی معصوم تھے یا آپ کی عصمت اُس وقت شروع ہوئی جب آپ مبعوث برسالت ہوئے۔

(۳) اختلاف قرآن مجید کی صحت کے بارے میں نہیں ہوا بلکہ اس بارے میں ہوا کہ قرآن مجید قدیم ہے یا مخلوق۔

(۴) اختلاف قیامت کے واقع ہونے کے حوالے نہیں بلکہ اس حوالے ہوا کہ آیا انسان اپنے اصلی اجسام کے ساتھ اٹھائے جائیں گے یا اُن کی ارواح سے حساب لیا جائے گا۔

نیز نمازوں کے واجب ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اختلاف اس بارے میں ہوا کہ آیا سورہ نماز کا جزو ہے یا نہیں۔ ایسے معاملات میں اختلاف کسی شخص کے اسلام سے خارج ہونے کا سبب نہیں بن سکتے اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کا امتی نہیں رہا۔

مسلمانوں کے مشہور فرقے

رحلت رسولؐ کے بعد مسلمانوں میں بعض ایمانی اور اعتقادی اصولوں نیز اُن فروعی مسائل میں اختلاف پیدا ہوا جن کا تعلق اعمال کے واجب، حرام اور مباح ہونے سے ہے۔ اصول دین میں اختلاف کی وجہ سے معتزلہ اور اشاعرہ جیسے فرقے پیدا ہوگئے۔ اُن کے اختلاف کی نوعیت فقہی نہیں تھی۔ مذاہب اربعہ یعنی حنفی مالکی، شافعی اور حنبلی مکاتب کی بنیاد فقہی اختلافات پر ہے۔[۱] اصول عقائد میں یہ سب فرقے ابوالحسن اشعری بغدادی (۸۷۵ھ) کے مکتب کی پیروی کرتے ہیں۔

شیعہ علماء اصول دین میں دیگر مسلمانوں سے متفق ہیں مگر بہت سے فقہی مسائل میں اُن سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔

پس اصول دین میں اختلاف فروع دین میں اتفاق کا سبب نہیں اور فروع دین میں اختلاف اصول دین میں اتفاق کا سبب نہیں ہے۔

بعض علماء نے اسلامی فرقوں کی تعداد ۷۳ تک پہنچائی ہے تاکہ اس حدیث کے ساتھ مطابقت پیدا کی جاسکے کہ (حضرت موسیٰؑ کے بعد) یہودی ۷۱ فرقوں میں بٹ گئے اور (حضرت عیسیٰؑ کے بعد) عیسائی ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے۔ (میرے بعد) میرے پیرو ۷۳ فرقوں میں بٹ جائیں گے۔

ذیل میں ہم قارئین کی خدمت میں مسلمان فرقوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہ چار فرقے مشہور ہیں۔

(۱) شیعہ (۲) خوارج (۳) معتزلہ (۴) اشاعرہ

۱۔ معاصر دانشور جنھوں نے شیعیت قبول کی ہے مثلاً تجلی کے مصنف جناب محمد تیجانی سماوی تیونسی فریب کے مصنف جناب صالح الوردانی مصری اور حقیقت گمشدہ کے مصنف جناب شیخ معتصم سید احمد سوڈانی نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ تمام کتابیں اردو میں مجمع علمی اسلامی نے شائع کی ہیں۔

شیعہ

(۱) شیعہ عقیدے کے مطابق امام مقرر کرنا پیغمبر اکرمؐ کا کار منصبی ہے۔ یہ کام امت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا گیا۔

(۲) ضروری ہے کہ امام معصوم عن الخطا ہو۔

(۳) پیغمبر اکرمؐ نے بالصراحت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو اپنا جانشین اور امت کا امام مقرر فرمایا تھا۔[۱]

(۴) ضروری ہے کہ "امام" رسول اکرمؐ کے "صحابہ" سے افضل ہو۔

خوارج

خوارج دوسرے اسلامی فرقوں سے ممیز ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرشی یا عربی ہو۔ اسلامی حکومت کے معاملے میں عرب اور عجم سب برابر ہیں۔

خوارج کا عقیدہ ہے کہ جو شخص کبیرہ گناہ کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے اور خوارج کی رائے کے مخالف رائے رکھنا اور اجتہاد کرنا گناہ ہے۔

اگرچہ خوارج کو علم تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے (جنگ صفین میں) تحکیم کے سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی وہ آپ کو کافر کہتے تھے کیونکہ آپ نے ثالثی قبول کرلی تھی۔

متشدد خارجی گروہ "ازارقہ" کہتا ہے کہ جو شخص خوارج کی مخالفت کرے وہ مشرک ہے۔ اُس کے خلاف لڑنا چاہیے اور اُسے قتل کردینا چاہیے۔

۱۔ یہ تصریح اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس موضوع پر شافی مؤلفہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، دلائل الصدق مؤلفہ علامہ شیخ محمد حسن مظفر، المراجعات مؤلفہ علامہ سید شرف الدین موسوی، الغدیر مؤلفہ علامہ عبدالحسین امینی، اعیان الشیعہ مؤلفہ علامہ سید محسن امین میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

معتزلہ

جو اصول معتزلہ کو دوسرے مسلمانوں سے ممیز کرتے ہیں وہ پانچ ہیں۔

۱) توحید بایں معنی کہ اللہ ایک ہے اور اُس کی صفات عین ذات ہیں۔

۲) عدل بایں معنی کہ انسان اپنی زندگی کے معاملات میں فاعل مختار ہے۔

۳) المنزلة بین المنزلتین بین بین رہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والا نہ مومن رہتا ہے اور نہ کافر ہو جاتا ہے (بلکہ وہ فاسق ہے)۔ وہ مومن نہیں رہتا کیونکہ وہ اچھی صفات کی تکمیل نہیں کرتا اور کافر نہیں ہو جاتا کیونکہ وہ توحید اور رسالت کی گواہی دیتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہمیشہ جہنم میں رہے گا کیونکہ آخرت میں یا جنت ہے یا جہنم۔ تاہم جہنم میں اُس پر سخت عذاب نہیں ہوگا اور اُسے مسلمان کہا جاسکتا ہے۔

۴) وعدہ اور وعید بایں معنی کہ جب خدا ثواب یا عذاب دینے کا وعدہ کرتا ہے تو اس وعدہ و وعید میں تبدیلی نہیں ہوتی اور نہیں ہوسکتا کہ جس شخص کو اُس نے عذاب دینے کا وعدہ کر رکھا ہے اُسے بخش دے۔

۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شرعاً نہیں بلکہ عقلاً واجب ہے۔

اشاعرہ

اشاعرہ اور معتزلہ دو نکات پر باہم دیگر متفق ہیں مگر اشاعرہ مندرجہ ذیل پانچ نکات میں معتزلہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں:

۱) اللہ کی صفات عین ذات نہیں، زائد برذات ہیں۔

۲) انسان فاعل مختار نہیں، تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہے۔

۳) اللہ پر "واجب" نہیں کہ وہ سزا یا جزا کے وعدے پورے کرے۔ (اللہ پر کچھ بھی واجب نہیں) وہ نیکوکار کو عذاب دے سکتا ہے اور گنہگار کو بخش سکتا ہے کیونکہ اللہ کے افعال ایسی "تکلیف" نہیں جن کا پورا کرنا اُس کے لئے

ضروری ہو اور اللہ کوئی ناپسندیدہ کام نہیں کرتا۔[1]

۴) جو شخص کبیرہ گناہ کرتا ہے وہ کفر و ایمان کی "درمیانی منزل" پر نہیں ہوتا لیکن وہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔

۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر عقلاً نہیں بلکہ شرعاً واجب ہے۔

اہل تشیع توحید اور عدل کے بارے میں معتزلہ سے متفق ہیں (زمانۂ قدیم سے ہی یہ فقرہ مشہور ہے کہ اَلْعَدْلُ وَالتَّوْحِیْدُ عَلَوِیَّانِ وَالْجَبْرُ وَالتَّشْبِیْهُ اُمَوِیَّانِ یعنی عدل اور توحید علوی اور جبر اور تشبیہ اموی اصول ہیں) لیکن باقی تین نکات پر اُن سے اتفاق نہیں کرتے۔ کبیرہ گناہوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مسائل میں وہ اشاعرہ سے متفق ہیں۔ "وعدہ اور وعید" کے بارے میں اہل تشیع اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا ثواب کے بارے

۱۔ مسلمانوں میں کچھ ایسے عالم ہوئے ہیں جنھوں نے اصول عدل کا انکار کیا ہے۔ اُن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے تکوینی اور تشریعی نظام میں اس اصول سے بالاتر ہے۔ اُس کے افعال اور احکام ہرگز کسی قانون کے پابند نہیں، اُن کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے وہی حق و انصاف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ وہی کرتا ہے جو حق و انصاف ہو۔ اسی طرح اُس کے احکام خود حق و انصاف ہیں۔ یہ نہیں کہ اُس کے احکام حق و انصاف کے تابع ہوں۔ اس سے اُن علماء نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ نظام میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ نامکن ہو کہ کسی شخص کو کمال اطاعت اور نیکوکاری کے باوجود آخرت میں عذاب دیا جائے یا کسی گنہگار کو اُس کے سخت گناہوں اور انتہائی سرکشی کے باوجود جنت میں بھیج دیا جائے۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی امر مانع نہیں کہ کچھ لوگ بغیر کسی وجہ کے اس دنیا کی تمام نعمتوں سے نواز دیے جائیں اور کچھ دوسرے لوگ قطعاً محروم رہیں کیونکہ عدل اور ظلم کوئی حقیقی اور عقلی چیز نہیں بلکہ اُن کا وجود حکم شریعت کے تابع ہے۔ شریعت جو حکم دے وہ عین انصاف ہے۔ چونکہ اس سوچ کا ظاہری پہلو یہ تھا کہ شریعت عقل کی تابع اور قانون کی پابند نہیں اس لیے عوام نے اسے ایک طرح سے شریعت کی عظمت اور اس کی اہمیت کا اعتراف سمجھا اور عوام پسند ہونے کی وجہ سے یہ سوچ تیزی سے مقبول ہوئی اور عالم اسلام میں ایک زبردست لہر پیدا ہوگئی۔ (استاد شہید مرتضیٰ مطہری، تحن ص ۳۸۲)

میں کئے گئے اپنے وعدے ضرور پورے کرتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ عذاب کی جو دھمکی وہ دیتا ہے اُس پر عمل درآمد بھی کرے۔ (خدا کی رحمت وسیع ہے اور) وہ گنہگاروں کو معاف کرسکتا ہے تاہم عقل کی رو سے یہ مناسب نہیں کہ خدا نیکوکاروں کو جزا نہ دے۔

شیعہ عقیدہ

لغت میں شیعہ کے معنی پیرو اور حامی کے ہیں لیکن عرف عام میں شیعہ اسے کہا جاتا ہے جو خاندان رسالتؐ کے "بارہ اماموں" کی پیروی کرتا ہے جن میں اول امام علی علیہ السلام اور آخری امام مہدی موعود علیہ السلام ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: وَاِنَّ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ لَاِبۡرٰہِیۡمَ "بے شک ابراہیم (نوح) کے پیروکار تھے۔" (سورہ صافات: آیت ۸۳) مؤرخین اور متکلمین کے مطابق شیعہ وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؑ اور اُن کی اولاد سے محبت اور عقیدت رکھتا ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شیعہ عقیدے کے مطابق ضروری ہے کہ رسول اکرمؐ امام کا تقرر فرمائیں جیسا کہ آنحضرتؐ نے بالصراحت فرما دیا تھا کہ حضرت علیؑ اُن کے جانشین ہوں گے۔

شیعیت کا آغاز

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک سیاسی مسئلے کی وجہ سے شیعیت کا غاز ہوا ہے دین اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات قطعاً درست نہیں۔ شیعیت کے وجود میں آنے کا سبب ایک دینی مسئلہ تھا جس کا سیاست سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہیں۔ رسول اکرمؐ کی صحیح احادیث اور سنت شیعہ عقیدے کا سرچشمہ ہیں۔

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو مشاورت اور اخوت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ آپ نے انھیں بچپن سے پالا تھا اور اُن کی تعلیم و تربیت فرمائی تھی۔ آپ نے ساری زندگی امام علیؑ پر نہ تو کبھی اعتراض کیا اور نہ کبھی اُن کے کسی فعل پر باز پرس کی

بعض انتہائی اہم اور مشکل مواقع پر امام علیؑ نے آپ کی نمائندگی فرمائی تھی مثلاً حج کے موقع پر سورۂ برأت کی آیات اوّلین بار مشرکین مکہ تک امام علیؑ نے ہی پہنچائی تھیں۔ رسول اکرمؐ نے جنگ خندق میں عمرو بن عبدوُد کو اور جنگ خیبر میں مرحب کو قتل کرنے کے لئے امام علیؑ کو منتخب فرمایا تھا۔ نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے رسول اکرمؐ اپنے ساتھ علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کو لے گئے تھے۔ امام علیؑ نے دوش رسولؐ پر چڑھ کر فتح مکہ کے دن بت توڑے تھے۔ امام علیؑ نے چادر تطہیر میں رسول اکرمؐ کے ساتھ جگہ پائی تھی۔

بلاشبہ ایسے بے شمار فضائل امام علیؑ سے مخصوص ہیں۔ اگر رسول اکرمؐ کے صحابہ میں سے کسی کو ان میں سے ایک فضیلت بھی حاصل ہوتی تو وہ صحابی اسے اپنے لئے اعزاز سمجھتا۔ جہاں تک امام علیؑ کے متعلق رسول اکرمؐ کے ارشادات کا تعلق ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرتؐ نے مختلف مواقع پر امام علیؑ کے فضائل بالصراحت بیان فرمائے تھے اور انھیں اپنے بعد اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

رسول اکرمؐ نے خلافت کے بارے میں سب سے پہلا اعلان اُس وقت فرمایا تھا جب "آیت انذار" نازل ہوئی تھی اور آپ نے اپنے خاندان کے تیس افراد کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا تھا۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرتؐ نے امام علیؑ کی گدی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: اِنَّ ھٰذَا اَخِیۡ وَوَصِیِّیۡ وَ وَزِیۡرِیۡ وَخَلِیۡفَتِیۡ مِنۡ بَعۡدِیۡ. فَاسۡمَعُوۡا لَہٗ وَاَطِیۡعُوۡا "یہ میرا بھائی، میرے بعد تم لوگوں میں میرا وصی، میرا وزیر اور میرا خلیفہ ہے۔ پس تم اس کی بات سنو اور مانو۔"[۱]

۱۔ طبری نے اپنی تفسیر میں اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں "بھائی، وصی اور خلیفہ" کو کذا وکذا سے بدل دیا ہے۔ نیز ابن ہشام نے اپنی "سیرت" کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "سیرت ابن اسحاق کے جن مطالب کو لوگ ناپسند کرتے ہیں میں نے وہ اپنی اس کتاب میں نقل نہیں کئے۔" اسی طرح مصر کے محمد حسنین ہیکل نے اپنی کتاب حیات محمدؐ کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۱۰۴ پر یہ پوری حدیث دار نقل کی تھی لیکن جب اُس نے ۱۳۵۴ھ میں دوسرا ایڈیشن شائع کرایا تو اُس میں سے یہ حدیث نکال دی۔

رسول اکرمؐ نے خلاف علیؑ کے بارے میں آخری اعلان حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت غدیر خم کے مقام پر فرمایا تھا۔ وہاں آپ نے خطبے کے دوران حضرت علیؑ کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا تھا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اپنے پہلے اعلان سے لے کر اس آخری اعلان کے درمیان رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کی جانشینی کے بارے میں متعدد مرتبہ لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ سے فرمایا تھا: يَا عَلِيُّ! أَلَا تَرْضٰى أَنْ تَكُوْنَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى إِلَّا أَنَّهُ لَيْسَ نَبِيٌّ بَعْدِيْ (صحیح بخاری، ج ٦، ح ٤٠٨) یا علیؑ! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم میرے لیے ویسے ہی ہو جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے لئے تھے مگر یہ کہ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ یعنی علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے حدیث ثقلین جیسی متواتر حدیث کے علاوہ بہت سی روایات ہیں جو سنی علماء نے نقل کی ہیں۔ شیعہ علماء نے یہ روایات نقض الشیعہ، اعیان الشیعہ، المراجعات اور دلائل الصدق وغیرہ میں جمع کی ہیں۔

میں نے ایسا کوئی سنی عالم نہیں دیکھا جس نے امام علیؑ کی ولایت اور وصایت کے بارے میں احادیث نقل نہ کی ہوں البتہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے کہ ان روایات میں لفظ ''ولایت'' سے جس کے لازمی معنی ''حکومت اور اقتدار'' ہے دوستی اور اخلاص مراد لیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وصی کا کام صرف یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے کفن دفن کا انتظام کرے۔ سنی علماء نے ان روایات کی اپنے انداز سے تاویل کرنے کی لاحاصل کوشش کی ہے اور بڑی زحمتیں اٹھا کر ایسے دور از کار معانی بیان کئے ہیں جو روایات کے متن سے کسی طرح لگا نہیں کھاتے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسی روایات کسی دوسرے صحابی کے بارے میں ہوتیں تو وہ سنہری حروف سے لکھی جاتیں۔ اگر شیعہ امام علیؑ کی محبت کو

سرمایۂ ایمان جانتے ہیں اور امام علیؑ کو معصوم مانتے ہیں تو وہ رسول اکرمؐ کے صریح ارشادات کی تعمیل میں ایسا کرتے ہیں۔

ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے، جن پر انحصار کر کے شیعہ امام علیؑ سے محبت کرتے ہیں، ولایت علیؑ کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور کوئی چیز جذبات، تعصب اور باپ دادا کی تقلید کے طور پر تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ اس دلیل کی بنیاد پر شیعہ عقیدے کا ماٰخذ خالصتاً دینی اور رسول اکرمؐ کے ارشادات عالیہ کی تعمیل پر مبنی ہے۔ اس کا سیاست اور سیاسی مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔[۱]

۱۔ کچھ مستشرقین اور مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ تشیع امام حسینؑ کی شہادت کے بعد وجود میں آئی ہے۔ ان کے بقول امام حسینؑ کی شہادت نے شیعوں کے فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دیا جس کے نتیجے میں انھوں نے صف بندی کی اور تشیع ایک منظم عقیدہ بن کر نمودار ہوا۔ اس سے قبل شیعوں میں صف بندی موجود نہیں تھی۔ امام حسینؑ کی شہادت عظمیٰ سے پہلے تشیع کی حیثیت ایک سیاسی دھڑے کی تھی اور تشیع کے مخصوص نظریات لوگوں کے دلوں میں راسخ اور خون میں شامل نہیں تھے۔ جب امام حسینؑ کو شہید کر دیا گیا تو تشیع لوگوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور ایک راسخ عقیدہ بن کر نمودار ہوا جیسا کہ ایرانی نژاد امریکی اسکالر نے اپنی کتاب No god but God مطبوعہ Random House Trade Paperbacks, New York کے ص ۱۷۸ پر لکھا ہے۔ رضا اسلان لکھتا ہے:

Put simply, the memory of Karbala was slowly transforming the Shi'atu Ali from a political faction with the aim of restoring the leadership of the community to the family of the Prophet into an utterly distinct religious sect in Islam: *Shi'ism*, a religion founded on the ideal of the righteous believer who, following in the footsteps of the martyrs at Karbala, willingly sacrifices himself in the struggle for justice against oppression.

لارنس آف عربیہ کا مصنف اور ''عرب اسکالر'' Anthony Nutting اپنی کتاب The Arabs مطبوعہ Mentor Book New York طبع ۱۹۶۴ء میں Shia Revolt And Abbasid Decline کے تحت ص ۱۵۵ پر لکھتا ہے:

"The Shia movement had begun in Arabia at the time of the Prophet's death as a political party dedicated to putting Ali on the caliphate throne. From then until the death of Ali's son Hussein it was a purely Arab movement. But as the Omayyads' rigid class structure embittered the *mawali* converts to Islam in the Persian east, the Shia saw their opportunity to broaden the base of their movement and to expand their numbers. Thus the original partisans of Ali grew into an international movement, bent not only on restoring the Alids to the caliphate but also on staging a social revolution on behalf of the oppressed classes everywhere within the empire."

شیعیت کب وجود میں آئی ؟

مصری مصنف شیخ محمد ابو زہرہ نے **المذاہب الاسلامیہ** میں لکھا ہے کہ شیعیت اسلام کا قدیم ترین سیاسی مکتب ہے۔ یہ سیاسی مکتب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں پیدا ہوا اور حضرت علیؑ کی خلافت میں مکمل ہوگیا۔ جوں جوں حضرت علیؑ لوگوں سے واقف ہوتے گئے انھوں نے ان کو تشیع کی عظمت، دین کی استواری اور اپنے علم سے آگاہ کیا۔

کوئی کہتا ہے کہ شیعیت جنگ جمل میں وجود میں آئی اور کوئی کہتا ہے کہ شیعیت خوارج کے جنم لینے سے ظہور میں آئی۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی کتاب علیؑ و بنوہ میں لکھا ہے:

شیعیت امام حسنؑ کے وقت میں ایک منظم سیاسی جماعت بن گئی تھی۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ شیعیت خلافت علیؑ کے بارے میں رسول اکرمؐ کے صریح اعلان اور صحابہ کرام کے فضائل علیؑ پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وجود میں آگئی تھی۔ بقول ابن ابی الحدید عمار بن یاسر، مقداد بن اسود، ابوایوب انصاری، بریدہ، جابر بن عبد اللہ انصاری، ابی بن کعب، حذیفہ بن یمان، سہل بن حنیف، عثمان بن حنیف، ابوالہیثم بن تیہان، ابی طفیل اور تمام بنی ہاشم علیؑ کے شیعہ تھے۔

علامہ شیخ محمد حسن مظفر اپنی کتاب "تاریخ شیعہ" میں محمد علی کرد کی کتاب **خطط الشام** (ج ۵، ص ۲۵۱) سے نقل کرتے ہیں کہ عہد رسالت میں آنحضرتؐ کے جو برگزیدہ اصحاب امام علیؑ کے حامی تھے اُن میں سے ایک سلمان فارسیؓ بھی تھے۔ وہ کہتے تھے: "ہم نے رسول اللہؐ کی بیعت کی جو مسلمانوں کے خیر خواہ تھے اور ہم علیؑ کے شیعوں میں سے تھے۔"

ابو سعید خُدری فرماتے ہیں کہ "رسول اکرمؐ نے لوگوں کو پانچ باتوں پر عمل کرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ انھوں نے چار باتوں پر تو عمل کیا لیکن پانچویں بات

نظر انداز کردی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ چار باتیں کون سی ہیں تو ابوسعید نے کہا: "نماز، روزہ، حج اور زکات۔" پھر اُن سے پوچھا گیا کہ وہ پانچویں چیز جسے نظر انداز کر دیا گیا کون سی تھی تو انھوں نے کہا: ولایت علیؑ۔ پھر اُن سے پوچھا گیا کہ کیا ولایت علیؑ بھی وہی رتبہ رکھتی ہے جو یہ چاروں واجب اعمال رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا: "ہاں! ولایت علیؑ بھی وہی رتبہ رکھتی ہے جو یہ اعمال رکھتے ہیں۔"

ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، حذیفہ بن یمان، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین ابوایوب انصاری، خالد بن سعید، قیس بن سعد بن عبادہ بھی ولایت علیؑ کے معتقد تھے۔

شیعہ اور عبد اللہ بن سبا

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شیعہ مذہب عبد اللہ بن سبا[۱] کی اختراع ہے تاہم یہ شیعہ

۱۔ سیف بن عمر کے افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن سبا یمن کا یہودی تھا جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بظاہر مسلمان ہوگیا تھا لیکن در پردہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ وہ شام، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے اسلامی مراکز میں پھرتا اور تبلیغ کرتا رہا کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضرت محمدؐ بھی "رجعت" فرمائیں گے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت محمدؐ کے وصی حضرت علیؑ ہیں اور جس طرح حضرت محمدؐ خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علیؑ خاتم الاوصیاء ہیں۔ نیز حضرت عثمانؓ نے اُس وصی کا حق غصب کر کے اُن پر ظلم کیا ہے لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ اٹھیں اور حقدار کو اُس کا حق دلائیں۔ یہ باتیں سن کر کچھ مسلمان جذباتی ہو کر مدینہ پہنچے۔ وہاں انھوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور بالآخر انھیں اور اُن کی اہلیہ کو قتل کر دیا۔ یہ سب کام سبائیوں کی نگرانی میں انجام پایا۔ اور یہ بھی کہ بصرہ میں طرفین کے سردار جنگ جمل نہیں چاہتے تھے لیکن سبائیوں نے راتوں رات ایسا منصوبہ بنایا کہ جنگ چھڑ گئی اور پتا ہی نہ چلا کہ جنگ برپا کرنے والا کون تھا!!!

ڈاکٹر طہٰ حسین نے **الفتنۃ الکبریٰ** میں عبد اللہ بن سبا کے وجود سے انکار کیا ہے۔ محقق عصر علامہ سید مرتضیٰ عسکری نے اپنی کتاب **عبد اللہ بن سبا** (عربی/فارسی) میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ملوکیت کے خوشہ چین اور نظام خلافت قائم کرنے کے شوقین آج بھی وہی پرانی بات دہرا رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ (۲۱ / مارچ ۲۰۰۸ء) کو روزنامہ جنگ کراچی میں اپنے کالم بعنوان عظمت مصطفیٰؐ، مغرب کا گستاخانہ رویہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ

عقیدے سے لاعلمی پر مبنی بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ

"اس سازش میں یہود سرفہرست ہیں اور اُن کی عداوت کی وجہ یہ ہے کہ حضور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندانی تعلق بنی اسرائیل سے نہیں تھا اور یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ نبوت صرف اور صرف بنی اسرائیل ہی کا حق ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد اہل مدینہ نے یہودیوں کے پشت پناہ عبداللہ بن ابی کو مسترد کرتے ہوئے آپ کو مدینہ کا سربراہ بنا دیا تھا یہ بات یہودیوں پر بجلی بن کر گری اور انھوں اُس دن سے اپنی سازشوں کا مرکز نبی کائنات کی ذات گرامی کو بنا لیا۔ آپ کے وصال کے بعد امت کو تقسیم کرانے کے لئے ایک اور یہودی مگر بظاہر مسلمان عبداللہ ابن سبا نے اہم کردار ادا کیا۔"

ڈاکٹر اسرار صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ "فرضی" عبداللہ بن سبا نے اسلام کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ ملوکیت کے حلقہ بگوش نام نہاد علماء نے اسلام پر کاری ضرب لگائی ہے۔ سرکار دو عالم کی حدیث مبارکہ ہے: آفَةُ الدِّيْنِ ثَلَاثَةٌ: عَالِمٌ فَاجِرٌ وَ مُجْتَهِدٌ جَاهِلٌ وَ إِمَامٌ جَائِرٌ یعنی دین کے لئے تین لوگ مصیبت ہیں: فاجر عالم، نادان عابد اور ظالم حکمران۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ سیف بن عمر نے دوسری صدی کے نصف آخر میں عبداللہ بن سبا کی داستان گھڑی اور اس کے ٹھیک ۱۲۰ سال بعد یہ بات پھیلائی گئی کہ شیعیت کا بانی عبداللہ بن سبا تھا۔ سیف بن عمر کے علاوہ اس بے بنیاد داستان کو کسی اور نے بیان نہیں کیا اور ہر دور میں ابن سبا کا وجود ایک سوالیہ نشان رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار صاحب ذرا یہ تو بتائیں کہ جس عبداللہ بن سبا کو انھوں نے انتہائی بااثر شخصیت بنا کر پیش کیا ہے — اور دعویٰ کیا ہے کہ اُس نے مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں خونریز جنگیں ہوئیں — آخر اُس کے متعلق ابتدائی مؤرخین نے چپ کیوں سادھ رکھی تھی اور کیا وجہ تھی کہ ابن شہاب زہری، عروہ بن زبیر، ابان بن عثمان، ابوبکر بن حزم، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی نے اس "بااثر شخصیت" کا ذکر تک نہیں کیا جبکہ مذکورہ افراد نے ہی بنی امیہ کے آخری عہد میں حدیث و تاریخ کو مدون کیا تھا۔ اگر ابن سبا کا کوئی وجود ہوتا تو امام علیؑ کے سب سے بڑے دشمن معاویہ نیز اُس کے حاشیہ بردار اُس کا ذکر ضرور کرتے کیونکہ معاویہ امام علیؑ اور اُن کے پیروکاروں کو بدنام کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا۔ آخر یہ شخصیت دوسری صدی کے نصف آخر تک دنیا کی نظروں سے اوجھل کیسے رہی؟ سیف بن عمر وہ پہلا آدمی ہے جس نے اس شخصیت کو اُس کے کارناموں سمیت "دریافت" کیا یعنی ابن سبا کے وجود کا انکشاف دوسری صدی کے نصف آخر کے ابتدائی سالوں میں ہوا سیف بن عمر کے متعلق محققین کا اتفاق ہے کہ وہ نہایت جھوٹا شخص تھا اور بنی عباس کے حکام کو خوش کرنے کے لیے نت نئے افسانے گھڑتا رہتا تھا چنانچہ جب اُس نے دیکھا کہ علوی بنی عباس کے لیے چیلنج بنتے جا رہے ہیں تو اُس نے علویوں کو بدنام کرنے کے لیے ابن سبا کا افسانہ تراشا۔

جانتے ہیں کہ شیعہ اس سے کس قدر بیزاری کا اظہار کرتے ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ شیعہ مذہب عبداللہ بن سبا سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ محمد علی کرد نہ تو شیعہ ہیں اور نہ ہی شیعوں کے حامی لیکن انھوں نے دیانت داری سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور اسے ذاتی اعتراض سے آلودہ نہیں کیا۔

ان سب باتوں سے پتا چلتا ہے کہ شیعہ عقیدے کے معنی رسول اکرمؐ کی قطعی نص کے مطابق حضرت علیؑ کی امامت کبریٰ پر اعتقاد رکھنا ہے لہٰذا قدرتی طور پر شیعہ عقیدے کا آغاز اُس وقت ہوا جب رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت کا اعلان فرمایا تھا۔ یہ اعلان آپ نے دعوت انذار کے موقع پر پہلے پہل دین کی تبلیغ کرتے وقت فرمایا تھا لہٰذا دین اسلام کے آغاز اور بعثت رسولؐ کے ساتھ ہی شیعہ عقیدے کی شروعات ہوگئی تھی۔

امام علیؑ خاموش کیوں رہے؟

بعض اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام علی علیہ السلام کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد فرما دیا تھا تو آپ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ بننے پر خاموش کیوں رہے اور کوئی احتجاج کیوں نہیں کیا؟ یہ سوال امام علی علیہ السلام کے وقت سے لیکر آج تک برابر پوچھا جاتا رہا ہے۔ خود امام علی علیہ السلام سے بھی یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ امام علیہ السلام کے مؤقف کا اور تاریخ جو مواد مہیا کرتی ہے اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱) حمایت کا فقدان

اس سوال کے جواب میں امام علیؑ نے فرمایا تھا کہ خلافت کے بارے میں میری "خاموشی" کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں موت سے ڈرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "لوگ تمھیں دھوکا دیں گے اور وہ وعدے جو

انھوں نے مجھ سے کر رکھے ہیں وفا نہیں کریں گے اور تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔

امام علیؑ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرمؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! جب لوگ مجھ سے دغا کریں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا:

"اگر تمہارا کوئی حامی ہو تو لوگوں سے لڑو اور اپنا حق حاصل کرو اور اگر تمہارے پاس حامی نہ ہوں تو لوگوں کو نظر انداز کر دو اور اپنے خون کی حفاظت کرو تاکہ جب تم دنیا سے جاؤ تو مظلوم کی حیثیت سے جاؤ۔"

امام علیؑ نے فرمایا کہ میں سات پیغمبروں کی مثال پر عمل کرتا ہوں۔

۱۔ حضرت نوحؑ: جب انھوں نے اپنے رب سے دعا کی کہ (بار الٰہا) میں ان کے مقابلے میں کمزور ہوں تو میری مدد فرما۔ (سورۂ قمر: ۱۰)

۲۔ حضرت ابراھیمؑ: جنھوں نے کہا: میں تم لوگوں سے اور جن کو تم لوگ خدا کے سوا پکارتے ہو کنارہ کرتا ہوں۔ (سورۂ مریم: ۴۸)

۳۔ حضرت لوطؑ: جنھوں نے کہا: اے کاش! مجھ میں تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا میرا کوئی مضبوط پشت پناہ ہوتا۔ (سورۂ ہود: ۸۰)

۴۔ حضرت یوسفؑ: جنھوں نے کہا: بار الٰہا! جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں اُس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔ (سورۂ یوسف: ۳۴)

۵۔ حضرت موسیٰؑ: جنھوں نے کہا کہ جب مجھے تم سے ڈر لگا تو میں تم میں سے بھاگ گیا۔ (سورۂ شعراء: ۲۱)

۶۔ حضرت ھارونؑ: جنھوں نے کہا کہ بنی اسرائیل نے مجھے کمزور جانا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔ (سورۂ اعراف: ۱۵۰)

۷۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ: جب وہ ہجرت کے موقع پر مشرکین سے بچنے کے لئے غار ثور میں چھپ گئے۔

امام علیؑ نے ان مثالوں کی روشنی میں صبر جمیل کا مظاہرہ کیا اور منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد خُطبَۂ شِقشِقیَہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "میں اس بات پر مجبور ہوگیا کہ اُس غصب کو برداشت کروں اور اپنا منہ مصائب سے موڑ لوں۔ میں عجیب دوراہے پر تھا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو میں حامیوں کے بغیر اپنے حق کے لئے لڑوں یا اس غصب کو برداشت کروں۔ یہ برداشت اتنی اندوہناک اور طویل ہونے والی تھی کہ اس عرصے میں جوان بوڑھے ہو جاتے اور بوڑھے اپنی توانائی کھو بیٹھتے اور مخلص لوگ حالات کو بہتر بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے لئے یہی راستا مناسب ہے کہ میں صبر و ہمت سے مصیبت کا مقابلہ کروں اس لئے میں نے صبر کا راستا اختیار کیا۔"[1] (نہج البلاغہ، خطبہ ۷)

امام علی رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "امام علیؑ نے رسول اکرمؐ کے بعد ۲۵ سال گوشہ نشینی میں کیوں گزارے اور خلافت پر فائز ہونے کے بعد کیوں لڑے؟" تو آپ نے فرمایا: "ایسا کرنے میں امام علیؑ نے سنت رسولؐ کی پیروی کی جنھوں نے مشرکین مکہ کو چودہ سال اور سات مہینے کی مہلت دی (تیرہ سال مکہ میں اور انیس ماہ مدینے میں) اور اُن کے خلاف جنگ نہیں کی۔ اس عرصے میں آنحضرتؐ کے جنگ نہ کرنے کی وجہ حمایت کا فقدان تھا۔ اسی طرح امام علیؑ کو بھی جنگ لڑنے کے لئے حامیوں کی کمی کا سامنا تھا۔

۱۔ رسول خداؐ کی وصیت نبھاتے ہوئے امام علیؑ نے ہر ظلم پر صبر کا مظاہرہ کیا اور کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا حتیٰ کہ جب حکومت کے کارپرداز انھیں کھینچ کر مسجد میں لے گئے تب بھی انھوں نے برداشت کا مظاہرہ کیا۔ امام علیؑ کا دل نازنیں اگرچہ کٹ کر رہ گیا تھا لیکن آپ نے اپنے حبیب کی وصیت کو مدنظر رکھا اور تلوار کو بے نیام نہیں کیا حالانکہ نہ تو آپ کمزور تھے اور نہ ہی بزدل (جیسا کہ دنیا نے ۲۵ برس بعد ذوالفقار حیدری کو جمل، صفین اور نہروان میں ایک مرتبہ پھر برق خاطف کی طرح چمکتے ہوئے دیکھا تھا) اُس روز آپ کا صبر کے گھونٹ پینا عمرو بن عبدود سے لڑنے سے زیادہ مشکل تھا۔ (علامہ سید مرتضیٰ عسکری، احیائے دین میں ائمہ اہل بیتؑ کا کردار جلد دوم)

جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں۔ ایک طرح کی آیتوں میں رسول اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ آپ مشرکین سے پہنچنے والی ایذاؤں اور ابتلاؤں پر صبر کریں مثلاً

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور صبر کرو اور تمہارا صبر کرنا خدا کی توفیق سے ہے۔ (سورۂ نحل: آیت ۱۲۷)

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ اور جو جو (دل آزار) باتیں یہ لوگ کہتے ہیں اُن کو برداشت کرو۔ (سورۂ مزمل: آیت ۱۰)

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ جس طرح عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح آپ بھی صبر کیجئے۔ (سورۂ احقاف: آیت ۳۵)

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ پس آپ اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیجئے۔ (سورۂ قلم: آیت ۴۸)

اس طرح کی دیگر آیات بھی ہیں جن میں رسول اکرمؐ کو مشرکین مکہ کی دل آزار باتوں پر صبر کرنے کو کہا گیا ہے۔

دوسری طرح کی آیتوں میں جنگ لڑنے کی بات کی گئی ہے مثلاً

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ اُن سے لڑو۔ خدا اُن کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور رسوا کرے گا اور تم کو اُن پر فتح دے گا اور مومنوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۴)

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ پس جب تم کافروں سے بھڑ جاؤ تو اُن کی گردنیں اڑا دو اور جب اُن کو قتل کر چکو تو (بچ جانے والوں کو) قید کرلو۔ (سورۂ محمد: آیت ۴)

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ پس تم ہمت نہ ہارو اور (دشمنوں کو) صلح کی طرف نہ بلاؤ۔ تم ہی غالب رہو گے اور خدا تمہارے ساتھ ہے۔ وہ ہرگز تمہارے اعمال (کے اجر) کو کم نہیں کرے گا۔ (سورۂ محمد: آیت ۳۵)

جن آیات میں صبر کی تلقین کی گئی ہے وہ اُس زمانے میں نازل ہوئی تھیں جب رسول اکرمؐ کی حمایت کرنے والے کم تھے اور آپ کو فوج یا فوجی سامان میسر نہیں تھا۔ بلاشبہ آپ کو ایسے موقع پر صبر ہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ جب انسان کمزور ہو تو لڑائی کا نتیجہ اُس کے مقصد کے خلاف جاتا ہے اور دشمن کو مقابلے اور خونریزی پر آمادہ کرتا ہے۔ تاہم جب رسول اکرمؐ کو طاقت میسر آگئی تو آپ کو حکم دیا گیا کہ مشرکین کو تہس نہس کر دیں اور زمین کو اُن کے ناپاک وجود سے پاک کر دیں۔

مذکورہ بالا آیتوں سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کے مقابلے میں صبر کرنا کبھی بہتر ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں یہاں مشہور مستشرق گولڈزیہر (Ignaz Goldziher) کی غلطی بھی آشکار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی کتاب **العقیدة والشریعة** (عربی ترجمہ طبع ۱۹۴۶ء) میں لکھتا ہے:

"جب (حضرت) محمدؐ مکہ میں تھے تو وہ کسمپرسی اور صبر کی زندگی گزار رہے تھے لیکن جب وہ مدینہ پہنچے تو ایک فوجی ریاست کے سربراہ بن گئے۔"

"(حضرت) محمدؐ کے مکہ چھوڑنے کے بعد حالات یکسر بدل گئے اور مشرکین سے نرمی برتنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔۔۔ (حضرت) محمدؐ آخرت کے بارے میں سوچتے رہتے تھے لیکن پھر وہ اچانک دنیاوی خواہشات کی جانب مائل ہو گئے۔۔۔ اسلام کی اس تاریخی حکمت عملی سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایک جنگجو مذہب ہے جو اپنے ابتدائی مرحلے سے مطابقت نہیں رکھتا۔"

گولڈزیہر کا یہ تجزیہ درست نہیں ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

رسالت کسی تضاد کے بغیر تمام مراحل میں تکمیل کو پہنچی ہے۔ جب انھیں صبر کرنے کو کہا گیا تو اُنہوں نے صبر جمیل کا مظاہرہ کیا کیونکہ اُن کے پاس طاقت اور مددگار نہیں تھے اور وہ برائیوں کے خلاف جنگ نہیں کر سکتے تھے لیکن جب اُن کو طاقت میسر آ گئی تو انھوں نے خوب جنگ کی۔

یہ معاملہ نہ ہی حیران کن ہے اور نہ ہی خلاف عقل کیونکہ اگر کسی شخص کو ایک چیز کی ضرورت ہو اور اُس کے پاس قوت خرید نہ ہو تو وہ رقم جمع ہونے تک انتظار کرتا ہے لیکن رقم جمع ہو جانے کے بعد بھی اگر وہ مطلوبہ چیز نہ خریدے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص کنجوس ہے اور اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا رکھنا چاہتا ہے۔

یہی مثال رسول اکرمؐ کی سیرت (طرزِ عمل) کی ہے۔ جب آپ مکہ میں تھے تو آپ نے مشرکین کے خلاف جنگ نہیں کی کیونکہ آپ کے پاس نفری اور ہتھیار نہیں تھے لیکن جب مدینہ میں آپ کو طاقت میسر آ گئی تو آپ نے مشرکین سے مقابلے کی ٹھانی تا کہ اُن کی زیادتیوں کو روکا جا سکے (ہالینڈ کا Greet Wilders بھی گول ڈزیہر کی طرح اسلام کو جنگجو مذہب سمجھتا ہے۔ قرآن کے عام اور خاص حکم کے فرق کو نہ سمجھنے والا یہ ڈچ قانون دان قرآن مجید کو ہٹلر کی کتاب Mein Kampf کی طرح کی کتاب قرار دیتا ہے اور اس کی اشاعت پر پابندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اُس نے اس موضوع پر Fitna نامی ایک فلم بھی بنائی ہے جس میں وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قرآن تشدد اور غیر جمہوری رویوں کی تعلیم دیتا ہے جو کہ سراسر غلط اور قرآن نافہمی پر مبنی ہے۔ قرآن خود کو انسانوں کے لئے رحمت اور شفا قرار دیتا ہے)۔

۲) اسلام کا دفاع

ابتدا میں جن لوگوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اُن کا ایمان ڈھل مل تھا اور تنظیمی نکتہ نگاہ سے وہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتے تھے خصوصاً

مرتدین[۱] نے عرب کے مختلف حصوں میں شورش برپا کر رکھی تھی۔ اِدھر رسول اکرمؐ اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں لشکر کو روم روانگی کا حکم دینے کے بعد رحلت فرما گئے تھے اور اُدھر رومی اور ایرانی سلطنتیں نومولود اسلامی مملکت پر حملہ کرنے اور اسلام کو ختم کرنے کے لئے پرتول رہی تھیں۔ ایسے نازک موقع پر اگر امام علیؑ حصول خلافت کے لئے حضرت ابوبکرؓ سے ٹکر لیتے تو اسلام کی نوتعمیر شدہ عمارت مسمار ہو جاتی۔

اس صورت میں اسلام کی عظمت قصۂ پارینہ ہو جاتی اور اسلام کا پرچم سرنگوں ہو جاتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ شخص جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے لڑتا رہا ہو اور جس نے اسلام کو عزت و شوکت دلائی ہو وہ کوئی ایسا اقدام کرے جس سے

۱۔ امام علیؑ کو اسلام کی حفاظت اور مرتدین کے فساد کو دور کرنے کے لئے مجبوراً حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنا پڑی کیونکہ اس وقت مدینے سے باہر کچھ افراد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا مثلاً مسیلمہ کذاب نے حیات رسولؐ کے آخری ایام میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بعد رسولؐ اُس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اُس نے قرآن مجید کا خاکہ اڑاتے ہوئے مسجع ابیات موزوں کئے اور یہ اعلان کیا کہ ایک نبی ہمارے قبیلے سے ہوگا اور ایک قبیلہ قریش سے ہوگا اس لئے اُس کے قوم قبیلے نے اُسے نبی مان لیا تھا۔ اُس کی قوت آہستہ آہستہ اتنی بڑھی کہ اس کے پاس چالیس ہزار جنگجو افراد جمع ہو گئے جو کسی وقت بھی مدینے پر چڑھائی کر سکتے تھے کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ وہ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب ہو جاتے تو سب سے پہلے امام علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو شہید کر دیتے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کا نشان تک مٹا دیتے۔ اُس دور میں صرف مردوں نے ہی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ بنی تمیم کی ایک عورت سجاح نے بھی نبوت کا اعلان کر دیا تھا۔ اُس نے بھی بیعت سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ان مدعیان نبوت کے علاوہ عرب کے کئی قبائل مرتد ہو گئے تھے بنی تمیم کے نعمان بن منذر ساوی نے بحرین میں تاج شاہی پہن لیا تھا۔ نیز بنی ناجیہ کے لقیط بن مالک نے عمان میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا اور لوگ اسے "ذوالتاج" کے نام سے پکارنے لگے تھے جب پورے عرب پر کفر و ارتداد کی آندھیاں چلنے لگیں تو حضرت عثمانؓ، امام علیؑ کو منانے آئے اور کہنے لگے کہ اے ابن عم! اس وقت آپ گرد و پیش کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ نے بیعت نہیں کی تو مبادا اسلام مٹ جائے گا۔ (تفصیل کی لئے دیکھئے: علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب "احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار" ج ۲، ص ۳۳۳)

اسلام کی بنیاد ہی ڈھے جائے؟

بلاشبہ امام علیؑ اسلام کی بقا کی خاطر خاموش رہے اور آپ نے خانہ جنگی نہیں ہونے دی۔ آپ کا یہ طرز عمل بالکل مناسب تھا۔ بالفرض آپ کا کوئی مقروض قرضہ ادا کرنے سے انکار کردے اور آپ جانتے ہوں کہ دباؤ ڈالنے کی صورت میں خون خرابہ ہوگا تو اس صورت میں آپ اچھے تعلقات کی خاطر جھگڑا مول نہیں لیں گے۔

۳) امام علیؑ حکومت کے حریص نہیں تھے

پروفیسر عباس محمود عقاد مصری نے اپنی کتاب فاطمۃ الزہراؑ (ص ۵۶، مطبوعہ دار الہلال) میں لکھا ہے:

"علیؑ کو یقین تھا کہ آپ خلافت کے حق دار ہیں لیکن آپ (حکومت کے خلاف) نہیں اٹھ سکتے تھے۔ سول سوسائٹی کو چاہیے تھا کہ آپ کے حق کی خاطر آواز اٹھاتی اور اُس کا مطالبہ کرتی۔"

عقاد کی یہ رائے امام علیؑ کے متقیانہ کردار کی عکاس ہے۔

آپ خود فرماتے ہیں: "میرے نزدیک تمہاری دنیا کی اہمیت بکری کی رینٹ سے زیادہ نہیں۔"

ایک عارف امام علیؑ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"آپ کی نظر میں دنیا اُس مشت غبار سے بھی حقیر تھی جو آندھی کے بگولے کے آگے ڈال دی جائے اور موت آپ کے نزدیک سخت پیاس میں ٹھنڈا پانی پینے سے زیادہ خوش گوار تھی۔" جب امام علیؑ کی نظر میں دنیا اتنی حقیر تھی تو اُن کی حکومت کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

۴) اندرونی دشمن

خود مسلمانوں میں بھی امام علیؑ کے بہت سے دشمن تھے کیونکہ ان کے باپ،

بھائی اور دوسرے رشتے دار اسلامی جنگوں میں آپ کی شمشیر براں سے قتل ہوئے تھے۔ اگر امام اپنا حق لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو وہ لوگ آپ پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا الزام لگاتے اور مذہب کی آڑ لیکر آپ کے خلاف جنگ کرتے لہٰذا آپ اُن اندرونی دشمنوں کو ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں کہ جو آدمی دشمن کو یہ موقع دے کہ بلاوجہ اُس کا گوشت پوست، ہڈیاں اور خون غارت کردے وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسا آدمی کم ظرف ہوتا ہے۔

۵) حاسد لوگ

امام علیؑ کے دشمنوں میں کئی ایک ایسے افراد بھی تھے جو آپ سے حسد کرتے تھے۔ جب خلیل بن احمد سے پوچھا گیا کہ رسول اکرمؐ کے صحابہ ایک دوسرے کے سگے بھائیوں کی طرح تھے لیکن کیا وجہ تھی کہ علیؑ ایسے تھے جیسے اُن کے بھائی نہ ہوں خلیل نے جواب دیا کہ علیؑ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ شرف اور علم وحلم نیز سچائی اور دیگر خوبیوں میں سب سے افضل تھے اس لئے لوگ اُن سے حسد کرتے تھے کیونکہ "لوگ اُس شخص کی جانب مائل ہوتے ہیں جو اُن کے جیسا ہو۔"

جب مسیلمہ بن نمیل سے پوچھا گیا کہ لوگوں نے امام علیؑ کو کیوں چھوڑ دیا حالانکہ وہ سب سے افضل تھے تو انھوں نے کہا کہ لوگ "آفتاب امامت" کا "جلوہ" دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔

ابو الہیثم بن تیہان نے جو ایک جلیل القدر صحابی تھے امام علیؑ سے کہا: "قریش آپ سے دو چیزوں کی بنا پر حسد کرتے ہیں۔ جو اُن میں اچھے ہیں وہ شرف اور فضیلت میں آپ کی برابری کرنا چاہتے ہیں اور جو برے ہیں اُن کے حسد کی وجہ اُن کی سنگدلی اور بدعملی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ آپ کو جو بزرگی ملی ہے وہ اس سے محروم ہیں چنانچہ وہ آپ کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ سے آگے

بڑھ جائیں۔ خدا کی قسم! اُن کا مقصد بہت طویل ہے۔ جب آپ آگے بڑھ گئے اور وہ آپ کی گرد کو نہ پہنچ سکے تو انھوں نے آپ کے ساتھ وہ کچھ کیا جو آپ نے دیکھ لیا۔ خدا کی قسم! آپ وہ ہیں جن کا قریش کو سب سے زیادہ شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ آپ ہی نے رسول اکرمؐ کی زندگی میں اُن کی نصرت کی اور اُن کی رحلت کے بعد اُن کی وصیت پر عمل کیا اور اُن کے قرضے چکائے۔ خدا کی قسم! قریش نے خدا کے ساتھ ظلم کیا ہے اور اُس کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑ دیا ہے۔ خدا خود اُن سے اپنا انتقام لے گا۔ ہم انصار اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے آپ کی حمایت کرتے ہیں۔ ہم آپ کے اُن دشمنوں سے جو موجود ہیں ہاتھوں سے لڑیں گے اور جو موجود نہیں ہیں اُن کے خلاف زبانوں سے لڑیں گے۔"

جب مسلمانوں نے امام علیؑ کے خلاف اپنے دلوں میں دشمنی پال لی تو آپ کس کی مدد سے لڑ سکتے تھے اور کس پر بھروسا کر سکتے تھے؟ اس کے برعکس حضرت ابوبکرؓ کی بیعت حاصل کرنے کے لئے اُن کے حامیوں نے طاقت کا مظاہرہ کیا۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں: ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ بن جراح اور دیگر صحابہ کا گروپ ہر آدمی کے پاس گیا اور یہ پروا کئے بغیر کہ وہ ابوبکرؓ کی بیعت کرنے پر راضی ہے یا نہیں اُس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر ابوبکرؓ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

علی عبدالرزاق اپنی کتاب الاسلام و اصول الحکم میں لکھتا ہے: "حضرت ابوبکرؓ کی بیعت زور زبردستی سے کرائی گئی تھی جیسا کہ دورِ حاضر کی سیاسی حکومتیں دھونس دھاندلی سے کام لیتی ہیں۔ چونکہ دنیاوی حکومتوں کی طرح حکومت ابوبکرؓ کا انحصار بھی طاقت پر تھا اور اُن لوگوں کو یقین تھا کہ حضرت علیؑ اُن سے جنگ نہیں کریں گے اس لئے انھوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کر دیا کہ دو انتخابوں میں سے کسی ایک کو قبول کریں۔ چونکہ جنگ کرنے کے مقابلے میں بیعت کرنے سے اسلام کو کم نقصان پہنچنے کا امکان تھا اس لئے حضرت علیؑ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرلی۔"

تشیع کی پیشرفت

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں تشیع رسول اکرمؐ کے زمانے میں وجود میں آیا تھا اور کچھ صحابہ اس بات کے قائل تھے کہ خلافت کے جائز حق دار امام علیؑ ہیں اس لئے امام علیؑ اور اُن کے حامیوں نے مرحلۂ اوّل میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی امام علیؑ کے پیش نظر اسلام کی حفاظت اور لوگوں کی فلاح تھی اس لئے انھوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا۔

بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت میں بیت المال کا نظام صاف شفاف طریقے سے چلتا تھا۔ انھوں نے حکومتی کاروبار میں اپنے کسی عزیز رشتے دار کی رو رعایت نہیں کی تھی اس لئے تحریک چلانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ تاہم چونکہ حضرت عثمانؓ اور بنی امیہ نیز بعد میں بنی عباس اسلام کے متعین راستے سے ہٹ گئے (اور خلافت، ملوکیت[1] میں بدل گئی) اس لئے شیعہ مجبور ہوگئے کہ اُن کی

۱۔ مولانا مودودی مرحوم اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور کے پانچویں باب میں رقمطراز ہیں کہ اسلام میں ملوکیت کے آجانے کی وجہ سے

(۱) تقررِ خلیفہ کے دستور میں تبدیلی ہوئی۔ (۲) خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی ہوئی۔
(۳) بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی ہوئی۔ (۴) آزادیِ اظہارِ رائے کا خاتمہ ہوا۔
(۵) عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ (۶) شوروی حکومت کا خاتمہ ہوا۔
(۷) نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور ہوا۔ (۸) قانون کی بالاتری کا خاتمہ ہوا۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم اپنی کتاب "یزید نامہ" مطبوعہ مکتبہ کاظمیہ لاہور کے صفحہ ۹۸ پر "امیر معاویہ کے سیاسی جرائم" کے ذیل میں لکھتے ہیں: "یہ چودھویں اور بیسویں صدی سیاست کی صدی ہے۔ اس دور میں معمولی معمولی آدمی بھی کلیات و سیاست پر بحث کرنی جانتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں تمام شخصی اور خود مختار حکومتوں کا ستیاناس ہوگیا اور دنیا کے ہر گوشے میں جمہوریت کے جھنڈے نصب ہوگئے۔ آج جن اصول مساوات اور باہمی مشارکت پر حکومت کی مشین چلائی جا رہی ہے یا اُس کے مطالبات ہو رہے ہیں یہ سب اسلامی جمہوریت کے اصل سے اخذ کئے گئے ہیں ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

بے اعتدالیوں پر احتجاج کریں، اُن سے ٹکر لیں اور اُن کے خلاف تحریک چلائیں۔ وہ لوگ جو حکومتوں سے لڑتے ہیں تاکہ اختیارات پر قبضہ کرلیں وہ برملا یہ نہیں کہتے کہ ہماری لڑائی کرسی کے لئے ہے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کے اُن حقوق کا تحفظ کرنا ہے جو ان حکمرانوں نے پامال کر رکھے ہیں۔ اس اعتبار سے خلافت اول اور ثانی میں ایسی خرابیاں نہیں تھیں اور لوگوں کے حقوق پامال نہیں کئے گئے تھے کہ محاذ آرائی ناگزیر ہوجاتی۔ لہٰذا اُن کے دور میں شیعوں کی تنقید اور محاذ آرائی کے اثرات مرتب نہیں ہوئے جبکہ حضرت عثمانؓ کی حکومت کی بدعنوانیوں کا احتساب ہونے لگا جو بالآخر اُن کے قتل کا باعث بنا۔ غرض کہ بنو امیہ اور بنو عباس کی حکومتوں نے اور دوسرے آمر و جابر حکمرانوں نے جتنا

وقت میں بھی یہی جمہوریت تھی اور چاروں خلفاء کے زمانے میں بھی۔ مگر امیر معاویہ نے اس کو توڑ ڈالا انھوں نے تلوار اور ڈپلومیسی کے زور سے اسلامی جمہوریت کے تمام قویٰ کو پامال کردیا اور قیصر و کسریٰ کے شخصی اقتدار کو اپنی ہستی میں نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے۔ اُن کی ذات نے امیر و غریب کا امتیاز قائم کردیا۔ اُن کے دورِ حکومت نے ذات پات کا فخر دوبارہ ابھار دیا جس کو آنحضرتؐ نے زورِ مذہبیت سے دبا دیا تھا۔ انھوں نے افراد کی عمومیت و مساوات کو مٹا کر شخصیات کی تفریقیں پیدا کیں اور وہ دو سروں کی مل کر ایک رکابی میں طعام نوشی مفقود ہوگئی۔ وہ رائے کی آزادی اور بے باکی تلواروں نے اپنے ظلم و ستم سے نابود کردی۔ یہاں تک کہ معاویہ نے عبادت میں بھی عوام سے امتیاز پیدا کیا اور بادشاہ کے لئے مسجد میں ایک محدود و مخصوص جگہ بنوائی جس نے شاہ و گدا کی مساوات کھو دی جبکہ پروردگار کے سامنے بازو سے بازو ملائے کھڑے ہوتے تھے۔

اگر معاویہ نہ ہوتے تو آج تمام دنیا کا جمہوری قانون اسلامی جمہوریت کے ماتحت ہوتا۔ معاویہ نے مسلمانوں کے سیاسی فروغ کو جو اصولِ مساوات کی بجلیوں کے ساتھ افقِ کائنات پر چمکنا چاہتا تھا نفسانیت کے بادلوں میں دبا دیا اور چھپا دیا۔ آج معاویہ زندہ ہوتے تو ہندوستان کے بنگالی اُن پر گولی چلاتے، یورپ کے سوشلسٹ اُن کو ملیامیٹ کردینے کی کوشش کرتے اور اگر وہ زندہ نہیں ہیں تو نہ سہی اُن کے اعمال و افعال تاریخوں میں زندہ ہیں جن کو جمہوریت کے تمام فدائی اور حریت کے کل شیدائی قیامت تک نفرت و حقارت سے یاد کریں گے۔

زیادہ ظلم کیا اور عوام کے حقوق سلب کئے اتنا ہی زیادہ اہلِ تشیع نے مزاحمت کی۔ انھوں نے انصاف کا اور حکومت حضرت علیؑ کے خاندان کو منتقل کرنے کا مطالبہ کیا۔

مسلمانوں کی رہبری کی تصریح

۱) اہلِ تشیع کا عقیدہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو بالصراحت امام بنایا تھا چنانچہ اُن کی خصوصی صفات مسلمان حکمرانوں کے لئے بنیادی شرائط قرار پاتی ہیں۔

۲) اپنی ساری زندگی میں امام علیؑ نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا اور کسی کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرایا۔ نیز آپ نے اپنی ساری زندگی میں کبھی دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی خطا نہیں کی۔ چنانچہ مسلمانوں کے رہبر اور رسولِ اکرمؐ کے خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی پیغمبروں کی طرح معصوم عن الخطا ہو۔ مسلمانوں کی امامت کے لئے عصمت کی لازمی شرط کے سلسلے میں شیعہ کہتے ہیں:

"مسلمانوں کے رہبر پیغمبروں کی طرح اسلام کے محافظ اور اسلامی قوانین کو نافذ کرنے والے ہیں۔ اگر اُن کے لئے اسلام کے احکام کی مخالفت کرنا جائز ہو تو وہ نہ اسلام کا دفاع کرسکتے ہیں اور نہ اُن قوانین کو نافذ کرسکتے ہیں جن کی انھوں نے خود خلاف ورزی کی ہو۔"

اس بات کے اثبات کے لئے اہلِ تشیع اس آیت سے استدلال کرتے ہیں
وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرَاھِیْمَ رَبُّهٗ بِکَلِمَاتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ "جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ اُن میں پورے اُترے۔ خدا نے کہا کہ میں نے تمھیں لوگوں کا امام بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد کو بھی یہ منصب ملے گا۔ خدا نے فرمایا کہ میرا یہ منصب ظالموں کو نہیں ملا کرتا۔" (سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۴)

اس آیت کے مطابق ظالم اور گنہگار لوگ جنھوں نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی خدا کی نافرمانی کی ہو امامت اور مسلمانوں کی رہبری کے اہل نہیں ہیں۔

۳) جس طرح امام علیؑ تمام صحابہ سے افضل تھے اسی طرح ضروری ہے کہ مسلمانوں کا رہبر بھی تمام صفات میں اپنے زمانے کے لوگوں سے افضل ہو کیونکہ عقل اور شرع کہتی ہے کہ جو شخص علم اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو وہ اُن لوگوں کی اتباع نہیں کرسکتا جو اُس سے کمتر ہوں۔ قرآن کہتا ہے: ''کیا وہ جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اُس کی اتباع کی جائے یا وہ کہ جب تک کوئی اُسے ہدایت نہ کرے ہدایت نہیں پاسکتا۔ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟'' (سورۂ یونس: آیت ۳۶)

یہ صفات جو اہل تشیع مسلمانوں کے رہبر اور اپنے امام کے لئے ضروری جانتے ہیں کسی حاکم میں نہیں دیکھی گئیں۔ یہ فقط امام علیؑ اور اُن کی پاک اولاد کا امتیاز ہے۔ ان اماموں میں سے پہلے امام کا تعین رسول اکرمؐ نے فرما دیا تھا اور ہر آنے والے امام کی نامزدگی اُس کے پیشرو امام نے کی تھی۔

ان باتوں کی روشنی میں شیعہ اُن حکمرانوں کو جو امام علیؑ کی اولاد نہیں ہیں رسمی طور پر تسلیم نہیں کرتے اور انھیں اہل بیتؑ کے حقوق کا غاصب سمجھتے ہیں کیونکہ یہ منصب خدا نے بالصراحت امام علیؑ کی پاک اولاد کو عنایت فرمایا ہے۔ اہل تشیع نے ہمیشہ ایسے غاصب حکمرانوں کی مخالفت کی ہے اور اُن کے خلاف صف آراء رہے ہیں اگر وہ کسی وقت خاموش رہے ہیں تو اُس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے اُن لوگوں کو جائز حکمران مان لیا ہے۔ اُن کا ہمیشہ یہ موقف رہا ہے کہ غاصبوں کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ اُن حکمرانوں کے خلاف سینہ سپر ہوا جائے جو حکمرانی کی شرائط (رہبری کی تصریح عصمت اور افضلیت) پر پورا نہیں اُترتے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر دور میں شیعہ کس جرم کی پاداش میں قتل کئے گئے اور حقوق سے محروم رکھے گئے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے غاصب حکمرانوں سے جو ٹکر لی اُس کی بنیاد دین اور ایمان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ظالم حکومتوں کی اطاعت

سنی علماء نے اپنی فقہ اور عقائد کی کتابوں میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ
''کیا لوگوں پر ایک فاسق اور ظالم حکمران کی اطاعت واجب ہے؟''

شیخ ابو زہرہ **المذاهب الاسلامیہ** میں رقمطراز ہیں کہ احمد بن حنبل شافعی اور مالک کہتے ہیں کہ لوگوں پر لازم ہے کہ حکام کے مظالم پر صبر کریں۔

قاضی عبدالرحمٰن ایجی (متوفی ۷۵۶ھ) کی **المواقف فی علم الکلام** جز ۸ کے آخر میں نیز السید الشریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) کی **شرح المواقف** میں ہے: ''مرجئہ[1] کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی شخص کا ''ایمان'' سلامت ہو تو اُس کے گناہ اسے

۱۔ متکلمین کا ایک گروہ مرجئہ کہلاتا تھا۔ بحمدللہ اب یہ ختم ہوگیا ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اگر ایمان سلامت ہو تو کسی عمل سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل اُن کے اس عقیدے کا محرک سیاسی مصلحت تھی۔ یہ لوگ بنی امیہ کے زمانے میں تھے اور انھیں اُن کی تائید حاصل تھی۔ یہ لوگ اس طرح امراء و سلاطین بنی امیہ کے اعمال کے لئے ایک وجہ جواز مہیا کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ تاریخ کہتی ہے۔ وہ کہتے تھے: جناب! اگر آپ کا ایمان درست ہے تو پھر عمل کی کوئی اہمیت نہیں۔ عمل کرو تو کرو، نہ کرو تو نہ کرو، عمل کوئی چیز نہیں۔ جب بنی امیہ کو زوال آگیا تو بنی عباس نے اُس دشمنی کی بنا پر جو انھیں بنی امیہ سے تھی، مرجئہ کی بیخ کنی کردی لیکن افسوس کی بات ہے کہ اب مرجئہ کی سوچ نے شیعوں کے دماغ میں جڑ پکڑلی ہے حالانکہ جو قصہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاً شیعہ عقیدہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

احمد امین نے ''ضحی الاسلام'' میں ابو الفرج اصفہانی کی ''اغانی'' سے ایک روایت نقل کی ہے۔ خود احمد امین کا رجحان شیعوں کے خلاف ہے لیکن بہرکیف اُس نے یہ روایت نقل کی ہے۔

کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر کوئی شخص کافر ہو تو اُس کی نیکیاں اُسے کوئی فائدہ

ایک شخص جس کا انھوں نے نام بھی لیا ہے، وہ کہتا تھا کہ ایک شیعی اور ایک مرجئی اپنے عقائد کے بارے میں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ مرجئہ کے اصول زیادہ صحیح ہیں اور دوسرا کہتا تھا کہ شیعہ کے۔ مرجئی کہہ رہا تھا کہ عمل کوئی چیز نہیں، اصل چیز صرف ایمان ہے جبکہ شیعہ کہہ رہا تھا کہ عمل ضروری ہے۔ اسی اثناء میں وہاں ایک گویا آنکلا۔ (میں گویا اُس قرینے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ یہ اغانی کی روایت ہے)۔ دونوں نے کہا کہ آؤ اس سے پوچھ لیں کیونکہ یہ آدمی سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ دونوں نے طے کیا کہ اُس سے پوچھتے ہیں کہ شیعہ حق پر ہیں یا مرجئہ۔ آخر وہ اُس کے پاس گئے اور اُس سے پوچھا کہ میاں تمہارا عقیدہ کیا ہے؟ آیا شیعہ حق پر ہیں یا مرجئہ؟ اُس نے جواب دیا کہ اَعْلَایَ شِیْعِیٌّ وَ اَسْفَلِیْ مُرْجِئِیٌّ میرا اوپری حصہ شیعی اور نچلا حصہ مرجئی ہے یعنی میں عقیدے میں شیعہ ہوں مگر عمل کے لحاظ سے مرجئی ہوں یعنی میں شیعہ عقائد کو تسلیم تو کرتا ہوں مگر اُن کے مطابق عمل نہیں کرتا۔

اب ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم ایسی قوم بن گئے ہیں کہ فکر کے لحاظ سے بھی مرجئی ہیں اور عمل کے لحاظ سے بھی۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے مطابق کہنا چاہیے کہ ہماری دینی سوچ نیم مردہ ہو چکی ہے یا یوں کہوں کہ مر گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہماری سوچ ہی مرجئہ کی سی ہو گئی تو اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ جب سوچ یہ ہو کہ عمل کی ضرورت ہی نہیں تو پھر کیا دنیا رہ سکتی ہے؟ آخرت رہ سکتی ہے؟ عزت رہ سکتی ہے؟ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا استحقاق رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ہماری دینی فکر کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ دین کے بارے میں ہمارا اندازِ فکر غلط ہے۔ میں کہنے کی جسارت کروں گا کہ چند عبادات کے فروعی مسائل اور چند معاملات کو چھوڑ کر دین کے بارے میں ہماری سوچ قطعاً درست نہیں۔ ہم نہ اپنی مجلسوں اور خطبوں میں صحیح بات کہتے ہیں نہ کتابوں اور رسالوں میں صحیح بات لکھتے ہیں اور نہ ہی صحیح طریقے سے سوچتے ہیں۔ اس سے قبل کہ ہم دوسروں کو مسلمان بنانے کی فکر کریں ہمیں خود اپنی خبر لینی چاہیے۔ مسجد میں چراغ جلانے سے پہلے اپنے گھر کا دیا روشن کرنا چاہیے۔

مذہب زندگی ہے، حرکت ہے، بیداری ہے مگر کون سا مذہب؟ وہ مذہب جو پیغمبر اسلامؐ لائے ہیں۔ ساتھ ہی مذہب معاشرے کے لئے افیون بھی ہے مگر کون سا مذہب؟ وہ معجون مرکب جو ہم نے خود تیار کیا ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے: اِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فَعَلَى الْعَالِمِ اَنْ يُّظْهِرَ عِلْمَهٗ وَاِلَّا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ یعنی اگر لوگوں میں بدعات پھیل جائیں تو عالم کا فرض ہے کہ اپنے علم کا اظہار کرے ورنہ وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہوگا۔'' (استاد مرتضیٰ مطہری، سُخن)

نہیں پہنچا سکتیں۔ ایک اور گروہ کا عقیدہ ہے کہ ''ایمان'' کے معنی اللہ کو ماننا، اُس کے سامنے فروتنی اختیار کرنا اور اُس سے قلبی محبت رکھنا ہے۔ جس شخص میں یہ باتیں پائی جائیں وہ مومن ہے اور اللہ کی نافرمانی اور گناہ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔''

اس عقیدے کی بنا پر اُن کے نزدیک ایسے ظالم حکمران کے خلاف اٹھنا جائز نہیں جو دینِ خدا کے ساتھ کھلواڑ کرتا ہو اور بندگانِ خدا پر ظلم کرتا ہو کیونکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے گا اور سلطنت کا نظام اور امن و امان درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کتاب میں حضرت ابوبکرؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''جب فتنہ پھیل جائے تو اُس وقت چلنے سے بیٹھ جانا بہتر ہے اور دوڑ دھوپ کرنے سے چلنا بہتر ہے اور دوڑ دھوپ کرنا فتنے میں ملوث ہونے سے بہتر ہے۔''

''جب فتنہ پھیل جائے تو (تم تتر بتر ہو جاؤ) جس کے پاس اونٹ یا بھیڑیں ہوں وہ انھیں چرانے کے لئے جنگل میں چلا جائے اور جس کے پاس زراعت کے لئے زمین ہو وہ کھیتی باڑی میں جت جائے۔''

کسی نے کہا یا رسول اللہؐ! جس کے پاس اونٹ یا بھیڑیں یا زمین نہ ہو وہ کیا کرے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اپنی تلوار پتھر پر مار کر توڑ ڈالے'' (تاکہ حکمرانوں کے خلاف لڑنے کا امکان باقی نہ رہے)۔

بلاتردید ایسی احادیث قدیم اور جدید حکمرانوں کے کاسہ لیس علماء گھڑتے ہیں ایسے علماء نے حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور اُن کے مفادات کی حفاظت کے لئے قرآن کی من مانی تفسیریں لکھی ہیں۔

شیخ محمد ابوزہرہ نے المذاهب الاسلامیه کے ص ۱۵۸ پر ایک ایسی ہی جعلی حدیث صحیح بخاری سے نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''اگر ایک شخص برسراقتدار آجائے اور خدا کی نافرمانی کرے تو جو شخص اُسے

گناہ کرتا ہوا دیکھے اُسے چاہیے کہ اُس سے نفرت کرے لیکن اُس کے خلاف لڑنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے۔"

ان جعلی احادیث کے علاوہ اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے اعمال کی بجاآوری میں مجبور ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے قضا وقدر کے مطابق کرتا ہے (یعنی دست قضا نے حکمرانوں کو ظلم کرنے پر مجبور کیا ہے چنانچہ ہمیں اُن کے مظالم پر صبر کرنا چاہیے)۔

جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے اور خدا نے اُسے ظلم کرنے پر مجبور نہیں کیا انسان اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے۔ خلافت ایک الٰہی حق ہے جو علیؑ اور اولادِ علیؑ نیز اُن کے "نمائندوں" میں منحصر ہے اس لئے شیعہ علماء نے "عادل حکمرانوں" سے مروت برتی ہے اور اُن کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک حاکم کافر ہو لیکن عادل ہو تو وہ ایسے حاکم سے بہتر ہے جو مسلمان ہو مگر ظلم کرتا ہو۔

سید ابن طاؤس کا یہ قول مشہور ہے کہ ایک "انصاف پسند کافر" ایک ظالم مسلمان سے بہتر ہے۔ علامہ باقر مجلسی نے بھی بحار الانوار میں لکھا ہے: اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

نہج البلاغہ کے مؤلف جناب شریف رضی نے عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ لوگوں کو بنی امیہ کے لئے رونا چاہیے تو میں تمہارے لئے روؤں گا (کیونکہ وہ انصاف پسند اور قوم کے خیر خواہ تھے)۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے: "جو شخص گنہگاروں کی اطاعت کرے وہ بے دین ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: مَنْ اَرْضٰی سُلْطَانًا جَائِرًا بِسَخَطِ

اللّٰہِ خَرَجَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ جو آدمی ظالم حکمران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خدا کو ناراض کرے وہ خدا کے دین سے نکل جاتا ہے۔

امام علی علیہ السلام کا ملفوظ ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ مخلوق کی فرمانبرداری کے لئے خالق کی نافرمانی نہیں کی جاسکتی۔

ظالم حکومتوں کے ساتھ تعاون

شیعہ علماء کا اعتقاد ہے کہ جو افعال ظالموں کے ساتھ تعاون کرنے کے مترادف ہوں وہ ناجائز ہیں اور کبیرہ گناہ شمار ہوتے ہیں۔

ہارون رشید کے زمانے میں (ایک شیعہ) صفوان جمال اونٹ کرائے پر دیتا تھا اور یہی اُس کی روزی کا ذریعہ تھا۔ ایک مرتبہ ہارون نے حج کے لئے صفوان سے کچھ اونٹ کرائے پر لئے۔ اسی دوران ایک دن صفوان امام کاظمؑ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ اُن کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

امام: تمہارے سب اعمال اچھے ہیں سوائے ایک کے۔

صفوان: وہ کیا ہے۔ مولا؟

امام: ہارون کو اونٹ کرائے پر دینا۔

صفوان: بخدا میں نے اونٹ اس مقصد سے کرائے پر نہیں دیئے کہ وہ ظلم کرے، شکار کو جائے یا عیش وطرب میں مشغول ہو۔ میں نے وہ اونٹ اُسے حج پر جانے کے لئے دیئے ہیں۔ علاوہ ازیں اُن اونٹوں کا انتظام میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ میرے کارندوں کے ہاتھ میں ہے۔

امام: کیا اُن کا کرایہ ہارون کے ذمے ہے۔

صفوان: جی!

امام: کیا تم چاہتے ہو کہ وہ زندہ رہے تاکہ تمہیں کرایہ ادا کرے۔

صفوان: جی!

امام: جو شخص چاہے کہ ایسے لوگ زندہ رہیں اُس کا شمار بھی اُن ہی لوگوں میں ہوتا ہے اور جو اُن میں سے ہو اور وہ جہنم میں جائے گا۔

یہ سن کر صفوان اٹھے۔ بازار گئے اور اپنے تمام اونٹ بیچ دیئے۔ جب ہارون کو یہ خبر ہوئی تو اُس نے صفوان کو بلوا بھیجا۔ صفوان آئے تو ہارون نے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے تمام اونٹ بیچ دیئے ہیں۔

صفوان: جی! میں نے اپنے اونٹ بیچ دیئے ہیں۔

ہارون: تم نے ایسا کیوں کیا؟

صفوان: میں اب بڈھا ہوگیا ہوں اور اونٹوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا اور میرے کارندے بھی اُن کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔

ہارون: نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ایسا کس کے اشارہ پر کیا ہے۔ موسیٰ بن جعفرؑ نے تمھیں اونٹ بیچنے کا مشورہ دیا ہے۔

صفوان: میرا موسیٰ بن جعفرؑ سے کیا واسطہ؟

ہارون: ان باتوں کو رہنے دو۔ اگر ہماری تمہاری دوستی نہ ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کرا دیتا۔

امام جعفر صادقؑ کا خط منصور کے نام

عباسی خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو ایک خط میں لکھا کہ آپ اور لوگوں کی طرح میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ امام نے جواب میں لکھا کہ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے بارے میں مجھے ڈر ہو کہ تم اُسے چھین لو گے اور تمہارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو مجھے آخرت میں نفع پہنچا سکے اور تمھیں ایسی کوئی نعمت میسر نہیں کہ میں تمھیں تبریک پیش کروں اور نہ تم کسی ایسی مصیبت میں ہو کہ میں اظہار ہمدردی کروں۔

منصور نے آپ کو دوبارہ لکھا کہ ’’آپ آئیں اور مجھے نصیحت فرمائیں۔‘‘

امام نے جواب میں لکھا: ’’وہ جسے دنیا کی تمنا ہو تمھیں نصیحت نہیں کرے گا اور وہ جسے آخرت کی طلب ہو وہ تمہارا مصاحب نہیں بنے گا۔‘‘

منصور نے کہا: ’’بخدا! ابو عبداللہؑ نے مجھ پر لوگوں کی حقیقت روشن کر دی ہے اور مجھے دنیا اور آخرت کے طلبگاروں کا فرق بتا دیا ہے۔‘‘

تاریخ میں اس قسم کے بیشمار واقعات ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ شیعہ اکابرین اور نجف اشرف، قم مقدسہ اور دیگر شہروں کے مراجع عظام کاروبارِ حکومت میں دخل اندازی کیوں نہیں کرتے اور وہ سیاستدانوں سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں۔ اُن کی روش سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ انھیں یہ طرزِ عمل ائمہ طاہرین علیہم السلام سے ورثے میں ملا ہے۔

حکومتی امور میں شرکت

کچھ شیعہ علماء نے فتویٰ دیا ہے کہ امور حکومت میں حصہ لینا حرام ہے۔ فقط ایسے سرکاری کاموں میں حصہ لینا جائز ہے جو مومنین کے مفاد میں ہوں اور جس کا مقصد انھیں ظلم سے بچانا ہو۔ اس کے علاوہ حکومت کے کسی کام میں حصہ لینا خواہ وہ جزوی طور پر ہی ہو حرام ہے۔ بلکہ شیعہ علماء نے جابر حکمرانوں کے ’’اعمال‘‘ کے بارے میں بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً انھوں نے ائمہ جمعہ و جماعت کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے جبکہ اکثر حکمرانوں نے ’’جمعہ‘‘ پڑھایا ہے عدل کی شرط کا لازمہ ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو شخص نماز پڑھا رہا ہے وہ فاسق اور ظالم ہے تو اُن کی نماز باطل ہے۔

عدل کی شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق رہبری کی شرائط دیانتداری اور اخلاص تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ رہبر کا عادل ہونا بھی ضروری ہے۔

شیعہ فقہاء نے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ ناچ گانا، آلات موسیقی استعمال کرنا سیر وشکار کرنا اور رنگ رلیاں منانا حرام ہے تاہم حکمرانوں نے یہ کام خود بھی کئے ہیں اور عوام کو بھی اس کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور یہ چیز بجائے خود فتوے کی صریح مخالفت ہے اور حکمرانوں کے فسق کو ثابت کرتی ہے۔

ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ شیعہ عقیدے کی بنیاد فساد اور ظلم کے خلاف انقلاب پر قائم ہے۔ لہٰذا اگر کوئی جابر حکمران شیعوں کو نابود کرنے کے درپے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمام جابروں کا یہی وطیرہ رہا ہے۔

ظالم اور نام نہاد دینی حکومتیں

ظالم اور جابر حکومتیں لوگوں کے مال اسباب لوٹ لیتی ہیں۔ آزاد لوگوں پر تشدد کرتی ہیں اور اُن کی زندگیوں سے کھیلتی ہیں۔ ظلم کے اس ماحول میں وہ بے ضمیر ملاؤں کا انتخاب کرلیتی ہیں جو ان کے جرائم کی توثیق کرتے ہیں اور اُن جرائم کو دینی رنگ دیتے ہیں۔ معاویہ نے ایسے ہی کام کے لئے ابوہریرہ دوسی[1]

۱۔ صحیح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی میں ہے کہ

ابوہریرہ نے ایک حدیث بیان کی تو حاضرین نے پوچھا کہ کیا یہ حدیث تم نے خود رسول اکرمؐ سے سنی تھی؟ اُس نے کہا: نہیں۔ یہ حدیث میں نے اپنی جیب سے نکالی ہے۔

مُرُوج الذھب جلد ۳ صفحہ ۴۵۴ مطبوعہ دار الاندلس میں ہے کہ

ابوہریرہ نے ۵۳۰۰ سے زائد جعلی احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کی ہیں۔

ابوہریرہ نے خود اپنے بارے میں کہا تھا کہ

میرے پاس علم کے کئی "دفتر" ہیں جنھیں میں نے ابھی کھولا نہیں۔ اور میں نے رسول خداؐ سے علم کے دو "ظرف" حاصل کئے تھے۔ ایک کو تو میں نے ظاہر کردیا ہے اور اگر میں دوسرے کو ظاہر کردوں تو یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔ اور جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر وہ سب کا سب میں تمھیں بتادوں تو لوگ کہیں گے کہ ابوہریرہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ (السنۃ قبل التدوین ص ۴۲۶ بحوالہ طبقات ابن سعد، فتح الباری اور حلیۃ الاولیاء)

اور سمرۃ بن جندب[1] کو چن لیا تھا کہ وہ حدیثیں گھڑ کے امام علیؑ کی کردار کشی کریں اور ان احادیث کو رسول اکرمؐ سے منسوب کریں اور اُس کا فاسق بیٹا یزید اتنا دین دار بن گیا کہ اُس نے کہا: اِنَّ الْحُسَیْنَ قُتِلَ بِسَیْفِ جَدِّہٖ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے ہیں۔

ظالم حکومتیں مال اور دولت لوٹ لیتی ہیں، بے گناہوں کو قید کرتی ہیں اور اُن کی زندگیوں سے کھیلتی ہیں۔ ظلم و جبر اور روحانی کرب کی اس فضا میں وہ چند ملاؤں کا انتخاب کرلیتی ہیں جو ان کے جرائم کی توثیق کرتے ہیں۔

امام اہل سنت حسن بصری[2] نے کہا: "بنی امیہ کے بادشاہ خواہ کتنے ہی ظالم

۱۔ اہل سنت سمرۃ بن جندب کو بھی عادل صحابی شمار کرتے ہیں۔ صحاح کے مؤلفین نے بھی سمرۃ سے حدیث لی ہے۔ سمرۃ کا قصہ بیان کرتے ہوئے ابن ابی الحدید کے استاد جعفر اسکافی کہتے ہیں: "معاویہ نے سمرۃ کو ایک لاکھ درہم بھیجے تاکہ وہ رسول اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کرے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (بقرہ:۲۰۴) کی آیت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ بقول رسول خداؐ دین خدا کے دشمن ہیں اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۤءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ:۲۰۷) کی آیت عبدالرحمٰن ابن ملجم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سمرۃ نے اتنی رقم قبول نہ کی تو معاویہ نے اسے بڑھا کر دو لاکھ درہم بھیج دیے۔ سمرۃ نے یہ رقم بھی قبول نہ کی اور معاویہ نے اسے چار لاکھ درہم تک بڑھا دیا۔ سمرۃ نے یہ رقم لیکر مذکورہ بالا جھوٹی حدیث بیان کردی۔" (شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۳۵۸، قدیم ایڈیشن)

اس جعلی حدیث نے اسلامی معاشرے پر نہایت منفی اثر مرتب کیا یہاں تک کہ اس بنا پر خوارج کو "شراۃ" کا نام دیا گیا یعنی وہ لوگ جنھوں نے اپنی جانیں خدا کو بیچ دیں کیونکہ اس جعلی حدیث میں ابن ملجم کو اس آیت کا مصداق قرار دیا گیا تھا۔ یہ سمرۃ کی جعلی حدیث کا پہلا منفی اثر تھا۔

۲۔ حسن بصری کی کنیت ابوسعید تھی۔ اُن کے والد زید بن ثابت انصاریؓ کے آزاد کردہ تھے۔ وہ خلافت عمرؓ کے آٹھویں سال میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بصرہ میں زندگی گزاری اور ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ بڑے فصیح اللسان تھے۔ عوام اور عمائدین سلطنت کی نظر میں قابل احترام تھے اور بصرہ میں سنیوں کے امام تھے۔ طبقات ابن سعد کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری جبر و قدر کے قائل تھے۔ وہ حجاج بن یوسف ثقفی جیسے خبیث اور سفاک شخص کے خلاف بھی خروج کو جائز نہیں جانتے تھے۔

کیوں نہ ہوں اُن کی اطاعت واجب ہے۔۔۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُن کی اچھائیاں اُن کی برائیوں سے زیادہ ہیں۔"

فقیہ شہر کی باتوں سے نالاں
خدا و محمدؐ و محراب و منبر

سلاطین بنو عباس کو بھی کئی بے ضمیر ملاؤں کی خدمات حاصل تھیں۔

ملاؤں کی روش کے برعکس شیعہ اماموں ، دانشوروں اور شاعروں نے جابر حکومتوں کے خلاف آواز بلند کی اور قیام کیا۔انھوں نے ظالموں سے تعاون نہیں کیا کیونکہ شیعہ عقیدے کے مطابق باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور ضرورت پڑنے پر اللہ کی راہ میں متاع جان لٹا دینا عین سعادت ہے۔[۱]

بلاشبہ جابر حکومتیں شیعوں کے اس عقیدے کو بھولی نہیں ہیں۔ وہ شیعوں کو قتل کرتی ہیں ، اُن پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتی ہیں اور انھیں جلاوطن کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ دین فروش علماء کا ایمان خرید لیتی ہیں اور بہ بانگ دہل کہتی ہیں کہ اُن مومنین کو جو خدا و رسولؐ اور ائمہ طاہرینؑ پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں قتل کر دیا جائے۔ اور صاحبان جبہ و دستار جو اُن کے ہاتھ اپنا ایمان فروخت کر چکے ہوتے ہیں اس قتل ناحق کی توثیق کرتے ہیں اور اسے قانونی اور شرعی حیلوں کے ذریعے جواز مہیا کرتے ہیں۔

۱۔ امام حسینؑ کے یہ جملے شیعوں میں گرمیٔ عمل پیدا کرنے کے لئے ہر دور میں مشعل راہ ہیں:

اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لَا یُعْمَلُ بِهٖ وَاَنَّ الْبَاطِلَ لَا یُتَنَاهٰی عَنْهُ لِیَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِیْ لِقَاءِ اللّٰهِ مُحِقًّا. اِنِّیْ لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَالْحَیَاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا

اے لوگو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور باطل سے روکا نہیں جا رہا ہے۔ درحقیقت یہی بات ایک بندۂ مومن کو خدا سے ملنے پر آمادہ کرتی ہے۔ میری نظر میں موت ہی سعادت کا راستا ہے اور ظالموں کے ساتھ جینا تو ذلت کے سوا کچھ نہیں۔

شیعوں پر قلمی ظلم

جبہ و دستار پہنے کچھ لوگ اپنا ایمان شیطان کے ہاتھوں بیچ کر کافر کافر شیعہ کافر کا نعرہ لگواتے ہیں اور شیعوں کے قتل کا فتویٰ دیتے ہیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ جس طرح آج کل زرد صحافت کرنے والے بہت سے صحافی قلم کی حرمت کو بیچ کر انصاف کا قتل کرتے ہیں اور سرمایہ داروں اور استعمار پسندوں کے مفاد کی باتیں لکھتے ہیں اسی طرح ماضی میں بھی اہل قلم جابر حکمرانوں کو خوش کرتے رہے ہیں۔

یہ طرز عمل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نئی بات یہ ہے ہم دربار سے وابستہ مؤرخین کی باتوں پر تحقیق کئے بغیر بھروسا کر لیں اور اُن کی کتابوں کو آسمانی صحیفہ سمجھنے لگیں۔ چنانچہ ہمیں کتب تاریخ کا بے لاگ جائزہ لینا چاہیے اور انھیں من گھڑت مواد سے پاک کرنا چاہیے بالخصوص اُن کتابوں کو جن میں مختلف فرقوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے کیونکہ ماضی کے مصنفین بھی اشرفیوں کی تھیلیاں لیتے تھے اور حکومت جو چاہتی تھی وہی راگ الاپا کرتے تھے جیسا کہ آج کل کے زمانے میں جو میڈیا کا زمانہ کہلاتا ہے ایک جھوٹ اتنی مرتبہ بولا جاتا ہے کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگتے ہیں۔

جب ایک مصنف کسی اسلامی فرقے کے بارے میں بحث کرنا چاہے تو اسے اسی فرقے کے معتبر ماخذ سے رجوع کرنا چاہیے اور اسی فرقے کی نمائندہ کتابوں سے اسے سمجھنا چاہیے۔

شیعہ احمد امین کی نظر میں

جیسا کہ ہم نے بیان کیا مرجئہ ، عموم اہل سنت اور ائمہ اہل سنت مثلاً امام مالک امام شافعی ، امام احمد ، امام حسن بصری ، ظالم حکام کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ان حکومتوں کے مظالم کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنا چاہیے اور

اُن کے خلاف جدوجہد نہیں کرنی چاہیے تاہم اہل تشیع جابر حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اس بارے میں اہل تشیع کا اعتقاد اہل سنت کے اعتقاد سے بالکل مختلف ہے۔ بہت سے اہل سنت کے نزدیک جابر حکمرانوں سے لڑنا دین اسلام کے خلاف لڑنا ہے جبکہ اہل تشیع کے نزدیک دین کے بنیادی احکام میں سے ایک یہ ہے کہ فساد اور ظلم کے جن کو بوتل میں بند کردینا چاہیے۔ اس اصول کی روشنی میں ہم احمد امین مصری اور دوسرے اہل سنت کے اس قول کو سمجھ سکتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ''شیعہ وہ ہوسکتا ہے جو اسلام کو تباہ کرنا چاہتا ہو۔'' یہ احمد امین اور اُس کے ہم خیال پرکھوں کی رائے ہے کیونکہ ان کے خیال میں اسلام ایک حکمران کی ذات میں منحصر ہے خواہ وہ عادل ہو خواہ ظالم ہو اور جو شخص ایسے حکمران سے جنگ کرتا ہے وہ اسلام کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔

تاہم اہل تشیع کے مطابق جابر حکمران اسلامی قوانین کی دھجیاں اڑاتا ہے اور اسلامی تعلیمات کو پیروں تلے روندتا ہے۔ پس جو شخص ایسے جابر حکمران کے خلاف لڑتا ہے وہ دین کی حمایت کرتا ہے اور قرآن و سنت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ لہٰذا اگر احمد امین کہتا ہے کہ شیعہ ''تباہ کرنے والے'' ہیں تو ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ وہ واقعی فساد، ظلم اور جہالت کی بنیادیں گرانے والے ہیں۔ یہاں ہم (عیسائی دانشور اور ندائے عدالت انسانی کے مصنف) جارج جرداق کی کتاب علی والقومیة العربیه سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ مع الثائرین کے ذیل میں جارج جرداق لبنانی لکھتا ہے:

''شیعیان علیؑ بنو امیہ اور بنو عباس کی استبدادی حکومتوں کے خلاف لڑنے والوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے اُن استبدادی حکومتوں سے اس لئے ٹکر لی تاکہ ظلم و استبداد کی جڑ کاٹ دی جائے۔''

''کارگہ حیات میں شیعوں کی جدوجہد کا مقصد مظلوموں کے حقوق کا دفاع کرنا تھا۔ شیعوں کی تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے سرفروش ملتے ہیں جنھوں نے ظلم کے خلاف لڑکر عزت پائی اور علیؑ کی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا۔''

''شیعہ دین کی جو تفسیر کرتے ہیں وہ باغیوں کے مفادات کو تقویت نہیں پہنچاتی بلکہ عوام کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستم رسیدہ عربوں، غلاموں مسلمانوں اور ذمیوں (یعنی یہودی اور عیسائی اقلیتوں) نے اُن رہنماؤں کی حمایت کی جو علیؑ کی اولاد ہیں۔''

''مختلف ادوار میں نشیب و فراز سے گزرنے کے باوجود شیعوں کے انقلابی مکتب فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور زمانے کی نیرنگیوں سے اُس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ مکتب آج بھی مظلوموں اور محروموں کی آرزوؤں اور علیؑ کی خواہشوں سے مطابقت رکھتا ہے۔''

''اگر ہم اموی اور عباسی دور کی اُن انقلابی تحریکوں کا جائزہ لیں جو حجاز، عراق، شام، ایران اور افریقی علاقوں میں جبر و تشدد کے خلاف چلائی گئیں تو ہمیں علیؑ ہی مظلوموں کے قائد نظر آتے ہیں۔ اگر ہم اُن انقلابیوں کے مقصد کا مطالعہ کریں جنھوں نے صدیوں تک مشرق کو ہلائے رکھا تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن سب کا مقصد اجتماعی عدل کا قیام تھا جس کی خاطر علیؑ لڑے تھے، جس کی جانب علیؑ نے دعوت دی تھی اور جس کی راہ میں علیؑ شہید ہوگئے تھے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ سے دوستی کی راہ میں بہت سی قربانیاں دی گئیں۔ تمام مسلمان، عیسائی، غلام، مغربی (شمالی افریقہ کے باشندے) اور وہ سب لوگ جنھیں ستایا گیا اور جن کے حقوق سلب کئے گئے اُن کی قیادت کا پرچم علیؑ کے ہاتھ میں ہے اور علیؑ کی تعلیمات اُن کے لئے مشعل راہ تھیں۔''

''علیؑ کا نام مظلوموں اور انصاف طلبوں کی زبانوں پر ہے اور وہی اُن کی

جائے پناہ ہیں۔ جو کوئی کسی جابر کے خلاف اٹھتا ہے وہ اپنے آپ کو علیؑ کی پناہ میں سمجھتا ہے کیونکہ یہ وہ بزرگوار ہیں جو رشوت، فتنہ وفساد اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ لہٰذا اُن کا انقلاب علیؑ کا مرہون منت ہے۔ علیؑ کا نام اُن اصلاحات کے ساتھ وابستہ ہے جن کے لئے لوگ بے چین ہیں اور اُن اچھے کاموں کے ساتھ بھی علیؑ ہی کا نام وابستہ ہے جن کے وہ لوگ مشتاق ہیں جو ظلم کے اندھیروں میں جی رہے ہیں۔"

"لہٰذا شیعہ عقیدہ معاشرے کے مظلوم اور محروم طبقے کی پناہ گاہ ہے اور پامال شدہ حقوق کا دفاع کرنے والوں کا علمبردار ہے۔ ان کلمات کی روشنی میں احمد امین کی غلط بیانی واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ عقیدہ اسلام کی تباہی اور عربوں میں نااتفاقی کا سبب ہے۔" (یہاں جارج جرداق کا بیان تمام ہوا)۔

اس بنا پر بلاشبہ اسلام کی بنیاد اُن لوگوں نے ڈھائی جنھوں نے حق کو راہ سے بے راہ کر دیا اور اُسے اُس کے محور (خاندان رسالتؐ) سے ہٹا کر زنازادگان اور آزادشدگان کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اسلام کی بنیاد ان لوگوں نے ڈھائی جو ام المومنین کو اونٹ پر سوار کرا کے شہروں اور صحراؤں میں پھرتے رہے۔ اسلام کی بنیاد انھوں نے ڈھائی جنھوں نے پہلے تو لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل پر اکسایا اور پھر قصاص کے بہانے رسول اکرمؐ کے "وصی" کے خلاف بصرہ اور صفین میں لڑے اسلام اور عربوں میں انھوں نے تفرقہ ڈالا جنھوں نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دیا اور امام حسین علیہ السلام کو قتل کیا۔

یہ معاویہ، یزید، طلحہ، زبیر اور اُن کے ساتھی تھے جنھوں نے اسلام اور عرب بھائی چارے کی بنیاد ڈھائی۔ اس بات کا شیعوں سے کوئی تعلق نہیں۔

امام علیؑ اور قریش

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ اور اُن کے خاندان کو کافی دولت عطا فرمائی تھی جو مال فے اور مال غنیمت سے حاصل ہوتی تھی:

۱) مال فے کسی کوشش یا جنگ کے بغیر حاصل ہوتا تھا۔

۲) مال غنیمت کا خمس جس کے بارے میں ارشاد باری ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ جان لو کہ جو مال غنیمت تمہارے ہاتھ لگے اُس کا پانچواں حصہ خدا کا اور اُس کے رسول کا اور رسول کے قرابتداروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا حق ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۴۱)

البتہ جنگی غنائم میں سے رسول اکرمؐ کا جو حصہ ہوتا مثلاً تلواریں، گھوڑے اور کپڑے وغیرہ وہ آپ لوگوں میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ علیہا السلام، آپ کے نواسے امام حسن اور امام حسین علیہم السلام آپ کے ابن عم اور داماد حضرت علی علیہ السلام مسلسل کئی دنوں تک فاقہ سے ہوتے تھے۔ اُن کا گھر گارے مٹی سے بنا ہوا تھا جس کی چھت پوآل کی تھی۔

حضرت فاطمہؑ خود چکی پیستی تھیں جس سے اُن کے ہاتھ چھل جاتے تھے اور پانی کی مشکیں ڈھوتی تھیں جس سے اُن کی گردن پر نشان پڑ گئے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت فاطمہؑ اپنے پدر بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اُن

سے ایک کنیز کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو، واجب نمازیں پڑھو، امور خانہ داری کا خیال رکھو اور جب سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھو۔ یہ تمہارے لئے کنیز حاصل کرنے سے بہتر ہے۔''

ایک دفعہ حضرت فاطمہؑ بیمار ہوئیں تو رسول اکرمؐ اُن کی عیادت کے لئے تشریف لائے۔ آپ نے حال احوال پوچھا تو حضرت فاطمہؑ نے عرض کی کہ بابا جان میری بیماری کھانے کے بغیر زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ یہ سن کر رسول اکرمؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے فرمایا:

''بیٹی! کیا تم سیدۃ النساء العالمین بننا نہیں چاہتیں؟'' (ایسی تھی رہبر مسلمین اور رسول اکرمؐ کے جانشین حضرت علیؑ کی نجی زندگی)۔

امام علیؑ رسول اکرمؐ کے دور میں

حیات رسولؐ میں امام علیؑ نے گوناگوں مشکلات کے باوجود غزوات میں قریش کے سورماؤں کا غرور مٹی میں ملا دیا۔ آپ نے ہمیشہ شمع رسالتؐ کی پروانہ وار حفاظت کی اور ہر آڑے وقت میں رسول اکرمؐ کے شانہ بشانہ کھڑے رہے جبکہ دوسرے یا تو میدان جنگ سے بھاگتے رہے یا پھر زندگی کے مختلف مراحل میں پیٹ بھر کر کھاتے رہے، میٹھا پانی پیتے رہے، اچھا لباس پہنتے رہے اور زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

بعثت کے بعد رسول اکرمؐ تیرہ سال تک مکہ میں کفار قریش کے مظالم سہتے رہے۔ اس تمام عرصے میں امام علیؑ بھی بڑے حوصلے سے تمام سختیاں برداشت کرتے رہے۔ بنی ہاشم تین سال تک شعب ابی طالبؑ میں محصور رہے۔ قریش نے اُن کے ساتھ تمام تعلقات توڑ لئے تھے اور انھیں اشیائے خورد و نوش بھی نہیں پہنچنے

تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سختی اور بے سروسامانی کے دن تھے لیکن کسی نے اُن پر ترس نہیں کھایا۔ ان پورے تین سالوں میں امام علیؑ، برادران علیؑ اور علیؑ کے پدر بزرگوار حضرت ابوطالبؑ سائے کی طرح رسول اکرمؐ کے ساتھ رہے۔ جب رسول اکرمؐ اُس گھاٹی سے باہر تشریف لائے تو ہزاروں مشکلیں آپ کی منتظر تھیں۔ آپ کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ آپ کو جادوگر اور دیوانہ کہا جاتا تھا۔ اُم جمیل جو ابولہب کی بیوی اور معاویہ کی پھوپھی تھی آپ کے راستے میں کانٹے بچھا دیتی تھی۔ ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے کہ بدبخت عقبہ بن ابی معیط نے حالت سجدہ میں اپنا پاؤں آپ کی گردن مبارک پر رکھ دیا اور اتنے زور سے دبایا کہ رسول اکرمؐ سمجھے کہ اُن کی آنکھیں باہر نکل آئیں گی۔ ایک دفعہ اُس نے حالت سجدہ میں آنحضرتؐ کے سر پر بھیڑ کی اوجھڑی ڈال دی۔ ایک اور موقع پر جب رسول اکرمؐ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اُس نابکار نے اپنا عمامہ آنحضرتؐ کی گردن میں لپیٹ دیا اور آپ کو گھسیٹتا ہوا خانہ کعبہ سے باہر لے گیا۔[1]

امام علیؑ کی جاں فروشی

جب بھی مشرکین مکہ رسول اکرمؐ کو گلی کوچے میں دیکھتے تو بچوں کو اکساتے کہ وہ آپ کو پتھر ماریں تاہم امام علیؑ جو آنحضرتؐ کے ہمراہ ہوتے تھے بچوں کو بھگا دیتے تھے۔ قریش اور مشرکین کی سختیوں کے زمانے میں حضرت ابو طالبؑ نے کمال ثابت قدمی سے رسول اکرمؐ کا ساتھ دیا اور اپنی آخری سانس تک رسول اکرمؐ کی حمایت اور حفاظت کی۔ آپ کو بجا طور پر ''ناصر رسولؐ'' اور ''محسن رسولؐ'' کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو طالبؑ کی وفات کے بعد قریش نے آنحضرتؐ کو سوتے میں قتل

۱۔ عقبہ بن ابی معیط کا تعلق بنی امیہ سے تھا۔ وہ غزوۂ بدر میں گرفتار ہوا تھا اور حکم رسولؐ سے قتل کر دیا گیا تھا۔ جنگ بدر میں ایک اور قیدی نضر بن حارث کو بھی قتل کر دیا گیا تھا جو مسلمانوں کو ایذائیں دیتا تھا اور قرآن مجید سے کفر آمیز کلمات منسوب کرتا تھا۔

کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے سے آگاہ ہونے پر امام علیؑ نے رسول اللہؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ! "اگر میں آپ کے بستر میں سو جاؤں تو کیا آپ کی جان بچ جائے گی؟" رسول اللہؐ نے فرمایا: "ہاں!" یہ سن کر امام علیؑ نے کہا: "اگر آپ محفوظ رہیں تو مجھے موت کی کوئی پروا نہیں۔" چنانچہ وہ سبز چادر اوڑھ کر بڑے اطمینان سے شب ہجرت رسول اکرمؐ کے بستر میں سو گئے۔

مسلمانوں اور رسول اکرمؐ کو مشرکین کے ہاتھوں جو ایذائیں پہنچیں اُس کا واضح نمونہ وہ بہیمانہ سلوک ہے جو انھوں نے حضرت بلال، حضرت خباب، حضرت عمار یاسر، اُن کے والد حضرت یاسر اور والدہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ روا رکھا۔ مشرکین حضرت بلالؓ کو بچوں اور احمقوں کے حوالے کر دیتے تھے جو انھیں ایک رسی سے باندھ کر زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔ وہ لوگ حضرت بلالؓ سے کہتے تھے کہ ہم تمھیں اس وقت چھوڑیں گے جب تم لات اور عزیٰ کہو گے لیکن اللہ کے دیوانے حضرت بلالؓ کی زبان سے "احد، احد" ہی نکلتا تھا۔ وہ لوگ جناب یاسرؓ اور جناب سمیہؓ کے سینے پر بھاری پتھر رکھ کر اُن پر نیزوں سے حملہ کرتے تھے اور کہتے تھے: "تم اللہ کی عبادت اور محمد (ص) کی اطاعت چھوڑ دو۔" انھوں نے اتنی تکلیفیں اٹھائیں کہ بالآخر ابوجہل کے نیزے سے لگائے گئے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جناب سمیہؓ شہید ہوگئیں۔ وہ اسلام کی پہلی شہید خاتون ہیں۔ حضرت خبابؓ بن ارت کو زرہ پہنا کر جلتی دھوپ میں بٹھا دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے انھیں شدید اذیت ہوتی تھی۔

اگر حضرت ابوطالبؑ سختیاں برداشت نہ کرتے تو اسلام اپنے ابتدائی دنوں میں ہی ختم ہو جاتا اور اُس کے نورِ تاباں سے دنیا میں اجالا نہ ہوتا۔ وہ اُس وقت فوت ہوئے جب رسول اکرمؐ کے قدم پوری طرح جمے بھی نہیں تھے۔

مشرکین کا خیال تھا کہ حضرت ابو طالبؑ کے بعد وہ آنحضرتؐ کو ختم کر دیں

گے چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاہم امام علیؑ اپنے پدر بزرگوار کی طرح ساری زندگی رسول اکرمؐ کی حفاظت کرتے رہے۔

امام علیؑ رحلت رسولؐ کے بعد

جنگوں میں امام علیؑ کی سرفروشی اور لوگوں کے دلوں میں آپ کے خلاف بغض وحسد کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق رسول اکرمؐ کے زمانے سے ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد امام علیؑ سے مشاورت کے بغیر نیز بنی ہاشم اور امام علیؑ کے حامی اصحاب کی شرکت کے بغیر سقیفہ بنو ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی گئی۔[1] چونکہ رسول اکرمؐ کا غسل وکفن باقی سب چیزوں پر مقدم تھا اس لئے امام علیؑ اس اہم کام میں مشغول تھے۔ ابھی وہ آنحضرتؐ کے وصال کے صدمے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ ایک اور افتاد آ پڑی۔[2]

۱۔ صاحب المواقف اور شارح المواقف کے مطابق بیعت کے لئے اجماع ضروری نہیں۔ اگر ایک یا دو آدمی بھی بیعت کر لیں تو کافی ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی اور ابن عوف نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی۔ اس معاملے میں تمام مسلمانوں کا اجماع ضروری نہیں بلکہ اہل مدینہ کا اجماع بھی ضروری نہیں۔ اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ ایک یا دو آدمیوں کی بیعت کو کافی سمجھا گیا ہے۔ اس قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ایک ووٹ امت کے تمام ووٹوں پر بھاری ہے اور لوگوں پر لازم ہے کہ ایسی بیعت کو تسلیم کر لیں۔ لہٰذا معاویہ نے یزید کے لئے جو بیعت لی تھی وہ صحیح تھی اور یہی صورت موروثی حکومتوں کی ہے۔ اگر کسی غیر مسلم کو اس قول کا پتا چل جائے تو وہ یہی کہے گا کہ "اسلام کی آزادی اور جمہوریت کو کیا ہوگیا ہے؟" (مؤلف)

۲۔ رسول اکرمؐ کا جسد مبارک ابھی دفن بھی نہیں ہوا تھا کہ بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ ان تین دنوں میں آنحضرتؐ دفن نہیں ہوئے کیونکہ اگر امام علیؑ آنحضرتؐ کو سپرد خاک کر دیتے تو وہ لوگ جنھوں نے آنحضرتؐ کی نماز نہیں پڑھی تھی اُن کی قبر کھود ڈالتے اور اگر امام علیؑ سقیفہ کی کارروائی میں حصہ لیتے تو رسول اکرمؐ کا غسل وکفن نہ ہو پاتا۔ یوں ایک طرف خلافت کے راستے میں تبدیلی اور دوسری طرف رسول اکرمؐ کے جسد مبارک کا دفن نہ ہونا امام علیؑ کے لئے انتہائی پریشانی کا باعث بن گیا۔ (شیخ عباس قمی، بیت الاحزان ص ۳۰)

جی ہاں! خلافت (حکومت) غصب کر لی گئی۔ دو المناک واقعات بڑی تیزی سے اور بیک وقت آپ کے دل پر اثر انداز ہوئے تاہم آپ نے اسلام کی سربلندی کی خاطر حضرت ابوبکرؓ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ آپ نے یہ روش اس کے باوجود اختیار کی کہ کچھ اکابر صحابہ نے کھلم کھلا اور درپردہ آپ سے ملاقات کر کے کہا کہ آپ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے اٹھیں۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ آپ کی خاطر اپنی جانیں لڑا دیں گے لیکن امام علیؑ نے اُن کا مشورہ نہیں مانا اور کہا: ''خون خرابے سے بچنے اور مفاد عامہ کی خاطر صبر کرو۔'' جب مقتدر لوگوں نے دیکھ لیا کہ آپ اپنے حق کے دفاع کے لئے تلوار نہیں کھینچیں گے تو انھوں نے آپ کو مجبور کیا کہ لڑیں یا بیعت کریں۔

امام علیؑ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ صبر کریں اور اپنا حق نظر انداز کر دیں لہٰذا انھوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا اور خلافت پر اپنے حق کے بارے میں اُن سے کوئی بات نہیں کی لیکن انھوں نے امام علیؑ کو ان کے حال پر نہیں چھوڑا۔ انھوں نے باغ فدک ضبط کر لیا جو رسول اکرمؐ نے بی بی فاطمہؑ کو ہبہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں امام علیؑ نے جو دلائل پیش کیے وہ قبول نہیں کیے گئے۔ انھوں نے حضرت فاطمہ زہراؑ یعنی اُن عالی مرتبت بنت رسولؐ کا دعویٰ خارج کر دیا جن کی عصمت کی گواہی قرآن نے آیت تطہیر میں دی ہے اور جنھیں رسول اکرمؐ بحکم الٰہی نصاریٰ نجران سے مباہلہ کرنے لے گئے تھے۔ قرآن میں حضرت فاطمہؑ کی مباہلہ میں شرکت یوں بیان ہوئی ہے: (اے رسول!) کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے نفسوں کو اور تم اپنے نفسوں کو لاؤ۔ پھر ہم دونوں فریق خدا سے دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۶۱)

امام علیؑ کے ساتھ مقتدر حلقوں کا سلوک اتنا مخاصمانہ تھا کہ انھوں نے اُن کے

گھر پر حملہ کر دیا۔ وہ اُس بیت الشرف کو آگ لگانے آئے تھے جس میں علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور دیگر بنی ہاشم موجود تھے۔[1] امام علیؑ نے اُن کے اس جرم سے بھی چشم پوشی کی تاکہ وہ اس سے زیادہ سنگین جرم نہ کریں۔

بعد میں اُن لوگوں نے آ کر امام علیؑ سے معذرت کر لی۔

انھوں نے اُس علیؑ کے ساتھ مجرمانہ سلوک کیا تھا جن کے بارے میں حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا:

عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْہُ. علیؑ مجھ سے ہیں اور میں اُن سے ہوں۔

اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ عَلِیٍّ عِبَادَۃٌ. علیؑ کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔

مَنْ اٰذَاہُ فَقَدْ اٰذَانِیْ جس نے علیؑ کو دُکھ دیا اُس نے مجھے دُکھ دیا۔

کیا اپنے فضائل، علم و دانش، ایمان اور اسلام قبول کرنے میں سبقت کے علاوہ امام علیؑ کا کوئی اور قصور بھی تھا؟ کیا اُن لوگوں کے جرائم کے مقابلے میں صبر کرنے کے سوا امام علیؑ کے پاس کوئی اور راستا بھی تھا؟

امام علیؑ اور حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت سنبھالی۔ وہ مختلف معاملات میں امام علیؑ سے مشورہ کرتے تھے اور اُن کی نصیحت پر عمل کرتے تھے۔ امام علیؑ کے علاوہ کسی اور کو اس بات کا علم نہیں تھا۔

حضرت عمرؓ امام علیؑ کی فضیلت کے قائل تھے اور اکثر کہا کرتے تھے:

لَوْ لَا عَلِیٌّ لَہَلَکَ عُمَرُ. اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

اگر علیؑ مسند خلافت پر ہوتے تو تمھیں سیدھے راستے پر لے کر چلتے۔

امام علیؑ کی اتنی تعریف سن کر لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنے بعد امام علیؑ کو خلیفہ

۱۔ کنز العمال از علی متقی ہندی، شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید معتزلی، السیاسۃ والامامۃ از ابن قتیبہ دینوری۔

بنا کر جائیں گے اور یوں حق حقدار کو مل جائے گا لیکن جب حضرت عمرؓ کی موت کا وقت قریب آیا تو وہ امام علیؑ کے تمام سابقہ کارنامے بھول گئے۔ انھوں نے اُن لوگوں کو امام علیؑ ہم پلہ قرار دیا جن کا ماضی قابل رشک نہیں تھا

حضرت عمرؓ نے پانچ[1] آدمیوں کو امام علیؑ کا ہم پلہ قرار دیا اور کہا:

''اگر علیؑ اور عثمانؓ آپس میں متفق ہو جائیں تو اُن کی رائے صائب ہوگی اور اگر ان چھ آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تو جس گروہ میں عبدالرحمٰن بن عوف ہوں اُس گروہ کی رائے صائب ہوگی۔''

حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ اس لئے دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علیؑ اور عثمانؓ کبھی متفق نہیں ہوں گے اور چونکہ عبدالرحمٰن عثمانؓ کے بہنوئی تھے اس لئے اُن کا ووٹ عثمانؓ کو ہی ملے گا۔ پھر حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو حکم دیا کہ اگر یہ تین افراد میری خواہش کے مطابق عمل نہ کریں تو تم ان چھ کے چھ افراد کو قتل کر دینا۔

تاریخ طبری (ج ۴، ص ۲۲۷، مطبوعہ دار المعارف مصر) میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اراکین شوریٰ کو منتخب کیا تو اثنائے گفتگو میں اُن کو اُن کے اوصاف بھی بتائے۔ انھوں نے طلحہ سے کہا:

تم وہ آدمی ہو جس نے کہا تھا کہ ہم رسول اللہؐ کے بعد اُن کی بیواؤں سے نکاح کرلیں گے۔ محمدؐ ہماری چچا زادیوں کے لئے ہم سے زیادہ سزاوار نہیں ہیں۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی تھی: تمہارے لئے درست نہیں کہ رسول خداؐ کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ اُن کی بیویوں سے کبھی اُن کے بعد نکاح کرو۔ بیشک یہ خدا کے نزدیک کبیرہ گناہ ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۵۳)

انھوں نے زبیر سے کہا:

خدا کی قسم تمہارا دل ایک دن اور ایک رات نرم اور مہربان نہیں رہتا۔ ایک

ا۔ وہ پانچ آدمی یہ تھے: طلحہ، زبیر، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص۔

دن تمہارا دل سخت اور رذیل ہو جاتا ہے اور دوسرے دن پرہیزگار اور مطیع ہو جاتا ہے اور پھر اگلے دن تم بے ایمان اور بدمزاج ہو جاتے ہو۔ الغرض تم ایک دن شیطان ہوتے ہو تو دوسرے دن مہربان ہوتے ہو۔

انھوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا:

حیوانوں کا گوبر تم سے بہتر ہے۔ اگر تم خلیفہ بن گئے تو تم ابی معیط کے خاندان کو عوام پر مسلط کر دو گے اور اگر تم نے ایسا کیا تو تم قتل ہو جاؤ گے۔

انھوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا:

تم ایک کمزور آدمی ہو۔ تم اپنے لوگوں سے محبت کرو گے تاکہ انھیں کام پر لگا دو

انھوں نے سعد بن ابی وقاص سے کہا:

تعصب، سازش اور کشت و خون تمہاری گھٹی میں ہے۔ اگر ایک مشک کا تسمہ تمہارے حوالے کر دیا جائے تو تم اُس کا خیال بھی نہیں رکھ سکتے۔

پھر حضرت عمرؓ نے امام علیؑ سے کہا کہ اگر آپ کے ایمان کا مقابلہ تمام اہل عالم کے ایمان سے کیا جائے تو آپ کے ایمان کا پلڑا سب سے بھاری ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ میں کئی تناقضات دیکھے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جب رسول اکرمؐ دنیا سے گئے تو آپ ان چھ افراد سے خوش تھے اس کے باوجود انھوں نے ایک کے سوا سب ارکان شوریٰ کی خامیاں بیان کیں۔ یہ بات رسول اکرمؐ کی خوشنودی اور اُن افراد کی خلافت کے لئے اہلیت سے مطابقت نہیں رکھتی پھر بھی انھوں نے اُن افراد کو خلافت کے لئے نامزد کیا اور اُن کا قتل کیا جانا جائز سمجھا۔ یہ بات عجیب ہے کہ اگر یہ افراد خلافت کے لئے موزوں تھے اور رسول اکرمؐ بھی اپنے آخری وقت میں اُن سے خوش تھے تو حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کی اجازت کیونکر دی؟ اور اگر اُن کو قتل کرنا جائز تھا تو انھیں خلافت کے لئے کیوں نامزد کیا؟

تین آدمیوں کے اُس گروہ کو جس میں ایک عبدالرحمٰن بن عوف تھے اُس گروہ پر جس میں امام علیؑ شامل تھے کیوں ترجیح دی گئی اور اس سلسلے میں ضروری اختیار عبدالرحمٰن بن عوف کو شروع میں ہی کیوں نہ دے دیا گیا؟ حضرت عمرؓ نے یہ اصول کیوں نظر انداز کر دیا کہ مسلمانوں کے معاملات عوامی رائے مشورے سے طے ہونے چاہئیں؟ انھوں نے مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے ایک فرد کو کیوں نہ چن لیا جو اُن کے بقول خلافت کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کے تسلی بخش جوابات کی ضرورت ہے۔

ابن عبدربہ نے **العقد الفرید** (ج ۵، ص ۳۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت) میں مُعاویہ اور ابن حُصَین کی یہ گفتگو نقل کی ہے:

معاویہ: مسلمانوں میں اختلاف اور انحراف کی کیا وجہ تھی؟

ابن حصین: عثمانؓ کا قتل۔

معاویہ: تم نے کوئی نئی بات نہیں کی۔

ابن حصین: علیؑ کی تمہارے خلاف معرکہ آرائی۔

معاویہ: یہ درست نہیں۔

ابن حصین: علیؑ کی طلحہ، زبیر اور عائشہ کے خلاف معرکہ آرائی۔

معاویہ: یہ کوئی نئی بات نہیں۔

ابن حصین: جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔

معاویہ: مسلمانوں میں اختلاف کی وجہ عمرؓ کی تشکیل کردہ مجلس شوریٰ تھی۔ یہ مجلس چھ ارکان پر مشتمل تھی اور اُن میں سے ہر ایک خلافت کا امیدوار تھا۔ اُن کے رشتے دار بھی خواہشمند تھے کہ خلافت اُن کے آدمی کو ملے تاکہ وہ اونچے عہدے پائیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ اگر حضرت عمرؓ نے

ایک آدمی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا ہوتا جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا تو اختلافات پیدا نہ ہوتے۔ بلاشبہ معاویہ نے اور اس جیسے دوسروں نے جو اعلیٰ عہدوں پر براجمان رہے حضرت عثمانؓ کے حق کا باطل ہونا تسلیم کر لیا۔

امام علیؑ اور حضرت عثمانؓ کا دورِ خلافت

بہرحال حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی گئی (اور غیر قانونی مجلس شوریٰ کا نتیجہ سامنے آگیا) امام علیؑ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جس طرح انھوں نے خلافت اول و ثانی پر صبر کیا تھا اس دفعہ بھی صبر سے کام لیں۔

ابھی اس واقعے کو بہت دن نہیں گزرے تھے کہ کچھ لوگ جن میں چند ایک وہ بھی تھے جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی بیعت کی تھی امام علیؑ کے پاس آئے اور اُن سے گزارش کی وہ خلیفہ ثالث کو اُن کے منصب سے ہٹا دیں۔ انھوں نے امام علیؑ کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ رکھے اور کہا: "ہم آخری سانس تک آپ کی حمایت کے لئے تیار ہیں۔" امام علیؑ نے اُن کی بات نہیں مانی اور حضرت عثمانؓ کو اور مسلمانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا تاکہ اُن کی کارکردگی کے نتیجے میں مسلمان اُن کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔

مسلمانوں کی بے چینی اور شورش کی وجہ یہ تھی کہ حکمران رسول اکرمؐ کے طور طریقوں میں تبدیلیاں لا رہے تھے۔ ایک ایسے شخص کو جسے رسول اکرمؐ نے مدینہ بدر کر دیا تھا حضرت عثمانؓ نے واپس مدینہ بلا لیا تھا۔[۱]

۱۔ حکم بن عاص کو رسول اکرمؐ نے مدینہ سے نکال دیا تھا اور طائف میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ابن عبدالبر کی الاستیعاب میں ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی نقلیں اتارا کرتا تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے خود اسے یہ حرکتیں کرتے دیکھ لیا۔ اُس کا بیٹا مروان اس وقت سات آٹھ برس کا تھا اور وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ طائف میں رہا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے اپنے زمانۂ خلافت میں حکم بن ابی العاص کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی تھی مگر حضرت عثمانؓ نے نہ صرف یہ کہ حکم کو اپنی خلافت میں مدینہ واپس بلا لیا تھا بلکہ مروان کو اپنا چیف سکریٹری بنا لیا تھا۔ (خلافت و ملوکیت، مولانا مودودی صفحہ ۱۱۰)

حضرت عثمانؓ اپنے رشتے داروں کو بیت المال سے نوازتے تھے۔ انھوں نے بیت المال کی کثیر رقوم اپنے نام منتقل کرالی تھیں۔ انھوں نے جلیل القدر صحابی حضرت ابوذرؓ کو شہر بدر کیا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو جن کا تعلق اخیار صحابہ سے تھا عصا سے پٹیا۔ انھوں نے احکام الٰہی معطل کر دیے اور ایک مسلمان ہرمزان کے قاتل عبید اللہ بن عمر کو سزا نہ دی۔ حضرت عثمانؓ کے ایسے ہی کاموں کی بنا پر عوام نے اُن کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔[1]

قتل عثمانؓ کے بعد لوگ امام علیؑ کے گرد جمع ہوگئے۔ نہج البلاغہ میں ہے کہ

۱۔ جو لوگ تاریخ اسلام کے ابتدائی مآخذ سے واقف ہیں وہ علی بن حسین مسعودی شافعی (۸۸۶ھ) سے بخوبی واقف ہیں۔ مسعودی ایک معتبر اور قابل اعتماد اسلامی مؤرخ اور جغرافیہ داں ہے جس پر تمام مکاتب فکر اعتماد کرتے ہیں۔ اُس نے ۳۰ جلدوں پر مشتمل تاریخ کی دلچسپ، نفیس اور معتبر کتاب مُرُوجُ الذھب لکھی ہے۔ اُس میں ہے کہ جب حضرت عثمانؓ قتل ہوئے اور انھوں نے دنیا سے رحلت کی تو ڈیڑھ لاکھ دینار طلائی اور دس لاکھ درہم نقد چھوڑے۔ نیز وادی القریٰ اور حنین وغیرہ میں اُن کی جائیداد کی قیمت ایک لاکھ دینار طلائی تھی۔ اُن کے گھوڑوں اور اونٹوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ (ج ۲، ص ۳۴۱)

رسول اکرمؐ کو آزار دینے والے موذی عقبہ بن ابی معیط کے لڑکے "ولید" نے بیت المال کے خازن عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم خزانے سے یہ کہہ کر نکلوائی کہ میں یہ رقم واپس کردوں گا لیکن اُس نے وہ رقم واپس نہیں کی تو ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کو ایک خط میں سارا احوال لکھا۔ جواب میں حضرت عثمانؓ نے انھیں لکھا: تم ہمارے خزانچی ہو۔ ہم بیت المال سے جتنا چاہیں لیں تمھیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جب ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کا یہ خط پڑھا تو مسجد کوفہ میں برسرعام کہا: اے لوگو! میں سمجھتا تھا کہ میں تمہارے بیت المال کا خازن ہوں لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں تمہاری بجائے بنی امیہ کا خازن ہوں۔ پھر انھوں نے بیت المال کی چابیاں پھینک دیں اور کہا کہ میں بنی امیہ کا خازن بن کر نہیں رہنا چاہتا۔ چنانچہ ولید نے انھیں مدینے بھیج دیا۔ جب وہ مدینے پہنچے تو حضرت عثمانؓ نے اپنے غلام یحموم کو حکم دیا کہ ابن مسعودؓ کو تنبیہ کی جائے۔ حضرت عثمانؓ کے حکم سے یحموم نے ابن مسعودؓ کو اس زور سے زمین پر پٹخا کہ وہ اپاہج ہوگئے اور دو سال تک صاحب فراش رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان دو سالوں میں حضرت عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کا سرکاری وظیفہ بند رکھا۔ (انساب الاشراف ج ۵، ص ۳۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۲، ص ۱۴۷۔ مستدرک حاکم ج ۳، ص ۱۳)

وہ مجھے لوگوں کے ہجوم نے دہشت زدہ کر دیا جو میری جانب بجو کے ایال کی طرح ہر طرف سے لگاتار بڑھ رہا تھا یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جا رہے تھے اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے۔"

لوگ نعرہ لگا رہے تھے کہ خلافت کے اہل صرف علیؑ ہیں۔ امام علیؑ نے اُن سے کہا: "مجھے چھوڑ دو۔ کسی اور کو خلیفہ بنالو۔" انھوں نے کہا: ہم کسی اور کو قبول نہیں کریں گے۔ قصہ کوتاہ انھوں نے امام علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور یوں انھیں نئی مشکل میں ڈال دیا۔

حضرت عثمانؓ نے ورثے میں نئی حکومت کے لئے بہت سی مشکلات چھوڑیں۔ انھوں نے نالائق عمال مقرر کر رکھے تھے جو ناجائز چیزوں کو جائز قرار دیتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے افسران مال لوگوں کا خون چوستے تھے اور مملکت کے ہر گوشے میں لوگوں کے مال پر ناجائز تصرف کرتے تھے۔ افسران مال کا طرزِ عمل[1] اور اُن کی اپنے عزیزوں اور دوستوں پر نوازشیں اس بات کا سبب بنیں کہ باغیوں کے دل میں بھی حکومت کی جوت جگائے۔ اس سوچ کے برعکس بعض حاسد اور بداندیش لوگ انتقام لینے کے لئے بے چین تھے۔ ان حالات میں امام علیؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

امام علیؑ ظالم اور ناپاک لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ آپ نااہل لوگوں سے رشوت لے کر انھیں اعلیٰ عہدے نہیں دے سکتے تھے۔ جب انھوں نے انتظامیہ کی تطہیر شروع کی تو کچھ خود غرض لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ انھیں اُن کے عہدوں پر برقرار رکھیں یا اُن کی مدت ملازمت میں توسیع کر دیں لیکن جب انھوں نے

۱۔ یعلیٰ بن امیہ (جس کو یعلیٰ بن منیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کی ماں کا نام منیہ تھا) جو عثمانی دور خلافت میں افسر مال تھا جب مرا تو اُس نے پانچ لاکھ دینار طلائی چھوڑے۔ اس کے علاوہ لوگوں پر اُس کا کثیر قرضہ بھی تھا۔ اُس کی جائیداد اور دوسرے ترکے کی قیمت تین لاکھ دینار تھی۔

دیکھا کہ امام علیؑ حقائق کی روشنی میں اقدام کر رہے ہیں تو انھوں نے آپ کی حکومت سے علیحدگی اختیار کرلی اور بی بی عائشہؓ سے جا ملے یہاں تک کہ جنگ جمل برپا ہوئی۔ کچھ خوشامدی جو حق و انصاف کے مخالف تھے بی بی عائشہؓ کے گرد جمع ہوگئے۔ انھوں نے طلحہ[1]، زبیر[2] اور بنی امیہ کے ساتھ مل کر امام علیؑ کے خلاف بغاوت کر دی۔

جب حضرت عثمانؓ اپنے گھر میں محصور تھے تو امام علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے اُن کا دفاع کیا جبکہ بی بی عائشہؓ اور طلحہ نے لوگوں کو اُن کے قتل پر اکسایا اور جب وہ مارے گئے تو انہی لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کر دیا۔

امام علیؑ اور جنگ جمل وصفین

اصحاب جمل کے بارے میں امام علیؑ کو دو مشکلات کا سامنا تھا۔

۱) اگر آپ خاموش رہتے اور باغیوں کو کھلی چھوٹ دے دیتے تو غلط مثال قائم

۱۔ مسعودی لکھتا ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ تمیمی نے کوفہ میں ایک شاندار محل بنوایا تھا۔ طلحہ کی آمدنی صرف عراق کی جائیداد سے ایک ہزار دینار طلائی تھی۔ شراۃ کے علاقے کی آمدنی اس سے بھی زیادہ تھی۔ طلحہ نے مدینہ میں اپنا مکان پختہ اینٹوں، چونے اور بیش قیمت لکڑیوں سے بنایا تھا۔
سعد بن ابی وقاص نے بھی ایک بڑا شاندار محل بنوایا تھا۔

۲۔ مسعودی لکھتا ہے کہ زبیر بن العوام نے بصرہ میں ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ کوفہ، اسکندریہ اور بصرہ میں بھی اُس کی جائیداد تھی۔ زبیر کا ترکہ پچاس ہزار دینار طلائی، ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار غلام اور کنیزیں اور مختلف شہروں میں کثیر غیر منقولہ جائیداد پر مشتمل تھا۔
عبدالرحمن بن عوف زہری نے ایک حویلی بنوائی تھی۔ اُن کے اصطبل میں سو گھوڑے تھے، اُن کے پاس ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں تھیں۔ انتقال کے وقت اُن کی چار بیویاں تھیں اور ہر بیوی کو ورثے میں چوراسی ہزار دینار طلائی ملے تھے۔
زید بن ثابت نے ورثے میں اس قدر سونا چھوڑا تھا کہ تقسیم کرنے کے لئے ہتھوڑوں سے توڑنا پڑا۔ اُن کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی۔

ہو جاتی اور ہٹ دھرم لوگ قوم کا جینا دو بھر کر دیتے۔

۲) اگر آپ اُن کے خلاف لڑتے تو خون خرابہ ہوتا۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لئے امام علیؑ نے پند و نصیحت کا راستا اپنایا۔ آپ نے اُم المومنین سے کہا کہ وہ گھر لوٹ جائیں اور بیعت شکنوں کو بھی اپنی بیعت پر قائم رہنے کی نصیحت کی لیکن آپ کی نصیحت کا کوئی مثبت اثر نہیں ہوا چنانچہ آپ مجبور ہوگئے کہ باغیوں کو کچل دیں اور فتنے کو ختم کر دیں۔ بالآخر جنگ ہوئی اور باغیوں کو شکست ہوئی تاہم امام علیؑ کی مشکلات اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ختم نہیں ہوگئیں۔ معاویہ ابن ہند خدا اور اُس کے رسولؐ، امام علیؑ اور مسلمانوں کا دشمن تھا۔ معاویہ کو رسول اکرمؐ نے اُس کے باپ ابوسفیان کے ساتھ فتح مکہ کے دن آزاد کیا تھا۔ معاویہ نے حضرت عثمانؓ کی کوئی مدد نہیں کی تھی مگر جب اُسے پتا چلا کہ امام علیؑ نے اُسے امیر شام کے عہدے سے معزول کر دیا ہے تو اُس نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کے بہانے جنگ چھیڑ دی۔ جنگ صفین میں اپنی شکست دیکھ کر عمرو بن عاص کے مشورے پر کچھ نادان لوگوں سے کہا کہ وہ نیزوں پر قرآن بلند کریں اور کہیں ھٰذَا حَکَمٌ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ یعنی یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم ہے۔

اس چال نے امام علیؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال دی۔ انھوں نے امام علیؑ سے کہا کہ وہ معاویہ کی پیشکش قبول کرلیں۔ آپ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو منطقی انجام تک پہنچنے دو۔ انھیں قرآن یا شریعت رسولؐ سے کوئی سروکار نہیں مگر آپ کے لشکر نے آپ کی بات نہیں مانی۔ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ''اگر علیؑ قرآن کو حکم نہیں مانیں گے تو ہم اُن کو عثمانؓ کی طرح قتل کر دیں گے یا معاویہ کے حوالے کر دیں گے تاکہ وہ اُس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔''

امام علیؑ نے محسوس کیا کہ اگر انھوں نے جنگ جاری رکھی تو وہ خود اور اُن کے

فرزند قتل کر دیئے جائیں گے اور رسول اکرمؐ کی عترت ختم ہو جائے گی لہٰذا انھوں نے تحکیم کا معاہدہ کرلیا۔ یہ پوری کارروائی دومۃ الجندل میں ہوئی تھی۔ یہاں امام علیؑ نے طے کیا کہ عمرو بن عاص کی چال کا سدباب کرنے کے لئے اپنے نمائندے کے طور پر مالک اشترؓ یا ابن عباسؓ کا انتخاب کریں تو ایک مرتبہ پھر آپ کے لشکر میں پھوٹ پڑگئی۔ انھوں نے کہا کہ ''تمھیں ابوموسیٰ اشعری کو اپنا نمائندہ نامزد کرنا ہوگا۔'' اُن کے دباؤ سے مجبور ہوکر آپ کو اُن کی بات ماننی پڑی اور نتیجے کے طور پر ثالثی کا فیصلہ معاویہ کے حق میں ہوگیا۔ جب امام علیؑ کی حکم عدولی کے نتیجے میں اُن کے لشکر کو شکست ہوئی اور فیصلہ اُن کے خلاف ہوا تو انھوں نے امام علیؑ سے کہا: ''تمھیں ہماری غلطی میں ہمارے ساتھ موافقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' چنانچہ انھوں نے امام علیؑ کے خلاف بغاوت کر دی اور یوں خوارج کے گروہ نے جنم لیا۔

خوارج کیا کہتے تھے؟

خوارج بڑی عجیب باتیں کرتے تھے۔ امام علیؑ نے انھیں صحیح مشورہ دیا تھا اور آپ ابوموسیٰ اشعری کو اپنا نمائندہ بنانے پر تیار نہیں تھے لیکن انھوں نے آپ کا کہا نہ مانا اور جب آپ نے ابوموسیٰ کو اپنا نمائندہ نامزد کر دیا اور فیصلہ آپ کے خلاف ہوا تو خوارج کہنے لگے: ''تمھیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم مسلمان نہیں رہے ورنہ ہم تمھیں قتل کر دیں گے۔'' یہ دھمکی اس لئے دی گئی کہ آپ نے اُن لوگوں کا مطالبہ مان لیا تھا اور ابوموسیٰ اشعری کو اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا۔

اب جبکہ امام علیؑ نے اُن کا مطالبہ مان لیا تھا وہ آپ کے خلاف لڑنا چاہتے تھے اور آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اگر آپ نے اُن کی بات نہ مانی ہوتی اور ابوموسیٰ اشعری کو اپنا نمائندہ نامزد نہ کیا ہوتا تب بھی وہ آپ کے خلاف جنگ کرتے۔ کیا یہ شرم کی بات نہ ہوتی کہ ایک طویل مدت تک اسلام کی سربلندی کے لئے لڑنے کے

بعد امام علیؑ یہ اعلان کر دیتے کہ میں کافر ہوگیا ہوں؟ حالانکہ امام علیؑ دین کا محور، مجسم ایمان اور حق و صداقت کا کامل نمونہ ہیں۔ بقول غالبؔ

مظہر فیض خدا ، جان و دل ختم رسلؐ
قبلۂ آل نبیؐ ، کعبۂ ایجاد یقیں

امام علیؑ کا حق غصب کرلیا گیا لیکن آپ نے صبر کیا۔ اُن لوگوں نے آپ کو جنگ اور بیعت کے بارے میں پس و پیش میں مبتلا کر دیا لیکن آپ نے اُن سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ مجلس شوریٰ میں آپ کو نااہل لوگوں کے برابر گردانا گیا لیکن آپ نے اس چیز کو نظر انداز کر دیا اور جب آپ نے خوارج کے رویے پر صبر کیا تو وہ آپ کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔

میرا خیال ہے کہ اللہ کے کسی نبی یا ولی نے اپنی زندگی میں اتنی تکلیفیں نہیں اٹھائیں جتنی امام علیؑ نے اٹھائیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہروان کا واقعہ کربلا کے واقعے سے زیادہ المناک ہے کیونکہ کربلا میں امام حسینؑ دشمنوں سے برسرپیکار تھے جبکہ امام علیؑ کو اُن کے خلاف لڑنا پڑا جو کل تک آپ کی فوج میں تھے یہ وہ لوگ تھے جن کے ماتھوں پر کثرت سجود سے گٹے پڑگئے تھے۔ جو دن کو روزہ رکھتے تھے، رات کو تہجد پڑھتے تھے اور تلاوت قرآن میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے باوجود وہ امام علیؑ کا خون بہانا جائز سمجھتے تھے اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کے خلاف لڑ رہے تھے۔[1]

۱۔ اگر امام علی علیہ السلام خوارج کی سرکوبی نہ کرتے تو تمام عبادت گزار اور دین دار مسلمان آہستہ آہستہ خارجیت قبول کرلیتے اور اگر لوگ خارجی ہوجاتے تو آج نہ شیعہ اسلام ہوتا اور نہ سنی اسلام یہی وجہ تھی کہ حضرت نے جنگ نہروان کے بعد اپنے ایک خطبے میں جو نہج البلاغہ میں موجود ہے خدا کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا تھا: یَا اَیُّھَا النَّاسُ فَاِنِّیْ فَقَأْتُ عَیْنَ الْفِتْنَةِ وَلَمْ یَکُنْ لِیَجْتَرِئَ عَلَیْھَا اَحَدٌ غَیْرِیْ. ''اے لوگو! میں نے فتنہ و شر کی آنکھ پھوڑ دی ہے۔ میرے سوا کسی میں اس کام کو کرنے کی جرأت نہ تھی۔''

بلاشبہ جو مشکلات امام علیؑ کو برداشت کرنی پڑیں ان کی وجہ یہ تھی کہ قریش کے دلوں میں اپنے ہی ایک فرزند کی قدر نہ تھی۔ انھوں نے اُس کے حقوق پامال کرنے کے لئے گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور زبانِ عمل سے اُسے بتا دیا تھا کہ یا تو صبر کے گھونٹ پیتے رہو یا پھر صدمے کی شدت سے مر جاؤ۔ امام علیؑ صبر کے جام پر جام پیتے رہے اور اُن کا دل کٹ کے رہ گیا تھا جبکہ آپ کو نہ پائے ماندن، نہ جائے رفتن والی صورتحال درپیش تھی۔

بے روح اور بے معرفت لمبی لمبی نمازیں پڑھنے والے نام نہاد مقدس اور ظاہر بین عابدوں کی سرکوبی اتنا بڑا کام تھا کہ امام علیؑ اور صرف امام علیؑ ہی یہ کام کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ بھی یہ کام نہ کر سکتے۔

امام علیؑ نے اپنے ان اقدامات کے ذریعے مٹتے ہوئے اسلام کو بچا لیا اور رہتی دنیا تک لوگوں کو بتا دیا کہ قریش اور خوارج کے اسلام کے علاوہ ایک حقیقی اسلام بھی موجود ہے۔ (احیائے دین میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار ج ۲ از علامہ سید مرتضیٰ عسکری)۔

بنی امیہ

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْ اَرَیْنَاکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ فِی الْقُرْآنِ میں جس "شجرِ ملعونہ" کا ذکر آیا ہے اُس سے بنی امیہ مراد ہیں۔ ایک دن جب معاویہ، یزید[1] کے اونٹ کی مہار پکڑے اُسے کھینچ رہا تھا اور یزید اونٹ کے پیچھے چل رہا تھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: لَعَنَ اللّٰہُ الْقَائِدَ وَالْمَقُوْدَ "خدا کی لعنت ہو مہار پکڑنے والے اور پیچھے آنے والے پر۔"[2]

عبداللہ ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "ایک آدمی آ رہا ہے جو مسلمان کی موت نہیں مرے گا" اور ہم نے دیکھا کہ معاویہ آیا ہے۔

حضرت عمار یاسرؓ کے قتل کے بعد معاویہ باغی جماعت کا سربراہ بن گیا کیونکہ

۱۔ یزید معاویہ کا بڑا بھائی تھا۔ اُس نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا تھا اور وہ جنگ حنین میں شریک ہوا تھا۔ مکہ کے جن کافروں نے اسلام قبول کیا تھا اُن کی تالیف قلوب کے لئے رسول اکرمؐ نے انھیں کچھ نہ کچھ عطا کیا تھا۔ اُسی حساب میں یزید کو بھی چالیس اونٹ اور چالیس اونس چاندی دی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے یزید کو سپہ سالار بنا کر شام بھیجا اور پیدل اُس کی مشایعت کی۔ حضرت عمرؓ نے پہلے اُسے فلسطین کا اور پھر شام کا حاکم بنایا تھا۔ اُس کے مرنے پر حضرت عمرؓ نے معاویہ کو شام کا حاکم بنا دیا اور وہ مرتے دم تک اُس علاقے پر حکومت کرتا رہا۔ (اُسد الغابہ ج ۵، ص ۱۱۲)

۲۔ ایک دن ابوسفیان اونٹ پر سوار تھا۔ اُس کے بیٹے یزید اور معاویہ اُس کے ساتھ تھے۔ انھیں دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا: لَعَنَ اللّٰہُ الْقَائِدَ وَالسَّائِقَ وَالرَّاکِبَ یعنی اللہ کی لعنت ہو آگے والے پر، پیچھے والے پر اور سوار پر۔ (نصر بن مزاحم، کتاب الصفین ص ۲۰)

رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ عمارؓ کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔[1]

معاویہ ابوسفیان کا اور اُس "ہند" کا بیٹا تھا جس نے جنگ احد میں حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا۔ ابوسفیان مشرکین مکہ کی اُس فوج کا سپہ سالار تھا جس نے رسول اکرمؐ کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔

مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ معاویہ شراب پیتا تھا اور "اسلام" کے نام پر حکومت کرتا تھا۔ (علامہ شیخ حسن مظفر، دلائل الصدق، ج ۳، ص ۲۱۳)

معاویہ نے رسم جاہلیت کو زندہ کر کے زیاد بن سمیہ کو اپنا بھائی قرار دیا اور اُس کا اپنے خاندان سے استلحاق کیا (حالانکہ نبی اکرمؐ کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اُس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کو سنگسار کیا جائے)۔

معاویہ لوگوں کو زہر آلود شہد[2] کے ذریعے قتل کرتا تھا اور کہا کرتا تھا: اِنَّ لِلّٰہِ جُنُوْدًا مِنْ عَسَلٍ. اللہ کے کچھ لشکر ہیں اور اُن ہی میں شہد ہے۔

معاویہ نے تخریب کار دستوں کو مسلح کر رکھا تھا جن کا کام لوٹ مار کرنا، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا اور گھروں کو آگ لگانا تھا۔

معاویہ لوگوں کو دھوکا دینے اور جھوٹ بولنے میں بے مثال تھا۔

معاویہ کو اُن لوگوں سے چڑ تھی جو اپنا حق اور انصاف مانگتے تھے۔

۱۔ صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۹ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی میں ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت حضرت عمارؓ کے سر سے دھول صاف کرتے ہوئے رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: وَیْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِیَةُ عَمَّارٌ یَدْعُوْهُمْ اِلَی اللّٰهِ وَیَدْعُوْنَهٗ اِلَی النَّارِ افسوس! عمارؓ کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ عمارؓ انھیں اللہ کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ ان کو جہنم کی طرف بلا رہے ہوں گے۔

۲۔ یزید کو خلیفہ بنانے کے لئے معاویہ نے خالد بن ولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کو بھی زہر دلوا کر مروا دیا تھا کیونکہ اُس کا باپ ایک مشہور سردار تھا اور وہ خود بھی سرداری کا دعویدار تھا۔ اسی طرح معاویہ نے اپنے ہی خاندان یعنی بنی اُمیہ کے چند افراد کو جو خلافت حاصل کرنے کے خواہاں تھے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ (استاد مرتضٰی مطہری، مقتل مطہر، ص ۱۰۶)

معاویہ نے حکم دے رکھا تھا کہ صالح مومنین پر لعنت بھیجی جائے۔

معاویہ نے خلافت کو جس کی بنیاد جمہوریت اور شوریٰ پر ہونی چاہیے تھی ملوکیت میں بدل دیا تھا۔ معاویہ کا ماضی قابل رشک نہیں تھا اور اُس میں ایسی کوئی خوبی نہیں تھی کہ وہ خلافت کا اہل بن سکتا۔ اُس کے بارے میں صرف یہ حدیث ملتی ہے لَا اَشْبَعَ اللّٰهُ بَطْنَهٗ یعنی اللہ اُس کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔[1]

معاویہ نے قصاص عثمانؓ کے بہانے اُن کی خون آلود قمیص اور اُن کی اہلیہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھا کر لوگوں کو امام علیؑ کے خلاف اشتعال دلایا تھا۔

بی بی عائشہؓ اور اُن کا اونٹ، قطام اور ابن ملجم، خارجیوں، شامیوں اور

۱۔ دمشق کے لوگوں نے امام نسائی سے فرمائش کی کہ معاویہ کے فضائل بیان کیجئے۔ وہ بولے کیا معاویہ خلفاء کے برابر ہو جانے پر بھی خوش نہیں کہ اپنے فضائل سننا چاہتا ہے؟ پھر انھوں نے کہا کہ میں نے معاویہ کے متعلق لَا اَشْبَعَ اللّٰهُ بَطْنَهٗ سے بہتر حدیث نہیں سنی یہ سن کر شامیوں نے امام نسائی کو اتنا زدوکوب کیا کہ وہ جاں بحق ہو گئے۔

ایک مرتبہ رسول اکرمؐ نے حضرت ابن عباسؓ کو بھیجا کہ وہ معاویہ کو بلا لائیں۔ ابن عباسؓ نے واپس آکر اطلاع دی کہ وہ کھانا کھا رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے دوبارہ اُسے بلوا بھیجا لیکن پھر بھی آپ کو یہی بتایا گیا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے۔ جب تیسری مرتبہ بھی آپ کو یہی بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: "اللہ اُس کا پیٹ کبھی نہ بھرے۔" (صحیح مسلم ج ۸، ص ۲۷۔ تاریخ ابن کثیر ج ۸، ص ۱۱۹۔ انساب الاشراف ص ۵۳۲)

نہج البلاغہ خطبہ ۵۷ میں بھی لَا اَشْبَعَ اللّٰهُ لَهٗ بَطْنًا کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ جناب امیرؑ نے فرمایا تھا: "میرے بعد جلد ہی تم پر ایک ایسا شخص مسلط ہوگا جس کا حلق کشادہ اور پیٹ بڑا ہوگا۔ جو پائے گا نگل جائے گا اور جو نہ پائے گا اس کی اسے ڈھونڈھ لگی رہے گی (بہتر تو یہ ہے کہ) تم اسے قتل کر ڈالنا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اسے ہرگز قتل نہ کرو گے۔ وہ تمھیں حکم دے گا کہ مجھے برا کہو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ جہاں تک برا کہنے کا تعلق ہے، مجھے برا کہہ لینا اس لئے کہ یہ میرے لئے پاکیزگی کا سبب اور تمہارے لئے (دشمنوں سے) نجات پانے کا باعث ہے۔ لیکن (دل سے) بیزاری اختیار نہ کرنا اس لئے کہ میں (دین) فطرت پر پیدا ہوا ہوں اور ایمان و ہجرت میں سابق ہوں۔"

عراقیوں کی سادہ لوحی ، دنیا پرستوں کی دنیا داری اور امام علیؑ کی ایمان میں ثابت قدمی کی وجہ سے معاویہ مسلمانوں کا حکمران بن گیااور داهية العرب یعنی عرب کا مدبر سیاستدان کہلایا۔

معاویہ نے جن واقعات سے فائدہ اٹھایا اُن میں سب سے اہم حضرت عثمانؓ کی خون آلود قمیص کی نمائش تھی۔

مشہور جرمن مستشرق ویل ہاسن (Wellhaussen) اپنی کتاب **تاریخ الدولة العربیه** مطبوعہ ۱۹۵۸ء میں لکھتا ہے:

''خون عثمانؓ کے قصاص کی بنیاد پر معاویہ نے خلافت پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا۔ خون عثمانؓ کے قصاص کا دعویٰ کیونکر معاویہ کی کامیابی کا سبب بنا اور اُس نے یہ دعویٰ کیوں کیا یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ البتہ یہ امر ناقابل تردید ہے کہ اپنی مراد پانے کے لئے اُس نے عمرو بن عاص سے گٹھ جوڑ کرلیا جو عثمانؓ کا جانی دشمن تھا۔ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ معاویہ کی بغاوت کی وجہ پرہیزگاری یا عثمانؓ اور اُن کے لواحقین سے ہمدردی نہیں تھی۔''

امام علیؑ نے حضرت عثمانؓ کا دفاع کیا جبکہ طلحہ، زبیر، عمرو بن عاص، معاویہ اور بی بی عائشہؓ نے لوگوں کو انھیں قتل کرنے پر آمادہ کیا۔

جب حضرت عثمانؓ قتل ہوگئے تو اُن کے قصاص کے بہانے امام علیؑ کے خلاف جنگ چھیڑ دی گئی۔ جنگ جمل میں طلحہ اور زبیر مارے گئے، بی بی عائشہؓ کے اونٹ کے پاؤں کاٹ دیے گئے اور انھیں احترام کی ساتھ واپس مدینہ بھیج دیا گیا۔

جنگ صفین میں قرآن مجید نیزوں پر بلند کرنے کی وجہ سے معاویہ اور عمرو بن عاص بچ گئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اُن کا بھی وہی حشر ہوتا جو اصحاب جمل کا ہوا تھا۔ معاویہ صفین سے واپس چلا گیا لیکن اُس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ علیؑ اور شیعیان علیؑ کی زندگی اجیرن کر دے گا۔

شبخون، قتل عام اور لوٹ مار

شام کے سوا تمام بلاد اسلامی میں امام علیؑ کی De Jure حکومت قائم تھی یعنی عراق حجاز، یمن، مصر، ایران وغیرہ مرکزی اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور امام کی سربراہی کو تسلیم کرتے تھے مگر معاویہ نے جسے امام نے شام کی امارت سے معزول کر دیا تھا دمشق میں Defacto حکومت قائم کرلی۔

معاویہ نے ریاست میں ریاست یعنی state within state قائم کرنے کے بعد نُعمان بن بشیر، یزید بن شجرہ، مُسلم بن عُقبہ، ضحاک بن قیس فہری عبدالرحمان بن قباث، زُهیر بن مکحول، سُفیان بن عوف غامدی اور بُسر بن ابی اَرطاۃ کو نفری اور اسلحہ دیکر حکم دیا کہ جن علاقوں میں حکومت علیؑ کی رٹ قائم ہے وہاں تباہی مچا دو اور افراتفری پھیلا دو۔

ذیل میں ہم معاویہ کے چند کارندوں کی کارستانیاں لکھ رہے ہیں۔

۱۔ **سفیان بن عوف غامدی:** معاویہ نے سفیان غامدی سے کہا کہ ایک لشکر لے کر فرات کی جانب جا اور ہیت، انبار اور مدائن کا چکر کاٹ کر واپس شام واپس آجا۔ راستے میں جس لشکر سے تیری مڈبھیڑ ہو اُس سے جنگ کر لیکن کوفہ میں داخل مت ہونا کیونکہ اگر تیری فوج انبار اور مدائن میں داخل ہوجائے گی تو کوفہ خود بخود تیرے قبضے میں آجائے گا۔ تیری اس کارروائی سے اُن لوگوں کے دل بیٹھ جائیں گے اور ہمارے دوستوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور بزدل لوگ ہم سے آملیں گے۔ اس مہم کے دوران علیؑ کا جو بھی حامی نظر آئے اُسے قتل کردو۔ اُن کے گاؤں اجاڑ دو اور سامان لوٹ لو کیونکہ سامان لٹ جانے سے زیادہ تکلیف پہنچتی ہے اور یہ قتل کرنے سے بھی زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۴۴، طبع قدیم)

سفیان غامدی نے اپنے ''امیر کی اطاعت کی'' اور لشکر لے کر انبار پر چڑھ

دوڑا۔ اُس نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور جتنا مال لوٹ سکتا تھا لوٹ کر واپس شام آگیا۔ جب اُس نے معاویہ کو رپورٹ کی تو اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا: ''اے امیر! بخدا! مجھے کسی جنگ سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس جنگ سے ہوئی ہے۔ خدا کی قسم! میں نے لوگوں کے دل دہلا دیئے تھے۔'' معاویہ نے کہا: ''مجھے تم سے یہی امید تھی۔''

امام علیؑ نے اہل کوفہ کو حکم دیا کہ وہ دشمن کے خلاف اپنے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوں لیکن انھوں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ اس پر آپ نے تن تنہا جنگ لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اہل کوفہ آپ کے پاس آئے اور بولے کہ آپ تنہا نہ جائیں، ہم جنگ لڑیں گے۔ امام علیؑ نے فرمایا: تم جنگ کے موقع پر سچے جوانمرد اور قابل اعتماد نہیں ہو۔ بہرحال اُن لوگوں نے اصرار کرکے آپ کو واپسی پر مجبور کردیا۔

جب آپ گھر پہنچے تو سخت غصے کے عالم میں تھے۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ اُس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''میں نے اُس قوم سے لڑائی کے لئے رات بھی اور دن بھی، علانیہ بھی اور پوشیدہ بھی، تمھیں پکارا اور للکارا اور تم سے کہا کہ قبل اس کے کہ وہ جنگ کے لئے بڑھیں تم ان پر دھاوا بول دو۔ خدا کی قسم! جن افراد قوم پر ان کے گھروں کی حدود کے اندر ہی حملہ ہوجاتا ہے وہ ذلیل وخوار ہوجاتی ہیں لیکن تم نے جہاد کو دوسروں پر ٹال دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے پہلو بچانے لگے۔ یہاں تک کہ تم پر غارت گریاں ہوئیں اور تمہارے شہروں پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا۔ اس (سفیان بن عوف) غامدی ہی کو دیکھ لو کہ اُس کی فوج کے سوار انبار کے اندر پہنچ گئے اور حسان ابن حسان بکری کو قتل کردیا اور تمہارے محافظ سواروں کو سرحدوں سے ہٹادیا اور مجھے تو یہ اطلاعات بھی ملی ہیں کہ اُس جماعت کا ایک آدمی مسلمان اور ذمی عورتوں کے گھروں میں گھس جاتا تھا اور ان کے پیروں کے کڑے (ہاتھوں کے کنگن) اور

گلوبند اور گوشوارے اتار لیتا تھا اور اُن کے پاس اس سے حفاظت کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا سوا اس کے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہوئے صبر سے کام لیں یا خوشامدیں کرکے اُس سے رحم کی التجا کریں۔ وہ لدے پھندے ہوئے پلٹ گئے، نہ کسی کے زخم آیا نہ کسی کا خون بہا۔ اب اگر کوئی مسلمان ان سانحات کے بعد غم سے مرجائے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی بلکہ میرے نزدیک ایسا ہی ہونا چاہیے۔ العجب ثم العجب! خدا کی قسم! ان لوگوں کا باطل پر ایکا کرلینا اور تمہاری جمعیت کا حق سے منتشر ہوجانا دل کو مردہ کردیتا ہے اور رنج واندوہ بڑھا دیتا ہے۔ تمہارا برا ہو تم غم وحزن میں مبتلا رہو۔ تم تو تیروں کا ازخود نشانہ بنے ہوئے ہو، تمھیں ہلاک و تاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لئے نہیں اٹھتے۔ وہ تم سے لڑبھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔ اللہ کی نافرمانیاں ہو رہی ہیں اور تم راضی ہورہے ہو۔ اگر گرمیوں میں تمھیں اُن کی طرف بڑھنے کے لئے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ یہ انتہائی شدت کی گرمی کا زمانہ ہے، اتنی مہلت دیجئے کہ گرمی کا زور ٹوٹ جائے اور اگر سردیوں میں چلنے کے لئے کہتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ کڑاکے کا جاڑا پڑرہا ہے، اتنا ٹھہر جائیے کہ سردی کا موسم گزر جائے۔ یہ سب سردی اور گرمی سے بچنے کے لئے باتیں ہیں۔ جب تم سردی اور گرمی سے اس طرح بھاگتے ہو تو پھر خدا کی قسم! تم تلواروں کو دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔

اے مردوں کی شکل وصورت والے نامردو! تمہاری عقلیں بچوں کی سی اور تمہاری سمجھ حجلہ نشین عورتوں کی مانند ہے۔ میں تو یہی چاہتا تھا کہ نہ تم کو دیکھتا نہ تم سے جان پہچان ہوتی، ایسی شناسائی جو ندامت کا سبب اور رنج واندوہ کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تمھیں مارے، تم نے میرے دل کو پیپ سے بھر دیا ہے اور میرے سینے کو غیظ وغضب سے چھلکا دیا ہے۔ تم نے مجھے غم وحزن کے جرعے پے جرعے پلائے، نافرمانی کرکے میری تدبیر ورائے کو تباہ کردیا۔''

امام علیؑ کا واسطہ معاویہ جیسے چالاک دشمن سے تھا لیکن کوفی اپنی اندرونی چپقلشوں کے سبب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ دشمن اُن کی دہلیز پر آکر اُن سے لڑتا تھا لیکن وہ ذلت آمیز طریقے سے پناہ طلب کرتے تھے، بھاگ جاتے تھے اور پھر نہیں لوٹتے تھے۔

۲۔ ضحاک بن قیس فہری: جب امام علیؑ کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپ نے منبر سے اہل کوفہ کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر تمھیں دشمنوں کو اپنی سرزمین سے نکالنے میں دلچسپی ہے تو اٹھو اور اُن سے لڑو۔'' تاہم اُن کا مثبت ردعمل سامنے نہ آنے پر آپ نے حجر بن عدی کندی کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ضحاک کے تعاقب میں بھیجا۔ حجر کی فوج نے ضحاک کو تدمر کے علاقے میں جالیا اور وہاں طرفین میں لڑائی ہوئی۔ ضحاک کے انیس آدمی ہلاک ہوئے جبکہ حجر کے دو ساتھی شہید ہوئے۔ دریں اثنا رات پڑگئی اور اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ضحاک شام بھاگ گیا۔

معاویہ جن تخریب کاروں کو بھیجتا تھا وہ امام علیؑ کے حامیوں پر حملہ کرتے تھے، قتل و غارت مچاتے تھے اور لوٹ مار کرتے تھے لیکن جب امام علیؑ کی فوج سے آمنا سامنا ہوتا تو بھاگ جاتے تھے۔

۳۔ نعمان بن بشیر: نعمان بن بشیر اور اُس کا باپ بشیر بن سعد اُن انصار میں سے تھے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں پیش پیش تھے۔ باقی انصار نے اُن کے بعد بیعت کی تھی۔ نعمان حضرت عثمانؓ کا دوست اور معاویہ و یزید کا منظور نظر تھا۔ وہ مروان بن حکم کے دور تک زندہ رہا۔ جب مروان کے لئے بیعت لی گئی تو نعمان حمص کا عامل تھا۔ ۶۵ھ میں اُس نے اہل حمص کو تجویز دی کہ وہ عبداللہ بن زبیر کی بیعت کرلیں لیکن لوگوں نے اُس کے خلاف بغاوت کردی اور اُسے قتل کردیا۔

نعمان ہی تھا جو حضرت عثمانؓ کی قمیص اور اُن کی اہلیہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں معاویہ کے پاس دمشق لے گیا تھا۔ معاویہ نے اہل شام کے جذبات مشتعل کرنے کے لئے یہ چیزیں منظر عام پر لٹکا دی تھیں۔

کچھ عرصہ بعد نعمان معاویہ کو چھوڑ کر امام علیؑ کے پاس چلا آیا لیکن یہاں کا پاک ماحول اُسے راس نہ آیا۔ چنانچہ وہ ایک مرتبہ پھر شام لوٹ گیا۔ بلاشبہ گندگی کھانے والوں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی خوشبو سے دور بھاگتے ہیں اور طویلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

معاویہ نے نعمان کو دو ہزار آدمیوں کے ہمراہ عراق میں عین التمر کے علاقے میں بھیجا اور کہا کہ اُن کے خلاف کارروائی کرکے چوروں کی طرح جلدی سے کھسک جاؤ۔ نعمان نے عین التمر پر حملہ کردیا جہاں کے عامل مالک بن کعب کے پاس صرف دو سو سپاہی تھے۔ دو ہزار کا لشکر دیکھ کر انھوں نے اپنے سپاہیوں سے کہا:

''علاقہ چھوڑ کر مت جاؤ اور دیوار کی جانب پشت کرکے جنگ کرو۔ تمھیں جاننا چاہیے کہ اللہ دس آدمیوں کو سو آدمیوں پر فتح نصیب کرتا ہے اور سو آدمیوں کو ہزار آدمیوں پر غالب کردیتا ہے۔''

امام علیؑ کے کچھ شیعہ جو عین التمر کے نواح میں رہتے تھے مالک کی مدد کو پہنچے اور سب نے مل کر نعمان اور اُس کے آدمیوں کو شام کی جانب بھگا دیا۔

امام علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے نعمان بن بشیر کو کوفہ کا امیر مقرر کیا اور یزید نے بھی اُسے کچھ مدت تک برقرار رکھا لیکن بعدازاں اُس کی جگہ عبیداللہ ابن زیاد کو کوفہ کا امیر بنا دیا جو بڑا خرانٹ آدمی تھا۔ ابن زیاد اُس وقت کوفہ پہنچا تھا جب حضرت مسلمؑ اہل کوفہ سے بیعت لے رہے تھے۔[1]

۱۔ نعمان بن بشیر ابن زیاد سے کم خرانٹ تھا اسی لئے اُسے کوفہ کی امارت سے ہٹایا گیا تھا۔ یہی نعمان بن بشیر تیس آدمیوں کے ساتھ اہل بیتؑ کو زندان شام سے رہائی کے بعد مدینہ لے کر آیا تھا۔ وہ اہل بیتؑ کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آیا تھا۔

جنگ میں نامردوں کی ڈھال

جنگ صفین میں ایک دن امام علیؑ نے ایک بلندی سے معاویہ کو پکارا تو اُس نے بھی آپ کو جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کا خون کیوں بہے؟ آؤ! ہم تم جنگ کریں تاکہ پتا چل جائے کہ فتح کس کی ہوتی ہے؟

عمرو بن عاص نے معاویہ سے کہا: یہ ایک اچھی تجویز ہے۔ معاویہ ہنس کر بولا لگتا ہے تیرے دل میں خلافت کی آرزو مچل رہی ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں مارا جاؤں۔ عمرو نے کہا: تمہارے پاس علیؑ سے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ معاویہ نے کہا: ہمیں چاہیے کہ دونوں مل کر لڑنے جائیں۔ عمرو نے کہا: واللہ! اگر میں ہزار مرتبہ بھی مارا جاؤں تب بھی علیؑ سے جنگ کروں گا۔ عمرو امام علیؑ سے لڑنے کے لئے میدان میں آیا تاہم جب اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی موت سر پر آپہنچی ہے تو اُس نے اپنی شرمگاہ کھول دی۔ اس پر امام علیؑ نے منہ پھیرلیا اور عمرو موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گیا۔

معاویہ کی فوج میں ایک جنگجو ابو داؤد بھی تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر معاویہ علیؑ سے لڑنے سے گھبراتا ہے تو میں اُس سے لڑنے جاؤں گا۔ پھر وہ میدان میں آیا اور کہنے لگا: میں ابو داؤد ہوں۔ علیؑ آئے اور مجھ سے لڑے۔ امام علیؑ آگے بڑھے تو آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ آپ اس کتے کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ ایسے آدمی سے لڑنا آپ کی شان کے خلاف ہے لیکن امام نے اُن کی بات نہیں مانی اور ابو داؤد پر اس زور سے حملہ کیا کہ ایک ہی وار میں اُس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اُس کے جسم کا ایک حصہ دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف گرا۔ ضرب یداللّٰہی کو دیکھ کر دونوں فوجیں مبہوت رہ گئیں۔

ابو داؤد کا ایک عم زاد بھی معاویہ کی فوج میں تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ابو داؤد مارا گیا ہے تو کہنے لگا: وائے ہو مجھ پر! ابو داؤد کے بعد جینا بیکار ہے۔

پھر وہ امام علیؑ سے لڑنے کے لئے تیزی سے آگے بڑھا لیکن اُس کا حشر بھی ابو داؤد سے مختلف نہیں ہوا۔

معاویہ جو ایک بلندی پر بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہنے لگا: ''لعنت ہے میری فوج پر! کیا اس میں کوئی جوانمرد نہیں جو علیؑ کا مقابلہ کرسکے؟ کیا اس میں کوئی ایسا بھی نہیں جو حیلے سے اُس وقت علیؑ کا کام تمام کردے جب لشکر نے ہجوم کر رکھا ہو۔ کیا اس میں کوئی ایسا بھی نہیں جو علیؑ کو اُس وقت ختم کردے جب میدان میں شدید گرد اڑ رہی ہو؟''

ولید بولا کہ ''تم ہی چالبازی میں اول ہو لہٰذا تمھیں علیؑ سے لڑنا چاہیے۔''

معاویہ نے کہا کہ ''علیؑ نے مجھے للکارا تھا لیکن میں قریش سے شرمندہ ہوں کہ میں اُس کا چیلنج قبول نہ کرسکا۔'' پھر اُس نے بسر بن ارطات سے کہا: ''کیا تم علیؑ سے لڑنے کے لئے تیار ہو؟'' بسر نے کہا: ''اس لڑائی کے لئے تم سے زیادہ موزوں اور کوئی نہیں ہے لیکن چونکہ تم نے مجھے حکم دیا ہے اس لئے میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہوں۔''

بسر کا عم زاد اور اس کی بیٹی کا منگیتر جو حجاز سے آیا تھا بسر سے کہنے لگا: خبردار علیؑ سے نہ لڑنا۔ آخر تم نے اس کام کی حامی کیوں بھری؟

بسر نے کہا: ''میں نے معاویہ کو زبان دے دی ہے اور اب یہ وعدہ پورا کرنا ناگزیر ہے۔ وعدہ خلافی کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔'' اُس کا عم زاد ہنسا اور اُس نے چند اشعار کہے جن میں سے دو یہ تھے:

کَاَنَّکَ یَا بُسْرَ بْنَ اَرْطَاۃٍ جَاہِلٌ یَا ثَـارَۃٌ فِی الْحَرْبِ اَوْ مُتَجَاہِلٌ
مَتٰی تَلْقَہٗ فَالْمَوْتُ فِیْ رَأْسِ رُمْحِہٖ وَفِیْ سَیْفِہٖ شُغْلٌ لِنَفْسِکَ شَاغِلٌ

اے بسر! لگتا ہے کہ تو علیؑ کی طاقت سے واقف نہیں یا تو انجان بن رہا ہے۔ جب تو میدان میں جائے گا تو تجھے تیری موت اُن کی تلوار کی دھار اور نیزے کی

انی سے جڑی ملے گی۔

بسر نے کہا کیا موت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہے؟ پھر اُس نے اپنا آہنی خود پہنا اور میدان میں پہنچ گیا۔ اُس نے باآواز بلند کہا: ''ابو الحسن آئے اور مجھ سے لڑے۔'' امام علیؑ فوراً اُس سے مقابلے کے لئے پہنچے۔ آپ نے اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ اُس نے موت کو اپنے سامنے دیکھا تو عمرو بن عاص کی طرح خود کو برہنہ کرلیا۔ امام علیؑ نے اپنا منہ پھیر لیا اور واپس آگئے۔

مالک اشتر نے کہا کہ آپ نے اپنے اور خدا کے دشمن کو چھوڑ کیوں دیا؟

امام علیؑ نے فرمایا کہ اُسے چھوڑو۔ خدا اُس پر لعنت کرے۔ کیا میں اُس کا برہنہ ہونا برداشت کرلیتا؟

ایک شاعر نے عمرو بن عاص اور بسر بن ارطات کے بارے میں جو اشعار کہے ہیں وہ ابن ابی الحدید نے نقل کئے ہیں۔

اَبِیْ کُلَّ یَوْمٍ فَارِسٌ تَنْدِبُوْنَہٗ   لَہٗ عَوْرَۃٌ تَحْتَ الْعُجَاجَۃِ بَادِیَۃٌ

یَکُفُّ بِھَا عَنْھَا عَلِیٌّ سِنَانَہٗ   وَیَضْحَکُ مِنْھَا فِی الْخَلَاءِ مُعَاوِیَۃٌ

''کیا تم ہر روز ایک ایسے سوار کو لڑنے کے لئے بھیجتے ہو جس کی شرمگاہ میدان میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرمگاہ علیؑ کے نیزے سے اُس کا دفاع کرتی ہے اور معاویہ خلوت میں اس بات پر ہنستا ہے۔''[1]

۴۔ **بسر بن ابی ارطات:** ابن ابی الحدید رقمطراز ہیں کہ بسر نہایت سنگدل انسان تھا۔ اُس کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ معاویہ نے اُسے تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا اور کہا: ''علیؑ کے حامیوں کے گھر لوٹ لو۔ جب مدینہ میں داخل ہونا تو لوگوں کو بتا دینا کہ تم اُن کی جانوں سے کھیلنے آئے ہو اور علیؑ سے دوستی یا نفرت کا کوئی بہانہ مت سننا۔''

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۳۰۱۔

جب معاویہ اپنے تباہ کن دستے کہیں بھیجتا تو ایسی ہی ہدایات دیتا تھا۔ اُس نے سفیان غامدی سے کہا تھا کہ ''علیؑ کا جو حامی ملے اُسے قتل کردو۔ دیہات اجاڑ دو اور اسباب لوٹ لو۔'' ایسی ہی ہدایات اُس نے ضحاک اور دیگر کارندوں کو بھی دی تھیں۔

''اطاعت امیر'' میں معاویہ کے کارندے لوگوں کو قتل کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ بسر جب مدینے پہنچا تو اُس نے اہل مدینہ کو خوب ملامت کی اور اُن کے بہت سے گھر جلا دیئے۔ جن لوگوں کے گھر جلائے گئے اُن میں زرارہ بن حردان، عمرو بن عوف، رفاعہ بن رافع رزقی[1] اور میزبان رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاریؓ شامل تھے۔[2]

مسعودی کی مُرُوجُ الذّھب میں ہے کہ مدینہ میں اور دو مسجدوں کے درمیان بسر نے بہت سے بنی خزاعہ اور ساکنین صنعا کو قتل کر دیا۔ جب امام کو ان واقعات کا علم ہوا تو آپ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن مسعود کو دو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ بسر کے تعاقب میں بھیجا۔ جب بسر کو جاریہ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھاگ نکلا۔

معاویہ کے کارندے حملہ کر کے لوگوں کو قتل کر دیتے، لوٹ مار مچاتے اور پھر چوروں کی طرح بھاگ جاتے تھے لہٰذا امام علیؑ کو ذرائع نقل و حمل کے بارے میں خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑتی تھیں۔

مدینہ سے مکہ روانہ ہونے سے پہلے بسر نے ابو ہریرہ کو مدینہ کا عامل مقرر کیا۔ ابو ہریرہ نے مدینہ میں بسر کی بدعتیں اور غارت گریاں بچشم خود دیکھی تھیں (لیکن پھر بھی اسے بدعتی قرار نہیں دیا) صحاح ستہ کے مؤلفین ابو ہریرہ کو ثقہ مانتے ہیں۔ احادیث کی کثیر تعداد اُس سے نقل کی گئی ہے۔ شاید اسے ثقہ ماننے کا سبب یہ

۱۔ اسد الغابہ ج ۲، ص ۸۱۷ پر اُن کا نام ''زرقی'' لکھا ہے۔

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱۔

حدیث ہو جو اُس نے وضع کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَرَمًا وَاَنَّ حَرَمِیُ بِالْمَدِيْنَةِ فَمَنْ اَحْدَثَ فِيْهَا حَدَثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ وَاَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَحْدَثَ فِيْهَا ہر نبی کا ایک حرم ہوتا ہے اور میرا حرم مدینہ ہے۔ جس نے اس میں زیادتی کی اُس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علیؑ نے رسول اللہؐ کے حرم میں زیادتی کی تھی (یعنی بدعتوں کو رواج دیا تھا اور فساد برپا کیا تھا)۔

ابو ہریرہ کے مطابق امام علیؑ مفسد تھے لیکن معاویہ جو ابن عمر کے بقول مسلمان نہیں مرا مدینے کا محافظ تھا اور ابو ہریرہ کے بقول اور بسر کی گواہی کے بموجب بدعتوں اور فساد کو فرو کرنے والا تھا۔ بسر مدینے سے مکہ گیا تو راستے میں بہت سے لوگوں کو قتل کرتا ہوا گیا۔ جب اُس کی چڑھائی کی خبر مکہ پہنچی تو بہت سے لوگ اُس کے مظالم سے ڈر کر شہر چھوڑ گئے۔ بسر نے نجران (یمن) سے گزرتے ہوئے کئی عیسائیوں کو موت کی نیند سلا دیا اور پھر ایک تقریر کی جس میں اُس نے کہا: اے عیسائیو! اے بندروں کے بھائیو! اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے میری حکم عدولی کی ہے تو میں واپس آکر تمہاری نسل ختم کردوں گا، تمہاری کھیتیاں اجاڑ دوں گا اور تمہارے گھر مسمار کردوں گا۔[1]

صنعاء جاتے ہوئے اثنائے راہ میں اُس نے ابی کرب کو قتل کر دیا جو شیعہ قبائل "بنی حمدان" کا سردار تھا۔ صنعاء میں بھی اُس نے قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ مآرب کے لوگوں نے اُس سے رحم کی درخواست کی مگر اس نے اُن کے سرداروں کو قتل کر دیا۔ اُس وحشی نے عبید اللہ بن عباس کے دو معصوم بچوں کو بھی نہ

۱۔ اہل سنت بسر بن ابی ارطات کو بھی مجتہد مانتے ہیں۔ اُن کی نظر میں صحابی معذور ہے چاہے وہ جو بھی گناہ کرے۔ ہم برادران اہل سنت سے وہی پوچھتے ہیں جو خدا پوچھتا ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ کیا ہم مسلم اور مجرم کو برابر قرار دیں تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسا حکم لگاتے ہو۔ (سورۂ قلم: آیت ۳۵)

چھوڑا۔ بچوں کی غم زدہ ماں نے شدت غم سے اپنے بال نوچے اور دردناک مرثیہ کہا۔

مغیرہ بن شعبہ نے اس وحشیانہ کارروائی پر بسر کو ایک خط میں کمال ڈھٹائی سے لکھا: "میری دعا ہے کہ خدا مجھے اور تجھے اُن لوگوں میں سے قرار دے جو نیکی کا حکم دیتے ہیں، خدا سے لو لگاتے ہیں اور اسے بکثرت یاد کرتے ہیں۔"

سچ ہے کہ لوگ اخلاق کی بنا پر ایک دوسرے کے بھائی بند ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بسر اور مغیرہ جیسے ظالم اور دغا باز لوگ ہمارے وقت میں بھی ہیں اور خدا کے نام کی مالا جپتے ہیں (حتیٰ کہ نماز کی امامت کراتے ہیں لیکن دیندار لوگوں کو مسجدوں میں قتل بھی کرتے ہیں)۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام علیؑ نے جاریہ بن قدامہ کو بسر کی سرکوبی کے لئے بھیجا تھا۔ جاریہ نے بسر کا تعاقب کیا اور اُسے امام علیؑ کے علاقے سے بھگا دیا تاہم اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا اُس نے گھر مسمار کر دیے تھے، کھیتیاں اجاڑ دی تھیں اور بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔

جب بسر شام پہنچا تو اُس نے معاویہ کو رپورٹ کرتے ہوئے کہا:

"روانگی سے لے کر واپسی تک میں نے تمہارے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے اور انھیں قتل کر دیا۔" معاویہ نے کہا: "انھیں تم نے نہیں بلکہ خدا نے قتل کیا ہے۔"

یزید نے بھی امام سجادؑ سے کہا تھا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ قَتَلَ اَبَاكَ "شکر ہے خدا کا جس نے تمہارے باپ کو قتل کیا؟" امام سجادؑ نے فرمایا تھا: "خدا کی لعنت ہو اُس پر جس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔"

ابن ابی الحدید کہتا ہے: "اس مہم میں بسر نے تیس ہزار آدمی مار دیے اور متعدد زندہ جلا دیے۔ بسر کی طرح مسلم بن عقبہ المری[1] بھی یزید کا کارندہ بن گیا تھا۔

۱۔ جس طرح خدا نے سید سجادؑ کو کربلا میں ابن سعد کے ظلم سے بچایا تھا اسی طرح اُس نے واقعہ حرہ میں مسلم بن عقبہ المری کے ظلم سے امام کو اپنی پناہ میں رکھا۔

اُس نے واقعہ حرہ میں اور حجاز و یمن میں وہی طریقہ اختیار کیا جو بسر نے مدینہ میں کیا تھا۔ تاہم یزید کا طرزِ عمل اپنے باپ سے کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں تھا۔ معاویہ اور اُس کے کارندوں کے ہاتھوں مکہ اور مدینہ جیسے مقدس شہروں میں خون بہانا، بیگناہ بچوں کو قتل کرنا اور عورتوں کے زیورات لوٹنا ایسے جرائم تھے جن کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ معاویہ، امام علیؑ سے بڑا سیاستدان تھا۔ (شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۲۱)

بلاشبہ امام علیؑ اور آپ جیسے افراد فساد، غارتگری اور بیداد گری سے محض نابلد تھے۔ یہ معاویہ ہی تھا جو ایسی سیاست کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ جن لوگوں کی سوچ اس جیسی ہے اُن کی نظروں میں وہ بہت بڑا مدبر تھا۔

۵۔ **عمرو بن عاص:** زمخشری کی ربیع الابرار میں ہے کہ عمرو کی ماں نابغہ ایک بدنام عورت تھی۔ اُس کے ابولہب، امیہ بن خلف، ہشام بن مغیرہ اور ابوسفیان بن حرب کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے لیکن جب عمرو پیدا ہوا تو اُس نے کہا کہ اُس کا باپ عاص بن وائل ہے۔ یوں اُس نے باقی چاروں افراد کو گناہ سے بری کردیا۔ جب نابغہ سے پوچھا گیا کہ تو نے عاص کو عمرو کا باپ کیوں منتخب کیا تو وہ بولی: ''وہ مجھ پر اور میرے بچوں پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خرچ کرتا ہے۔'' تاہم عمرو کی صورت باقی چار کے مقابلے میں ابوسفیان سے زیادہ ملتی تھی۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ عمرو کے باپ عاص بن وائل نے کہا: میں ابتر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نفرت کرتا ہوں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔ بے شک تمہارا دشمن ہی ابتر رہے گا۔[1]

۱۔ اگر کسی شخص کی وارث نرینہ اولاد نہ ہو تو عرب اُسے ابتر کہتے ہیں۔ چونکہ عاص بن وائل نے رسول اکرمؐ کو طعنہ دیا تھا اس لئے خدا نے وحی کے ذریعے اپنے حبیبؐ کو تسلی دی اور بتایا کہ ہم نے تمہیں کوثر (جناب فاطمہؑ) عطا کی ہے جس کی اولاد قیامت تک باقی رہے گی اور اُس کی

عمرو بن عاص اُن لوگوں میں سے تھا جو رسول اکرمؐ سے دشمنی رکھتے تھے اور آپ کو معاذ اللہ جھوٹا اور فسادی کہتے تھے۔ اُس نے مشرکین کے ساتھ رسول اکرمؐ کے خلاف جنگیں لڑیں اور آپ کے لئے ستر اشعار پر مبنی ہجو کہی تو رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''اے پروردگار! میں شعر نہیں کہتا اور شاعری میرے شایاں نہیں اس لئے تو اُس کے ہر شعر کے ہر حرف کے بدلے اس پر ہزار مرتبہ لعنت بھیج۔''

نسل جس نے آپ کو ابتر کہا ہے ختم ہو جائے گی۔ (تفسیر مجمع البیان ج ۱۰ص ۵۴۹۔ تفسیر منہج الصادقین ج ۱۰، ص ۳۴۰ اور ابو الفتوح ج ۱۰، ص ۳۷۱۔)

حجاج نے والی خراسان قتیبہ بن مسلم کو یہ پیغام بھیجا کہ فقیہ خراسان یحییٰ بن یعمر کو میرے یہاں بھیج دو۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ میں اُس وقت حجاج ہی کے ساتھ تھا۔ حجاج نے کہا: اے یحییٰ! میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو حسنؑ و حسینؑ رسول اللہؐ کے بیٹے ہیں حالانکہ اولاد تو باپ کی طرف سے ہوتی ہے اور حسنؑ حسینؑ رسول اللہؐ کی بیٹی کے بیٹے ہیں پھر وہ ماں کی طرف سے رسول اللہؐ کی اولاد کیسے ہوگئے؟ یحییٰ نے کہا: ہاں یہ صحیح ہے یا حجاج! امام شعبی کہتے ہیں کہ مجھے یحییٰ کی جرأت پر تعجب ہوا کہ انھوں نے یا امیر کہنے کی بجائے یا حجاج کہا۔ حجاج نے کہا اگر تم اس بات کے ثبوت میں نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ کُمْ والی آیت کے علاوہ کسی دوسری آیت سے ثبوت پیش کردو تو تمہاری جان بخش دی جائے گی ورنہ میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ یحییٰ نے کہا: دوسری آیت ہی پڑھوں گا۔ لو سنو، ارشاد باری ہے: وَوَھَبْنَا لَہٗٓ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ کُلًّا ھَدَیْنَا وَنُوْحًا ھَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَھٰرُوْنَ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ وَزَکَرِیَّا وَیَحْیٰی وَعِیْسٰی وَاِلْیَاسَ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (سورہ انعام: آیت ۸۵) اس آیت میں اللہ جل شانہ نے حضرت عیسیٰؑ کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں شمار کیا ہے حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کے والد ہی نہیں تھے۔ نیز حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان ایک طویل مدت گزر چکی ہے جتنی کہ حسنؑ و حسینؑ اور رسول اللہؐ کے درمیان نہیں گزری۔

یہ سن کر حجاج نے کہا: واقعی آپ نے بہت اچھی دلیل پیش کی ہے۔ خدا کی قسم! ہم نے قرآن مجید کی بہت تلاوت کی لیکن کبھی بھی اس آیت پر غور نہیں کیا۔ یہ عجیب و غریب استدلال ہے۔ (دمیری، حیات الحیوان اردو، ص ۳۳۴)

اس بددعا کے مطابق عمرو بن عاص اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نظروں میں ملعون ہے۔[1]

ہجرت حبشہؓ کے وقت عمرو بن عاص نجاشی کے پاس پہنچا تھا تا کہ اُس سے درخواست کرے کہ وہ مسلمانوں کو واپس مکہ بھجوا دے۔[2] عمرو نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف ورغلایا تاہم اُن کے قتل کے بعد اُس نے اُن کے قصاص کے نام پر امام علیؑ کے مخالفین سے گٹھ جوڑ کرلیا۔ عمرو نے بی بی عائشہؓ سے کہا تھا: کاش! آپ جنگ جمل میں ماری جاتیں۔ بی بی عائشہؓ نے کہا: مرے تیرا باپ! میں کیوں ماری جاتی؟ عمرو نے کہا: یہ چیز علیؑ کے دامن پر ایک بہت بڑا داغ ہوتی۔ (سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے عہد میں عمرو بن عاص مصر کا امیر تھا۔ اس عہدے پر ہوتے ہوئے وہ زیادتی اور بددیانتی کا مرتکب ہوا تو حضرت عمرؓ نے اس کی دولت ضبط کرلی۔ عمرو نے اپنا ایمان اس شرط پر معاویہ کے ہاتھ بیچ دیا کہ وہ اُسے مصر کا امیر بنا دے گا اور اس صوبے کی مالیات اور دوسرے معاملات کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرے گا۔

عمرو بن عاص کے بارے میں اُس کے غلام نے کہا: ''وہ امام علیؑ کے خلاف اس لئے لڑا کہ وہ آخرت کے آدمی تھے اور اُس نے معاویہ کا دفاع اس لئے کیا کہ وہ دنیا کا بندہ تھا۔''

۱۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کے وقت رسول اکرمؐ نے عمرو بن عاص کو نشے کی حالت میں دیکھا تو اس پر لعنت بھیجی۔ (سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۲۶۱)

۲۔ عمرو بن عاص بادشاہ حبشہ اصحمہ نجاشی کا دوست تھا۔ قریش نے ہجرت اُولیٰ کرنے والے مسلمانوں کو واپس لانے کے لئے اُس کے اثر رسوخ کی وجہ سے اُسے بھی، عمارہ بن ولید کے ہمراہ حبشہ بھیجا تھا لیکن اُن لوگوں کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور انصاف پسند نجاشی نے مسلمانوں کا موقف سننے کے بعد انھیں نامراد لوٹا دیا۔

مقریزی نے الخطط میں اور ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں لکھا ہے کہ معاویہ نے عمرو بن عاص کو مصر کا امیر اس لئے بنایا تھا کہ وہاں کے لوگ شیعہ تھے شیخ ابوزہرہ نے المذاہب الاسلامیہ میں لکھا ہے کہ مصر کے لوگ حضرت عثمانؓ کے دور میں شیعہ بنے۔[1]

امیر المومنین امام علیؑ نے قیس بن سعد انصاری کو مصر کا امیر مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد محمد بن ابی بکر کا تقرر عمل میں آیا۔ معاویہ نے چار ہزار کی فوج عمرو کی کمان میں مصر بھیجی۔ اُس فوج میں معاویہ بن خدیج، ابی اعور سلمی اور عبد الرحمٰن بن ابی بکر شامل تھے۔ عمرو کی فوج نے محمد کی فوج کو تتر بتر کر دیا۔ محمد ایک ویران جگہ میں چھپ گیا۔ جب عمرو کے سپاہی اُسے گرفتار کر کے اُس ویرانے سے باہر لائے تو پیاس کے مارے محمد کی جان لبوں پر تھی۔ اُس نے پانی مانگا تو ابن خدیج نے کہا: ''اگر میں تجھے پانی دوں تو خدا کبھی میری پیاس نہ بجھائے۔'' ایک روایت کے مطابق ''ابھی محمد بن ابی بکر میں جان باقی تھی کہ انھیں ایک گدھے کی کھال میں سی کر زندہ جلا دیا گیا۔'' (مسعودی، مُرُوجُ الذھب ج ۲)

محمد بن ابی بکر کی شہادت کا صدمہ

جب محمد کے قتل کی خبر امام علیؑ کو ملی تو آپ نے فرمایا:

''ان لڑائیوں کے دوران مجھے اتنا دکھ کبھی نہیں ہوا جتنا آج محمد کی موت پر ہو رہا ہے۔'' جو لوگ موجود تھے انھوں نے کہا: آپ اُس کا بہت غم کر رہے ہیں۔

۱۔ شیخ ابوزہرہ اپنی کتاب الامام الصادقؑ کے صفحہ ۴۷ پر رقمطراز ہے:

جب صلاح الدین ایوبی نے مصر میں فاطمی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو شیعہ عوام بھی ظلم کی چکی میں پس کر ترک وطن پر مجبور ہوگئے۔ وہ شہر بہ شہر منتقل ہوتے رہے اور بالآخر ''اسوان'' میں بس گئے۔ مصر میں جو شیعہ بچ گئے تھے وہ ایوبی دور میں ختم ہوگئے۔ اس وقت یعنی ۱۹۶۲ء میں اس شہر میں کوئی شیعہ نہیں ہے۔ (مؤلف)

امام علیؑ نے کہا: "کیوں نہ کروں؟ محمد میری بیوی کا بیٹا تھا، میرے بچوں کا بھائی تھا اور میں اس کا باپ ہوں۔"[1]

امام علیؑ نے مصر کی بازیابی کے لئے مالک اشتر کی سرکردگی میں ایک بہت بڑی فوج بھیجی۔ جب یہ خبر معاویہ کو ملی تو اُس نے عریش کے ایک زمیندار کو بلوا بھیجا اور اُس سے کہا: اگر تو مالک کو زہر دیکر مار ڈالے تو تجھ کو بیس سال کا خراج معاف کردیا جائے گا۔ (اور اس کے پاس ابن آثال کا بنایا ہوا زہر بھیج دیا)۔ مالک جب عریش پہنچے تو زمیندار نے شہد کے شربت سے اُن کی تواضع کی۔ شربت پیتے ہی مالک کی موت واقع ہوگئی اور معاویہ کے سپاہیوں نے زمیندار کو مار ڈالا۔ جب حضرت علیؑ کو یہ اندوہناک خبر ملی تو آپ نے فرمایا: لِلْیَدَیْنِ وَالْفَمِ یہ الفاظ ایسے موقع پر کہے جاتے ہیں جب انسان بے بس ہو اور کچھ نہ کرسکتا ہو۔

جب مالک کی موت کی خبر معاویہ کو ملی تو اُس نے کہا: "اللہ کے کچھ لشکر ہیں اور ان ہی میں شہد ہے۔" جب مالک کو قتل کرنے کے لئے معاویہ نے زہر آلود شہد زمیندار کو دیا تو لوگوں سے کہا کہ وہ مالک پر لعنت بھیجیں۔ چنانچہ لوگوں نے مالک پر لعنت بھیجی۔ جب معاویہ کو مالک کی موت کی اطلاع دی گئی تو اُس نے لوگوں سے کہا: "دیکھو! خدا نے تمہاری دعا کتنی جلدی سن لی۔" انسان یہ سوچ کر تلملا اٹھتا

۱۔ جناب اسماء بنت عمیسؓ حضرت فاطمہؑ کی پہلے جٹھانی ہوا کرتی تھیں یعنی حضرت جعفر طیارؓ کی زوجہ تھیں۔ حضرت جعفر طیارؓ کے بعد وہ حضرت ابو بکرؓ کی زوجیت میں گئیں اور اُن کے بطن سے محمد بن ابی بکرؓ جیسے شریف النفس انسان پیدا ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد امام علیؑ نے حضرت اسماءؓ سے عقد فرمایا۔ چنانچہ محمد بن ابی بکرؓ امام علیؑ کے بیٹے کہلانے لگے۔ اُن کی پرورش امام علیؑ نے ہی فرمائی تھی اسی لئے وہ امام علیؑ سے بے حد محبت کرتے تھے اور اُن کا اپنے باپ حضرت ابو بکرؓ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

جب محمد بن ابی بکر کے قتل کی خبر مدینہ پہنچی تو معاویہ کی بہن ام المومنین حبیبہؓ نے ایک بھنا ہوا گوسفند اس پیغام کے ساتھ محمد بن ابی بکر کی بہن بی بی عائشہؓ کو بھجوایا کہ "تمہارا بھائی بھی اسی طرح بھونا گیا تھا۔" (سفینۃ البحار ج ۱، ص ۳۱۳)۔

ہے کہ خدا کے صالح بندوں کو دھوکے سے زہر دیکر قتل کیا جائے اور یہ گھناؤنے افعال خدا سے منسوب کئے جائیں اور اُس کی جانب سے دعا کی قبولیت کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ بلاشبہ معاویہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ جرائم اُس نے نہیں کئے۔

معری اپنے بیٹے کو حضرت آدمؑ کے الفاظ میں ڈانٹتا ہے اور کہتا ہے: تم خدا سے جھوٹ بولتے ہو۔ اپنے باپ آدمؑ سے جھوٹ بولتے ہو۔ اپنی ماں حواؑ سے جھوٹ بولتے ہو۔ ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے ہو اور اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو اور اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہو (جب معاویہ کہتا ہے کہ "مالک کو خدا نے قتل کیا ہے" تو وہ دراصل اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے)۔

معاویہ اپنی فوج پر ہی انحصار نہیں کرتا تھا۔ وہ لوٹ مار اور غارتگری کے لئے فسادی دستے بھی بھیجتا رہتا تھا جو آگ لگانے، قتل کرنے، قافلوں کو لوٹنے اور گھروں کو مسمار کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اُس نے اس قسم کے دستے یزید بن شجرہ، عبدالرحمٰن بن قیس، زہیر بن مکحول مسلم بن عقبہ اور عبداللہ بن مسعدہ کی ماتحتی میں بھیجے۔ ایسے کچھ دستوں کی کمان اُس نے خود بھی کی اور تباہی مچانے کے لئے دریائے دجلہ تک بڑھتا چلا گیا۔ (تاریخ کامل، ابن اثیر)

پروفیسر عباس محمود عقاد رقمطراز ہے: "معاویہ کے کارندے تربیت یافتہ تخریب کار تھے۔ وہ ہوشیار کتے تھے جو بکثرت شکار کرتے تھے۔"

لبنان کا عیسائی مصنف جارج جرداق لکھتا ہے:

بنی امیہ کے حامی دو طرح کے تھے:

۱۔ وہ جن کا ضمیر رشوت کے ذریعے خریدا جاسکتا تھا۔

۲۔ وہ جو صالح لوگوں کے دشمن اور پست فطرت تھے۔

معاویہ کے سپاہی انسانی خون کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔ وہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا شکار کرنے کے شائق تھے۔ خوف و ہراس پھیلا کے بھاگ جانا ان کی

وارداتوں کا عام طریقہ تھا۔ اُن لوگوں کے مقابلے میں امام علیؑ کے سپاہی کاہل اور ست الوجود تھے۔ آپ اُن کے طرزِ عمل سے اس قدر نالاں تھے کہ آپ دعا کرتے: ''اے پروردگار! مجھے ان سے بہتر لوگ عطا فرما۔''

ایک دن امام علیؑ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''وائے ہو تم پر! تم جنگ کے لئے میرے ساتھ چلتے ہو اور پھر میدان سے بھاگ جاتے ہو۔ خدا کی قسم! میں اپنے مقصد کی سچائی اور ایمان کے ساتھ مر جانا چاہتا ہوں کیونکہ اس میں ایک عظیم راحت پوشیدہ ہے۔ اس طرح میں تمہارے ساتھ گفتگو کرنے اور زحمتیں برداشت کرنے سے بچ جاؤں گا۔ نجانے وہ بدطینت شخص آنے میں اتنی دیر کیوں کر رہا ہے؟''

امام علیؑ اس بات کے لئے بے چین تھے کہ ابن ملجم جلدی آئے اور انھیں عراقیوں کے شر سے نجات دلا دے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ امام علیؑ اپنی موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ حرام کو حلال کر دیں اور جوڑ توڑ کی ڈپلومیسی سے اپنا مقصد حاصل کریں۔

چونکہ امام علیؑ شہادت کے آرزومند تھے اس لئے آپ نے اہل عراق سے کہا کہ جہاد کے لئے آپ کے ساتھ چلیں چاہے پھر بیشک وہ حسب عادت آپ کو میدان میں چھوڑ کر واپس آجائیں تاکہ شاید آپ شہید ہو جائیں اور آپ کی قربانی کو اللہ تعالیٰ قبول فرمالے۔

اس کے باوجود لوگ پوچھتے ہیں کہ جب عراقی فوج موجود تھی تو امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کیوں کی؟ کیا عراقی امام حسنؑ کے والد بزرگوار کے ساتھ مخلص تھے کہ آپ اُن پر بھروسا کرتے؟ چنانچہ یہ کہنا کہ امام حسنؑ نے معاویہ کے ساتھ خون خرابے سے بچنے، کینے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور امت کو متحد رکھنے کے لئے صلح کی تھی درست نہیں۔ فرزند رسولؐ نے صلح اس واسطے کی تھی کہ آپ کی حمایت اور بچ کرنے والے اتنے کم لوگ تھے کہ اُن کے بل بوتے پر جنگ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ ظاہر میں جو تلواریں آپ کے ساتھ تھیں دراصل وہ آپ کے خلاف تھیں۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

ہجرت کا تیسرا سال اور ۱۵ رمضان کی رات تھی جب مدینہ میں امام حسنؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس رات قدسیوں میں جشن کا سماں تھا کہ گلشن رسولؐ میں پہلا پھول کھلا تھا اور چمن علیؑ و بتولؑ میں پہلی بہار آئی تھی۔

آپ کی ولادت پر رسول اکرمؐ نے آپ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور آپ کا نام حسنؑ رکھا۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے پہلے کسی کے یہ نام نہیں رکھے گئے تھے۔

ولادت کے ساتویں دن رسول اکرمؐ نے آپ کا عقیقہ کیا اور اللہ کے نام پر دو گوسفند ذبح کئے، آپ کے سر کے بال منڈوائے، آپ کے سر پر خوشبو لگائی اور آپ کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کی۔

امام حسن مجتبیٰؑ سات سال تک رسول اکرمؐ کے زیر تربیت رہے۔ آنحضرتؐ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ آپ سے جدا ہوں۔ وہ دونوں بھائی اس طرح آپ کے ساتھ رہتے تھے جیسے روشنی سورج کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ فقط نماز اور نزول وحی کے وقت آپ سے جدا ہوتے تھے۔ جب وحی اترتی تو امام حسنؑ اسے یاد کر لیتے اور گھر جا کر اپنی والدہ ماجدہ کے سامنے دہرا دیتے۔ جب امام علیؑ گھر تشریف لاتے تو آپ کو پتا چلتا کہ حضرت فاطمہؑ پہلے ہی وحی سے آگاہ ہو چکی ہیں۔ جب آپ اُن سے پوچھتے کہ انھیں وحی کا علم کیسے ہوا تو وہ فرماتیں کہ آپ

کے فرزند حسنؑ نے مجھے بتایا ہے۔

ایک دن جب رسول اکرمؐ سجدہ کر رہے تھے تو امام حسنؑ آپ کی پشت مبارک پر سوار ہوگئے۔ آنحضرتؐ نے سجدے کو طول دیا لیکن امام حسنؑ پشت مبارک پر سے نہ اُترے چنانچہ آنحضرتؐ نے سر اٹھا کر آپ کو پشت مبارک سے اُتار کر بڑی آہستگی کے ساتھ فرش پر لٹا دیا۔ ایک اور موقع پر جب رسول اکرمؐ حالت رکوع میں تھے امام حسنؑ آئے اور آپ کی دونوں ٹانگوں کے بیچ سے نکل گئے۔ جو لوگ موجود تھے انھوں نے کہا: آپ حسنؑ کے ساتھ دوسروں سے مختلف سلوک کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حسنؑ میری شگوفوں بھری شاخ ہے۔

ایک دن رسول اکرمؐ امام حسنؑ کو دائیں کندھے پر اور امام حسینؑ کو بائیں کندھے پر بٹھا کر چل رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کو دیکھا تو حسنینؑ سے کہا: "تمھیں بڑی اچھی سواری میسر آئی ہے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "یہ دونوں میرے نور چشم ہیں۔ یوں کہو کہ یہ بڑے اچھے سوار ہیں۔ یہ دونوں میری دنیا کی پھولوں بھری شاخ ہیں۔"

رسول اکرمؐ امام حسنؑ سے فرمایا کرتے تھے کہ تمہاری رفتار و گفتار مجھ سے مشابہ ہیں۔ شیعہ سنی کتابوں میں بہت سی احادیث رسول اکرمؐ سے نقل کی گئی ہیں جن کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا:

"حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔"

"میں اُن سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھی ان سے محبت کرو۔ جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو کوئی ان کے خلاف بغض رکھتا ہے وہ میرے خلاف بغض رکھتا ہے۔"

"سب سے پہلے میں، فاطمہؑ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ جنت میں جائیں گے۔"

"حسنؑ اور حسینؑ امام ہیں خواہ وہ بیٹھے ہوں یا کھڑے ہوں۔"

مسند احمد بن حنبل میں معاویہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ امام حسنؑ کی زبان یا ہونٹ چوم رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ اللہ اُس زبان کو اور اُن ہونٹوں کو عذاب نہیں دے گا جنھیں اللہ کے رسولؐ نے چوما ہے۔

امام حسنؑ کی فضیلت میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں[1] مگر آپ کی عظمت (اور عصمت) کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کو نجران کے عیسائیوں پر لعنت بھیجنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

امام حسنؑ کے شمائل و فضائل

امام حسنؑ بڑی وجاہت کے مالک تھے۔ احمد بن عبد اللہ طبری شافعی لکھتے ہیں کہ امام حسنؑ کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ آپ کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ آپ کے چہرے پر زیادہ گوشت نہ تھا۔ آپ کی چھاتی پر نرم بال تھے۔ آپ کی داڑھی گھنی تھی آپ کے سر کے بال آپ کے کانوں کی لوؤں تک پہنچتے تھے۔

ایک اور شافعی عالم محب طبری ذخائر العقبیٰ میں لکھتے ہیں کہ امام حسنؑ کی گردن نقرئی صراحی دار اور ہڈیاں مضبوط تھیں۔ آپ کے شانے کشادہ، قد درمیانہ، چہرہ خوبصورت، بال گھنگھریالے اور جسم سڈول تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام حسنؑ ہم شکل پیغمبرؐ تھے تو بیجا نہ ہوگا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن ابوبکرؓ نے امام حسنؑ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو اُن کو اپنی گردن پر بٹھالیا اور ہنس کر بولے: بِأَبِيْ! شَبِيْهٌ بِالنَّبِيِّ لَيْسَ شَبِيْهًا بِعَلِيٍّ. میرا باپ آپ پر قربان! آپ علیؑ سے اتنے نہیں ملتے جتنے نبیؐ سے ملتے ہیں۔

۱۔ ان سے ملتی جلتی احادیث ان کتابوں میں ملتی ہیں: صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد بن حنبل، ذخائر العقبیٰ از محب طبری شافعی۔ الابانہ از ابن بطہ۔ الاصابہ از ابن حجر عسقلانی، تاریخ بغداد از خطیب بغدادی۔ مُرُوجُ الذّھب از مسعودی۔ العقد الفرید از ابن عبدربہ اندلسی، حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی۔ بحار الانوار از علامہ مجلسی وغیرہ۔

امام حسنؑ کے اخلاق و عادات

امام حسنؑ اپنے وقت کے سب سے بڑے عابد و زاہد تھے۔ وضو کرتے وقت آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا اور بدن خوف الٰہی سے کانپنے لگتا۔ جب آپ مسجد میں پہنچتے تو فرماتے: ”پروردگار! ایک گنہگار تیری چوکھٹ پر آیا ہے۔ تو میری جن کوتاہیوں سے واقف ہے انھیں بخش دے۔“ جب کبھی آپ کے سامنے موت، قبر، قیامت یا پل صراط کا ذکر کیا جاتا تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ آپ نے پا پیادہ پچیس حج کیے تھے۔ آپ کی سواری کا جانور آپ کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔

آپ نے تین مرتبہ اپنا مال راہ خدا میں تقسیم کر دیا اور دو مرتبہ ساری دولت خیرات کر دی۔ ایک شخص نے آپ سے مدد مانگی تو آپ نے اُسے پچاس ہزار درہم اور پانچ سو دینار عطا کیے۔

ایک بدو نے آپ سے مدد کی درخواست کی تو آپ نے اپنے منشی سے فرمایا: میرے خزانے میں جو کچھ ہے وہ اسے دیدو۔

ایک اور شخص نے مدد مانگی تو آپ نے اسے ڈیڑھ لاکھ درہم عطا کیے۔

لوگ آپ کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوتے تھے۔ معاویہ کا کہنا ہے کہ میں جب کبھی انھیں دیکھتا تو مجھے اُن کے مرتبے کا خیال آتا اور خوف محسوس ہوتا کہ کہیں وہ میری خامیاں نہ گنوانے لگیں۔

مروان بن حکم کہتا تھا کہ اِنَّ حِلْمَ الْحَسَنِ یُوَازَنُ بِهِ الْجِبَالُ۔ ”امام حسنؑ حلم کا کوہ گراں تھے۔“ آپ کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ ایک دن آپ نے دیکھا کہ کچھ غریب سڑک کے کنارے بیٹھے روٹی کے ٹکڑے کھا رہے ہیں۔ انھوں نے آپ کو کھانے کی دعوت دی۔ آپ سواری سے اترے اور فرمایا: ”خدا مغرور لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔“ پھر آپ نے اُن کے ساتھ کھانا تناول فرمایا۔ بعدازاں انھیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور انھیں خوراک اور پوشاک عنایت فرمائی۔

اگر امام حسنؑ فصاحت و بلاغت اور دلاوری میں اپنے والد بزرگوار کی مانند تھے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ کی پرورش دبستان قرآن اور مکتب وحی میں ہوئی تھی۔ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا تھا اور اُس کے احکام پر عمل بھی کرتے تھے۔ آپ نے اپنے نانا کے ارشادات سنے تھے جو فصاحت میں تمام عرب میں لاثانی تھے۔ آپ نے اپنے بابا کے خطبے بھی سن رکھے تھے جنھوں نے قریش میں فصاحت کی بنیاد ڈالی۔

صواعق محرقه میں ہے کہ ایک دن امام حسنؑ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے نانا کے منبر پر بیٹھے دیکھا تو باآواز بلند کہا: ”میرے باپ کی جگہ سے نیچے اتر آؤ۔“

مقاتل الطالبین میں ہے کہ جب معاویہ بیعت لینے کے بعد منبر پر گیا اور اُس نے امام علیؑ اور امام حسنؑ کی برائی کی تو امام حسینؑ اُسے روکنے کے لئے اٹھے تاہم امام حسنؑ نے انھیں بیٹھ جانے کو کہا اور خود کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے معاویہ کو مخاطب کرکے کہا: تم جو علیؑ کی بدگوئی کر رہے ہو میری بات سنو۔ میں حسنؑ فرزند علیؑ ہوں۔ تم معاویہ ہو اور تمہارا باپ صخر تھا۔ میں پسر فاطمہؑ ہوں اور تمہاری ماں ہند تھی۔ میری نانی خدیجہؑ تھیں اور تمہاری نانی قتیلہ تھی۔ میرے جد رسول اللہؐ تھے اور تمہارا دادا حرب تھا۔ خدا کی لعنت ہو اُس پر جس کا نسب گھٹیا اور شرافت ادنیٰ ہو، جس کا شر عظیم ہو اور جس کا کفر و نفاق ماضی میں زیادہ ہو۔

جو لوگ مسجد میں موجود تھے انھوں نے آمین کہی اور آج تک جس کسی نے یہ روایت سنی ہے اس نے آمین کہی ہے۔ ہم بھی آمین کہتے ہیں۔

اس سے زیادہ کوئی دوسرا جواب اتنا ٹھوس نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ معاویہ امام علیؑ کی توہین کرنا چاہتا تھا لیکن امام حسنؑ نے اسے احساس دلایا کہ فقط ان لوگوں پر لعنت بھیجی جانی چاہیے جو لعنت کے قابل ہوں اور وہ معاویہ اور اُس کا باپ تھے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے بدترین دشمن تھے۔ معاویہ کی ماں ہند تھی جس نے عم رسولؐ

حضرت حمزہ کا کلیجہ چبایا تھا اور اُس کی نانی قتیلہ تھی جس کے گھر پر دعوت گناہ دینے کے لئے جھنڈا لہراتا رہتا تھا۔

لوگوں نے جواب کی صحت کی تصدیق کردی اور امام حسنؑ کی نجابت وعظمت اور معاویہ کے شجرۂ نسب کا بھی اقرار کرلیا۔ انھوں نے فرزند رسولؐ کے ساتھ مل کر وہ لعنت دہرائی جو ہمارے معاشرے میں آج بھی دہرائی جاتی ہے اور جب تک اسے کہنے والا ایک شخص بھی روئے زمین پر زندہ ہے دہرائی جاتی رہے گی۔

پیمان صلح کے اسباب

۱) عراق کے لوگوں کی کاہلی اور اُن کے دلوں میں حضرت امیر المؤمنینؑ کے لئے لحاظ کا فقدان اس صلح کا ایک بڑا سبب تھا کیونکہ جب معاویہ اُن کے علاقوں پر حملہ کرکے مردوں کو قتل کرتا اور عورتوں کو لوٹتا تھا تو وہ اُس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتے تھے۔ امام علیؑ اپنے خطبوں کے ذریعے انھیں غیرت دلاتے تھے لیکن وہ سوائے متلون مزاجی کے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جیسا کہ ذکر کیا گیا امام علیؑ دعا کرتے تھے کہ انھیں جلد شہادت نصیب ہو تاکہ ان لوگوں سے چھٹکارا ملے۔ جب عراقیوں نے امام علیؑ کے ساتھ ایسا سلوک کیا تو انھوں نے اُن کے بیٹے کا بھی کوئی پاس لحاظ نہ کیا ہوگا۔ جب جنگ کی ضرورت تھی تو انھوں نے لڑنے سے جی چرایا اور جب جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تو امام حسنؑ کو اکیلا چھوڑ دیا۔ اس کاہل اور بزدل فوج کے مقابلے میں معاویہ کے سپاہی بے حد فرمانبردار تھے۔ وہ بلا چون و چرا اپنے امیر کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ اگر اُن میں سے کوئی اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں کوتاہی کرتا تو معاویہ اُس سے بازپرس کرتا تھا۔

۲) جن سرداران قبائل نے امام حسنؑ کی بیعت کی تھی انھیں دولت اور منصب کا شدید لالچ تھا۔ اگر انھیں حکومت میں حصہ مل جاتا تو وہ خوش ہوجاتے اور اگر ایسا

کوئی فائدہ نہ پہنچتا تو ناراض ہوجاتے تھے۔ یہی کچھ انھوں نے آپ کے والد بزرگوار کے ساتھ کیا تھا جن کے پیش نظر عدل وانصاف، اخوت اور مفاد عامہ کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

جہاں تک نفاذ عدل کا تعلق ہے سرداران قبائل خود کو عام لوگوں کا ہم پلہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نجاشی، مسقلہ بن ہبیرہ، قعقاع بن شور وغیرہ بک گئے اور امام کو چھوڑ کر معاویہ سے مل گئے۔ امام سے عراقیوں کی بدعہدی اور غداری کی وجہ یہ تھی کہ وہ دنیا کے بندے تھے۔ انھوں نے امام کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ امام نے کسی کے سامنے اپنا ایمان نہیں بیچا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ معاویہ کے پاس پہنچے جو اپنا گوہر مقصود پانے کے لئے ہر جرم کرسکتا تھا۔

۳) بہت سے منافقین نے بھی امام حسنؑ کی بیعت کی تھی۔ وہ بظاہر آپ کی حمایت کرتے تھے لیکن درپردہ آپ کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے تھے۔ اُن میں سے بعض نے معاویہ کو خط لکھے۔ جواباً معاویہ نے بھی انھیں خط لکھے اور پیسے بھی بھیجے۔ عمرو بن حریث، عمارہ بن ولید، حجر بن عمرو، عمرو بن سعد، ابوبردہ بن ابوموسیٰ اشعری اور طلحہ کے بیٹے اسماعیل اور اسحاق آس لگائے ہوئے تھے کہ معاویہ انھیں گورنر بنادے گا۔

شیخ راضی آل یاسین صلح الحسنؑ (ص ۵۷، مطبوعہ ۱۹۵۳ء) میں لکھتے ہیں:

''منافقین نے معاویہ کو لکھا کہ ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ آپ جلد تشریف لائیے۔ ان منافقین نے امام حسنؑ کو معاویہ کے حوالے کرنے یا قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ معاویہ نے عمرو بن حریث، اشعث بن قیس، حجار بن ابجر اور شبث بن ربعی کو لکھا کہ اگر تم حسن بن علیؑ کو قتل کردو تو میں ایک لاکھ درہم، ایک رجمنٹ کی کمان اور اپنی ایک بیٹی تمھیں دوں گا۔ جونہی امام کو اس منصوبے کی اطلاع ملی آپ احتیاط کے طور پر لباس کے نیچے زرہ پہننے لگے۔ باجماعت نماز پڑھتے وقت بھی آپ زرہ پہنے

رہتے تھے۔ مذکورہ اشخاص میں سے ایک نے آپ پر بحالت نماز میں تیر پھینکا لیکن آپ کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ معاویہ نے سیاسی رشوت کے طور پر شبث بن ربعی، عمرو بن حریث اور حجار بن ابجر سے کہا کہ اگر وہ امام حسنؑ کو قتل کر دیں تو وہ اپنی بیٹیاں اُن سے بیاہ دے گا۔ اگر امام حسنؑ صلح نہ کرتے تو امام حسینؑ کی طرح قتل کر دیئے جاتے کیونکہ جن لوگوں نے کربلا میں امام حسینؑ، اولاد حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کا خون بہایا تھا اُن میں سے اکثر معاہدۂ صلح سے پہلے امام حسنؑ کی فوج میں تھے مثلاً امام حسینؑ کا قاتل شمر بن ذی الجوشن۔

(۴) آپ اپنے چچا زاد بھائی مغیرہ بن نوفل کو کوفہ میں اپنا نمائندہ مقرر کر کے معاویہ سے جنگ کرنے روانہ ہوگئے۔ نخیلہ پہنچ کر آپ فوج جمع کرنے کے لئے دس دن وہاں رکے۔ تاہم بہت سے لوگ جنھوں نے نصرت کا وعدہ کیا تھا آپ سے دور رہے۔ نخیلہ کی چھاؤنی میں صرف چار ہزار آدمی حاضر ہوئے چنانچہ امام واپس کوفہ گئے اور آپ نے لوگوں سے کہا کہ وہ آپ کے ساتھ جہاد کرنے چلیں۔ آپ نے لوگوں کو سرزنش کی اور فرمایا کہ تم اُسی طرح مجھے دھوکا دے رہے ہو جس طرح تم نے میرے والد بزرگوار کو دیا تھا۔ امام حسنؑ نے عبید اللہ ابن عباس[۱] کو بارہ ہزار کے لشکر کا سالار بنا کر عراق کی سرحدوں کا دفاع اور معاویہ سے جہاد کرنے کے لئے بھیجا لیکن معاویہ نے چالبازی سے کام لیتے ہوئے اس فرنٹ لائن کمانڈر کو لکھا کہ اگر تم میری اطاعت قبول کر لو تو میں تمھیں دس لاکھ درہم دوں گا۔ عبید اللہ نے یہ بات مان لی اور راتوں رات معاویہ کی اطاعت قبول کر لی۔ معاویہ نے اُسے دس لاکھ درہم بھجوائے۔ معاویہ کی اس عظیم فتح کے نتیجے میں امام حسنؑ کی فوج کے سرداروں نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغاوت کردی اور آپ کا حکم

۱۔ عبید اللہ بن عباس، ابن عباسؓ کے چھوٹے بھائی تھے۔ امام علیؑ کے عہد خلافت میں عبید اللہ یمن کے امیر اور ۳۶ھ تا ۳۸ھ امام علیؑ کی طرف سے کاروان حج کے امیر تھے۔

ماننے سے انکار کر دیا اور یکے بعد دیگرے شام پہنچ گئے۔

(۵) معاویہ نے وہ خط جن میں اصحاب حسنؑ نے لکھا تھا کہ وہ امام حسنؑ کو قتل کر دیں گے یا معاویہ کے حوالے کر دیں گے مغیرہ بن شعبہ، عبد اللہ بن عامر اور عبدالرحمٰن بن حکم کے ساتھ امام کو بھجوا دیئے۔ امام نے تحقیقات کرائیں تو پتا چلا وہی بات تھی کہ گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

ظاہر ہے کہ معاویہ کی یہ خواہش تھی کہ امام حسنؑ کی فوج میں بددلی پھیل جائے اور وہ منتشر ہو جائے۔

امام حسنؑ کی صلح کے یہ پانچ اسباب تھے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح اس لئے نہیں کی تھی کہ آپ خونریزی سے بچنا چاہتے تھے اور مسلمانوں میں اتحاد دیکھنا چاہتے تھے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

آں یکے شمع شبستان حرم   حافظ جمعیت خیر الامم

تا نشیند آتش پیکار و کیں   پشت پا زد بر سر تاج و نگیں

آپ نے صلح اس لئے کی کہ آپ کو مخلص ساتھی میسر نہ تھے۔ بہت سے اشخاص جو بظاہر آپ کی فوج میں تھے درحقیقت معاویہ کے جاسوس تھے اور دھوکا دینے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ یہ منافقین اُن لوگوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھے جو کھلم کھلا امام کی مخالفت کرتے تھے۔

رسول اکرمؐ سے منسوب حدیث فَقَالَ اِبْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُّصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ یعنی میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے اور اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا[۱] اُن حدیث سازوں نے گھڑی

۱۔ صحیح بخاری، جزء ۵، ص ۵۶، ح ۱۳۰ مطبوعہ عالم الکتب، بیروت میں یہ حدیث حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ حَدَّثَنَا حُسَيْنُ الْجُعْفِيُّ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى عَنِ الْحَسَنِ عَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ کے طریق سے آئی ہے۔

ہے جنھیں معاویہ نے ''وضع حدیث'' کے لئے ابو ہریرہ اور سمرۃ بن جندب کی طرح خرید رکھا تھا۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان صلح ہونے والی ہے تو اہل کوفہ نے اور معاویہ کے جاسوسوں نے امام کے خلاف بغاوت کر دی۔ آپ کا مال اسباب لوٹ لیا اور آپ کی ران زخمی کر دی۔ جب آپ لڑنا چاہتے تھے اُن لوگوں نے آپ کا کہنا نہ مانا اور جب آپ صلح کرنے پر مجبور ہوگئے تو ان لوگوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی۔

انھوں نے امام علیؑ کو بھی ثالثی قبول کرنے پر مجبور کیا تھا اور جب ثالثی کا نتیجہ نقصان کی صورت میں ظاہر ہوا تو وہ ان کو الزام دینے لگے اور جب وہ لڑنے سے باز رہے اور صبر اختیار کیا تو انھوں نے ان کے خلاف ان کے صبر کی وجہ سے جنگ کی۔ اسی طرح انھوں نے امام حسنؑ کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور بعد میں ایسا کرنے کی بنا پر ان پر اعتراض کیا۔ ان حالات میں اگر امام حسنؑ صلح نہ کرتے تو کیا کرتے جب دشمن دین کی خلاف ورزیاں کر رہا تھا، فریب کے جال بچھا رہا تھا اور اپنی بیٹیوں کا رشتہ دے رہا تھا، فوجی امام کی بات نہیں مان رہے تھے اور معاویہ کی صفوں میں شامل ہو رہے تھے تو آپ کے سامنے صلح کے سوا کون سا راستا کھلا تھا؟

جو ناقدین یہ سوال کرتے ہیں کہ امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کیوں کی وہ اُن مشکلات کو بھول جاتے ہیں جو ہر طرف سے امام کو جکڑے ہوئے تھیں۔ وہ چیزوں کو دور سے دیکھ کر ان کے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں اور واقعات کے اسباب اور نتائج کا علم نہیں رکھتے۔ چونکہ اسباب زمینی حقائق سے جڑے ہوتے ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص وقت اور حالات کو نظرانداز کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکے اس لئے ''صلح حسنؑ'' کے ناقدین کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تمام واقعات کا مربوط مطالعہ کریں اور پھر نتیجہ اخذ کریں۔ انھیں گمان یا گمان غالب کی

بنا پر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ دراصل جو لوگ امام حسنؑ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں وہ اُن لوگوں کی مانند ہیں جو ''افراد'' پر تو نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن اس ''معاشرہ'' کو کچھ نہیں کہتے جو افراد کو متاثر کرتا ہے۔

صلح حسنؑ اور شہادت حسینؑ کے اسباب

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ امام حسنؑ نے صلح کو اور امام حسینؑ نے شہادت کو ترجیح کیوں دی اور ان کے اپنے اپنے اقدامات کی وضاحت کیونکر کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کے بہت سے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ذیل میں وہ جوابات درج کئے جاتے ہیں جو تحقیق، بحث مباحثہ اور تجربے کی بدولت ہمارے علم میں آئے ہیں۔

۱۔ بنی امیہ کا جذبہ انتقام

بنی امیہ کے دلوں میں خدا و رسولؐ کے لئے کینہ بھرا ہوا تھا۔ رسولؐ اور آل رسولؐ کے ساتھ یہ کینہ صلح کرنے سے ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کینہ کا واحد مداوا کشت وخون تھا۔ کینہ کی یہ آگ فقط سر کاٹنے اور لاش کا مثلہ کرنے سے ہی بجھ سکتی تھی۔

انھوں نے حضرت حمزہؓ کو قتل کر دیا لیکن ہند کا دل اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوا جب تک اس نے ان کا جگر نہ چبالیا اور ان کے ناک کان کاٹ کر اس کا ہار گلے میں نہیں پہن لیا۔

انھوں نے امام حسینؑ کو قتل کر دیا لیکن اُن کی تسلی اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک انھوں نے امام کا جسد مبارک گھوڑوں سے پامال نہیں کرلیا اور آپ کا سر کاٹ کر آپ کے ہونٹوں اور دانتوں پر چھڑی نہیں مار لی۔

انھوں نے زید بن علیؑ کو قتل کر دیا لیکن اس سے اُن کے انتقام کی آگ نہیں بجھی جب تک انھوں نے قبر سے حضرت زیدؓ کی لاش نکال کر اُن کا سر کاٹ نہیں لیا اور بدن سولی پر چڑھا نہیں دیا۔

کیا معاویہ امام حسنؑ کے صلح کرنے سے مطمئن ہوسکتا تھا؟ کیا امام حسنؑ کے قتل سے کم کسی اقدام سے اس کی تسلی ہوسکتی تھی؟ اگر معاویہ کا مقصد صلح کرنا اور امام حسنؑ کو مطیع بنانا تھا تو معاہدۂ صلح کے بعد اُس نے انھیں زہر کیوں دیا؟

اگر معاویہ اقتدار چاہتا تھا تو اُس نے اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھ جانے کے بعد امام علیؑ پر لعنت کیوں بھیجی جبکہ وہ بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا تھا اور سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یہ سمجھنا قطعاً ایک غلطی ہے کہ معاویہ اور یزید صلح چاہتے تھے اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے صرف بیعت کے طلبگار تھے۔ ان باپ بیٹے کا اصل مقصد اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین سے انتقام لینا تھا اور یہ انتقام انھوں نے گلشن رسولؐ کے دونوں پھولوں کو مسل کرلیا۔

۲۔ اسلام کا تحفظ

معاویہ امام حسنؑ کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر وہ امام کے قتل کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے مخالفین کے ہاتھوں میں ہتھیار نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک منصوبے کے تحت امام کے کچھ ساتھیوں کو خریدا اور اُن سے کہا کہ وہ امام کو جنگ لڑنے پر آمادہ کریں اور جب وہ میدان میں آئیں تو انھیں قتل کردیں۔ چونکہ امام ان معاملات سے باخبر تھے اس لئے انھوں نے معاویہ کا منصوبہ ناکام بنادیا اور صلح کرلی۔ اگر آپ جنگ کرتے تو آپ اور آپ کے اہل خانہ اور آپ کے جاں نثار ساتھی آپ کی اپنی فوج کے ہاتھوں مارے جاتے۔ یوں معاویہ کا مقصد حاصل ہوجاتا (سرکاری اسلام بچ جاتا) اور (حقیقی) اسلام مٹ جاتا۔

۳۔ مخالفین کی چالوں کا سدباب

اگر امام حسنؑ اپنی فوج میں موجود غداروں کے ہاتھوں قتل ہوجاتے تو معاویہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا اور یزید کا کردار بھی اتنا گھناؤنا نظر نہ آتا۔

اگر امام حسنؑ اپنی فوج کے ہاتھوں مارے جاتے تو معاویہ اُن کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا (جیسا کہ اس نے حضرت عثمانؓ کے معاملے میں کیا تھا) اور اُن کے قاتل کو مروا ڈالتا۔ چونکہ وہ یہ اقدام فرزند رسولؐ کے خون کا انتقام لینے کے لئے کرتا اس لئے اسے خاصی قوت حاصل ہوجاتی۔ یہ ایسے ہی ہوتا جیسے اس نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے قتل پر آمادہ کیا اور پھر اُن کے قصاص کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

۴۔ نتیجہ وہی ہے

اگرچہ معاویہ نے امام سے صلح کرلی لیکن اس کا مقصد صلح کرنا یا بیعت لینا نہیں تھا۔ جس طرح اُس کی ماں نے حضرت حمزہؓ کے جگر کو اپنا ہدف بنایا تھا اُسی طرح معاویہ کا ہدف بھی امام حسنؑ کا جگر تھا۔ معاویہ کا مقصد اولاد رسولؐ کا خون بہانا تھا تاکہ وہ اسلام اور رسول اسلامؐ سے بدلہ لیکر اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچائے۔ اگر امام کا جگر معاویہ کا ہدف نہ ہوتا تو وہ صلح کرنے کے بعد آپ کو دھوکا کیوں دیتا؟

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ امام حسنؑ کی شہادت کا سبب وہ زہر تھا جو معاویہ نے انھیں دلوایا تھا۔ تاریخ نے اگر ایک طرف معاویہ کے مکروہ عزائم کے بارے میں لکھا ہے تو دوسری طرف امام کی عظمت، اسلام سے محبت اور امت پر ان کے احسان کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ امام حسنؑ کی صلح اُن کے لئے، ان کے والد بزرگوار اور امت رسولؐ کے لئے رحمت تھی جبکہ معاویہ کے لئے ابدی لعنت تھی۔

جس طرح معاویہ نے قتل حسنؑ کا عزم کر رکھا تھا اسی طرح یزید نے بھی قتل حسینؑ کا تہیہ کر رکھا تھا خواہ حسینؑ بیعت کرتے یا صلح کرتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب امام حسینؑ قتل ہوگئے تو اُن کی لاش پامال کی گئی اور اسباب لوٹ لیا گیا۔ بیمار کو طوق و زنجیر میں جکڑا گیا۔ شہیدوں کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائے گئے اور لاشیں صحرا کی کھلی دھوپ میں چھوڑ دی گئیں۔ ستم دیدہ خواتین کو اُن کے پیاروں کی

لاشوں کے پاس سے گزارا گیا اور کوچہ و دیار میں پھرایا گیا۔ امام حسینؑ کے مقدس سر کے ساتھ بے ادبی کی گئی۔ یزید کی ان حرکتوں سے پتا چلتا ہے کہ معاملہ محض حکومت کا اور سوال صلح یا بیعت کا نہیں تھا بلکہ معاملے کی نوعیت زیادہ گہری تھی۔ اصل بات انتقام سے بھرے ان دلوں کی تسکین تھی جنھیں خدا و رسولؐ کے دین کی وجہ سے بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ یزید نے امام حسینؑ کو شہید کرکے اسی طرح ابدی لعنت سمیٹی جس طرح معاویہ نے امام حسنؑ کو شہید کرکے سمیٹی تھی۔

یہی نتیجہ اہل بیتؑ کا منتہائے مقصود تھا۔ (علیؑ کا طرز زندگی ہو یا حسنؑ و حسینؑ کا انداز شہادت) سب کا مقصد منافقوں کو رسوا کرنا تھا جو اسلام کا نام لے کر اسلام کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ اگر یہ مقصد صلح سے پورا ہوا تو انھوں نے صلح کی اور اگر شہادت سے پورا ہوا تو انھوں نے شہادت کو گلے لگایا اور جب بھی اُن کا قتل ہو جانا باطل کی رسوائی اور حق کی سرفرازی کا باعث ہوا انھوں نے قتل ہونے سے کبھی خوف نہیں کھایا۔

۵۔ عمل کے مختلف انداز

جب ہم مختلف واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے مرتبے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں نے فی سبیل اللہ جہاد کیا اور شہادت پائی اور یوں اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں اپنی سچائی ثابت کردی۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف ان کے عمل کے انداز میں تھا۔

امام حسینؑ کو تلوار سے اور امام حسنؑ کو زہر سے شہید کیا گیا۔ شاید امام حسنؑ کا طرز عمل معاویہ کو مجرم قرار دینے کا زیادہ واضح سبب ہے کیونکہ امام حسنؑ نے اُس کے ساتھ صلح کی تھی جس میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ امام کی زندگی محفوظ رہے گی لیکن اس کے باوجود انھیں ''زہر دغا'' سے شہید کر دیا گیا۔

پس یہ سوال بے معنی ہے کہ امام حسینؑ کیوں لڑے اور امام حسنؑ نے صلح کیوں کی۔ درحقیقت دونوں راہ خدا میں شہید ہوئے اور دونوں نے خدا و رسولؐ کے دشمنوں کو ہمیشہ کے لئے رسوا کردیا۔

مناسب ہوگا کہ امام حسنؑ کے بارے میں بحث اس واقعے پر ختم کی جائے جو ابن عبدربہ اندلسی نے **العقد الفرید** میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

معاویہ نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا کہ ماں باپ، نانا نانی، چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کے لحاظ سے کون سب سے زیادہ عالی رتبہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ بہتر جانتے ہیں۔ معاویہ نے امام حسنؑ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اس کے باپ علیؑ ابن ابی طالبؑ اور اس کی ماں بنت رسول فاطمہ زہراؑ ہیں۔ اس کے نانا رسول اللہؐ اور نانی خدیجۃ الکبریٰ ہیں۔ اس کے چچا جعفر اور پھوپھی ہالہ بنت ابی طالبؑ ہیں۔ اس کے ماموں پور رسول قاسمؑ اور اس کی خالہ بنت رسول زینب ہیں۔

یہ شرف اور یہ نسب امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا جرم تھا۔ معاویہ اور یزید نے اسی جرم کی وجہ سے انھیں قتل کیا۔

معاویہ اور شیعہ

جب امام علیؑ شہید ہو گئے اور امام حسنؑ خانہ نشین ہو گئے تو کیا معاویہ کیلئے یہ مناسب تھا کہ وہ بیکسوں پر ظلم ڈھاتا اور اُنہیں دہشت زدہ کرتا یا یہ مناسب تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے ساتھ اُن فاتحین کی طرح سلوک کرتا جو دشمن پر فتح پا لینے کے بعد حسن سلوک کے وعدے کرتے ہیں اور اُن کے ماضی سے درگزر کرتے ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ دشمن کو معاف کر دینا عالی ظرف لوگوں اور پیغمبروں کی صفت ہے اور معاویہ کا تعلق اس جماعت سے نہیں تھا۔ امام علی علیہ السلام نے جنگ جمل میں بی بی عائشہؓ اور مروان بن حکم کو معاف کر دیا تھا نیز جنگ صفین میں عمرو بن عاص اور بسر بن ابی ارطات کی جان بخشی کر دی تھی اور معاویہ اور اُس کی فوج کو پانی لینے کی اجازت دیدی تھی۔ امام علیؑ نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کیونکہ آپ ایک عالی ظرف اور کریم النفس انسان تھے۔

امام علیؑ کی اس دریا دلی کے جواب میں معاویہ نے اُن کی شہادت کے بعد اُن پر منبر سے لعن کہلوایا[۱] اور اُن کے شیعوں کو شدید ایذائیں دیں۔

۱۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب سیرت النبیؐ (جلد ۱، صفحہ ۲۹ مطبوعہ لاہور) میں لکھتے ہیں: حدیثوں کی تدوین بنی امیہ کے زمانے میں ہوئی جنھوں نے پورے نوے سال تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہؑ کی توہین کی اور جمعہ میں برسر منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔

معاویہ صرف بدنہاد ہی نہیں تھا بلکہ مکارم اخلاق سے بھی عاری تھا۔ وہ نیک لوگوں پر حملے کر کے اپنے جذبۂ انتقام کو تسکین پہنچاتا تھا۔ معاویہ امام علیؑ کے علاقوں میں بسر بن ارطاۃ، مسلم بن عقبہ، ضحاک بن قیس وغیرہ کو بھیجتا جو لوگوں کو قتل کرتے اور اُن کا مال لوٹ کر بھاگ جاتے تھے۔ معاویہ سمجھتا تھا کہ وہ امام علیؑ، اُن کے فرزندوں اور شیعوں کے لئے مشکلات پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کر لے گا۔ امام علیؑ کی شہادت اور امام حسنؑ کی صلح کے نتیجے میں حکومت اُسے مل گئی لیکن اُس نے جو لوٹ مار اور کشت و خون کیا اور جس طرح صالح مومنین کو چن چن کر قتل کیا اُس کے لئے وہ خدا کے حضور کیا عذر پیش کرے گا؟ کیا حق اور اُس کے پیروؤں اور انصاف اور اُس کے حامیوں سے دشمنی کے سوا کوئی اور عذر اُس کے پاس ہے؟

ایک حدیث کے مطابق "ہر نعمت کا شکرانہ یہ ہے کہ جو چیز اللہ نے حرام قرار دی ہے اُس چیز سے پرہیز کیا جائے اور ایک نعمت جس کی قدر نہ کی جائے اُس گناہ کی مانند ہے جو معاف نہ کیا گیا ہو۔"

جب معاویہ کوفہ پہنچا تو منبر پر جا کر اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُسے فتح نصیب ہوئی۔ پھر لوگوں سے کہا: "بخدا میں تمہارے ساتھ نماز قائم کرنے روزہ رکھنے، حج کرنے اور زکات دینے کے لئے نہیں لڑ رہا تھا کیونکہ یہ سب تو تم بجا لاتے ہو۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں تو تم پر حکومت کرنے کے لئے لڑ رہا تھا اور "خدا نے" مجھے یہ اختیار دیا ہے جسے تم لوگ ناپسند کرتے ہو۔ جان لو کہ جو بھی شرائط میں نے حسنؑ بن علیؑ کے ساتھ معاہدہ صلح میں مان لی تھیں اُن کو میں اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ میں اُن میں سے کسی بھی شرط کو پورا کرنے کا پابند نہیں ہوں۔" (شرح نہج البلاغہ، ج ۴)

حدیث میں ہے کہ پیمان باندھنے کے بعد پیمان شکنی نہ کرو لیکن معاویہ نے کہا: "حسنؑ بن علیؑ سے طے کردہ شرائط میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔"

پیمانِ صلح کے سلسلے میں امام حسنؑ نے مندرجہ ذیل شرائط پیش کی تھیں۔

۱۔ معاویہ کتاب وسنت پر عمل کرے گا۔

۲۔ معاویہ خلافت کسی شخص کے نہیں بلکہ امت کے حوالے کرے گا۔

۳۔ لوگوں کی جان، مال اور آبرو محفوظ رہے گی۔

۴۔ علیؑ ابن ابی طالبؑ پر لعنت بند کردی جائے گی۔

معاویہ نے یہ شرائط قبول کرلی تھیں لیکن بعد میں اس معاہدے کی دھجیاں اڑا دیں

امام علیؑ پر دشنام طرازی

روایت ہے کہ ایک دن ابوسفیان سرخ اونٹ پر سوار تھا۔ عتبہ اُس کے آگے آگے چل رہا تھا اور معاویہ پیچھے سے ہانک رہا تھا۔ رسول اکرمؐ نے انھیں دیکھا تو فرمایا: ''اللہ سوار پر اور اُس کے آگے چلنے والے پر اور اُسے ہانکنے والے پر لعنت کرے۔'' معاویہ کو یہ لعنت یاد تھی چنانچہ وہ رسول اکرمؐ سے بدلہ چکانے کے لئے موقع کا منتظر رہا۔[1] رسول اکرمؐ پر تو وہ علی الاعلان لعنت بھیج نہیں سکتا تھا اس لئے

۱۔ مسعودی لکھتا ہے کہ مطرف بن مغیرہ نے کہا: ''میں اور میرا باپ شام میں معاویہ کے مہمان تھے۔ میرا باپ اکثر معاویہ کے دربار میں جاتا تھا۔ ایک رات جب وہ معاویہ سے مل کر لوٹا تو بیحد پریشان تھا۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا: معاویہ بہت برا آدمی ہے بلکہ دنیا کا بدترین آدمی ہے۔ میں نے پوچھا: کیا ہوا؟ اُس نے کہا: میں نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب جبکہ تم اپنی مراد کو پہنچ گئے ہو اور اسلامی خلافت تمھیں حاصل ہوگئی ہے بہتر ہوگا کہ تم اس آخری عمر میں لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آؤ اور بنی ہاشم کے ساتھ اس قدر بدسلوکی نہ کرو کیونکہ آخر وہ تمہارے رشتے دار ہیں اور اب ایسی کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کی بنا پر تمھیں خوف ہو کہ وہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ معاویہ نے کہا: افسوس! ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے خلافت کی اور لوگوں سے اچھا سلوک کیا مگر اُن کا نام مٹ گیا لیکن برادر ہاشم (یعنی رسول اکرمؐ) کا نام لے کر ہر روز دنیائے اسلام میں پانچ مرتبہ آواز بلند ہوتی ہے کہ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ جب تینوں خلفاء کا نام مٹ گیا اور محمد (ص) کا نام زندہ ہے تو اس کے بعد کون سا کام کرنے کو رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ محمد (ص) کا نام بھی مٹ جائے۔

یہ قصہ مسعودی نے زبیر بن بکار کی کتاب الموفقیات سے لیا ہے جو ایک قابل اعتماد بنیادی تصنیف ہے۔

جب وہ حاکم علی الاطلاق بن گیا تو امام علیؑ پر لعنت بھیج کر دراصل رسول اکرمؐ پر لعنت بھیجتا تھا کیونکہ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: مَنْ سَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ سَبَّنِیْ وَمَنْ سَبَّنِیْ فَقَدْ سَبَّ اللّٰہَ وَمَنْ سَبَّ اللّٰہَ اَکَبَّہُ اللّٰہُ عَلٰی مِنْخَرَیْہِ فِی النَّارِ یعنی جو کوئی علیؑ پر لعنت بھیجے وہ مجھ پر لعنت بھیجتا ہے اور جو مجھ پر لعنت بھیجے وہ اللہ پر لعنت بھیجتا ہے اور جو اللہ پر لعنت بھیجتا ہے اللہ اسے اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔

(دلائل الصدق ج ۳، ص ۲۳۱ بحوالہ مستدرک حاکم۔ نورالابصار شبلنجی ص ۱۰۰ مطبوعہ السعیدیہ ینابیع المودۃ سلیمان قندوزی حنفی ص ۲۰۵ طبع استنبول)

معاویہ امام علیؑ پر لعن کہلواتا تھا۔ اُس نے پوری سلطنت میں اپنے عمال کو لکھا کہ ہر منبر سے جمعہ کے خطبے میں علیؑ پر تبرا کیا جائے۔ سرکاری خطیب تمام شہروں میں منبروں سے امام علیؑ پر لعنت بھیجتے تھے، اُن سے اظہار برأت کرتے تھے اور اُن کے خاندان کو برا کہتے تھے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۳، ص ۱۵)

نوے سال تک حضرت علیؑ پر تبرا بھیجنا ملک کے قانون کا حصہ رہا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ چون و چرا کرے۔ (لوگوں کی نماز قضا ہوجاتی تھی مگر یہ ''عبادت'' قضا نہیں ہوتی تھی۔ ایک صدی تک تو حضرت علیؑ کا نام خلفائے اسلام کی فہرست میں شامل ہی نہیں تھا۔ جب عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ والی حدیث بنائی گئی اس کے بعد کہیں جاکر آپ کو چوتھا خلیفہ مانا گیا)۔

جب تک امام علیؑ زندہ رہے معاویہ خوفزدہ رہا اور اُس نے مکر و فریب، ظلم و ستم اور لوٹ مار سے کام لیا۔ اگر کوئی اُس سے اس کی وجہ پوچھتا تو وہ یہ بہانہ کرسکتا تھا کہ اُس نے یہ سب کچھ اپنی کرسی مضبوط کرنے کے لئے کیا ہے لیکن جب وہ اپنی کرسی مضبوط کرچکا تو پھر وہ کسی کو کیا وجہ بتا سکتا تھا؟

معاویہ سے کہا گیا کہ ''تم اپنی مراد کو پہنچ گئے ہو لہٰذا مناسب ہوگا کہ اب تم علیؑ پر سب کرنا بند کردو۔'' اُس نے کہا کہ ''یہ ممکن نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس پر

اتنی لعنت بھیجی جائے کہ بچوں کو بھی اس کی عادت پڑ جائے اور وہ اس عادت کے ساتھ بوڑھے ہو جائیں۔"

معاویہ نے اپنے عمال کو لکھا کہ وہ اس عمل کو ایک "عبادت" کے طور پر جاری رکھیں۔ اُس نے امام علیؑ کی اولاد اور اُن کے رشتے داروں کے سامنے انھیں برا کہا۔ اُس نے امام علیؑ کی اولاد کو اپنے گھر بلایا جہاں اُس کے ہم نشین نے اُس کے سامنے امام علیؑ کی بدگوئی کی۔

ہم نے یہ تو سنا ہے کہ ایک آدمی اپنے ایک دشمن کے ساتھ سفر پر گیا اور سفر کے دوران وہ دونوں ایک فرش پر سوئے اور بالآخر اُس آدمی نے اپنے دشمن کو دھوکا دیا لیکن ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک آدمی کو اپنے گھر مہمان بلایا ہو اور پھر اُسے دھوکا دیا ہو۔ یہ طرزِ عمل معاویہ ہی سے مخصوص ہے۔

امام حسنؑ معاویہ کے گھر میں

فتح مکہ کے موقع پر رسول اکرمؐ نے اعلان فرمایا تھا: "جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اُس کے لئے امان ہے۔" معاویہ رسول اکرمؐ کی اس مہربانی کا بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ اس نے امام حسنؑ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور امام نے یہ دعوت قبول کرلی۔ جب آپ معاویہ کے گھر میں داخل ہوئے تو عمرو بن عاص، ولید بن عقبہ، عقبہ بن ابی سفیان اور مغیرہ بن شعبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی اُن لوگوں نے آپ پر لعنت بھیجنا شروع کردی۔

امام حسنؑ نے کہا: معاویہ! یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ تمہاری طرف سے ہے۔ یہ چیز شروع کرنے والے تم ہی تھے اور اس عمل نے تمہاری فکر خام نے تمہارے اخلاق شوم سے جنم لیا ہے۔ بلاشبہ یہ تمام باتیں اس لئے ہیں کہ تم لوگ رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ سے عداوت رکھتے ہو۔

تم جو میرے والد بزرگوار کو برا کہہ رہے ہو قسم کھا کر بتاؤ کیا میرے والد نے دو قبلوں کی جانب نماز نہیں پڑھی تھی جبکہ تمہارے باپ کا اُن میں سے کسی پر بھی ایمان نہیں تھا۔ وہ نماز کو گمراہی کا سبب سمجھتا تھا اور جہالت کی وجہ سے لات اور عزیٰ کی پرستش کرتا تھا۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میرے والد نے دو بیعتیں کیں۔ ایک بیعت فتح اور دوسری بیعت رضوان جبکہ تمہارا ان میں سے ایک پر ایمان نہ تھا اور دوسری پر تم قائم نہ رہے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میرے والد سب سے پہلے ایمان لائے جبکہ تم اور تمہارا باپ ظاہری طور پر مسلمان تھے اور تمھیں **مؤلفۃ القلوب** کے لئے مخصوص مال میں سے حصہ دیا گیا۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جس شخص کو تم برا کہہ رہے ہو وہ جنگ بدر میں رسول اکرمؐ کا علمبردار تھا جبکہ مشرکین کا علم تمہارے اور تمہارے باپ کے ہاتھ میں تھا اور یہی صورت احد اور خندق میں بھی تھی۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ رسول اکرمؐ نے ابوسفیان پر سات مرتبہ لعنت بھیجی تھی؟

۱۔ جس دن رسول اکرمؐ تبلیغ کے لئے طائف جا رہے تھے اور ابوسفیان نے انھیں گالی دی اور دھمکی دی تھی۔
۲۔ جنگ بدر کے دن۔
۳۔ جنگ احد کے دن جب ابوسفیان نے "ہبل زندہ باد" کا نعرہ لگایا تو آنحضرتؐ نے ابوسفیان اور ہبل دونوں پر لعنت بھیجی۔
۴۔ جنگ خندق کے دن۔
۵۔ صلح حدیبیہ کے دن۔
۶۔ بیعت عقبہ کے دن۔
۷۔ جس دن وہ سرخ اونٹ پر سوار تھا۔

امام حسنؑ کی گفتگو ہمارے نکتہ نظر کی تائید کرتی ہے۔ معاویہ کا مقصد صرف حکومت کا حصول نہیں بلکہ حکومت کے ذریعے حق اور پیروان حق سے انتقام لینا تھا۔

عبداللہ بن جعفر اور معاویہ

ایک دن عبداللہ بن جعفر معاویہ کے پاس گئے تو دیکھا کہ عمرو بن عاص بیٹھا ہوا ہے۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ عمرو نے امام علیؑ کی شان میں گستاخی کی۔ جو کچھ اُس نے کہا وہ عبداللہ اور معاویہ دونوں نے سنا۔ عبداللہ کا چہرہ لال ہوگیا اور اُن کا بدن غصے سے کانپنے لگا۔ وہ لڑنے پر آمادہ ہوگئے اور اپنی آستینیں چڑھا کر معاویہ سے کہا: ہم کب تک تمہارے ہاتھوں طیش میں آئیں۔ خدا تمھیں غارت کرے۔ کیا تم مسلمانوں کے قتل کے بارے میں اپنا گھناؤنا کردار بھول گئے۔ کیا تم بھول گئے کہ تم امیرالمومنینؑ کے خلاف لڑے تھے؟ تمہاری ہٹ دھرمی کی مدت بہت طویل ہوگئی ہے اور اب تمھیں حق کی جانب لوٹنا چاہیے۔ تم ناانصافی اور گناہ کی دلدل میں پھنس گئے ہو اور تمہاری رہنمائی سیدھے راستے کی جانب کی جانی چاہیے اگر تم نے اپنے طور طریقے نہ بدلے تو ہم تمہاری بدعنوانیوں کی تشہیر کریں گے۔ تمہارے لئے لازم ہے کہ ہمارے سامنے اس بدزبانی سے باز رہو۔ جب تم اکیلے ہو تو جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ اس کی سزا تمھیں اللہ تعالیٰ دے گا۔

معاویہ خدائی نور کو سب وشتم کے ذریعے بجھانا چاہتا تھا تاہم اللہ کا نور بجھایا نہیں جاسکتا۔ یہ درخشاں وتاباں رہتا ہے خواہ مشرکین اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ امام علیؑ کی شہادت کے بعد بھی معاویہ اُن پر لعن کہلوانے سے باز نہ آیا تاریخ نے کروٹ لی تو لوگوں نے امام علیؑ کو نبیوں اور ولیوں جیسی عزت سے دیکھا بلکہ نصیریوں نے تو انھیں الوہیت کے مقام پر پہنچا دیا جبکہ معاویہ کے نام نے دنیا کے ظالموں اور قاتلوں کی فہرست میں جگہ پائی۔

امام اہل سنت حسن بصری کہتے ہیں کہ ”معاویہ کے چار کام ایسے ہیں کہ اگر کوئی ان میں سے ایک بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک اُس کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کرلینا درآنحالیکہ امت

میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے اُس کا اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنانا۔ تیسرے زیاد کا اپنے خاندان کے ساتھ استلحاق کرنا حالانکہ نبی اکرمؐ کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو اور زانی کو سنگسار کیا جائے اور چوتھے اُس کا حجر بن عدی اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کرنا۔ وائے ہو اُس پر حجر اور اُس کے ساتھیوں کے بارے میں۔“

امام شافعی فرماتے ہیں: ”حضرت علیؑ کے دوست اُن کی فضیلتیں خوف کے مارے چھپاتے ہیں اور اُن کے دشمن حسد اور بغض کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی فضیلتیں اتنی مشہور ہوگئی ہیں کہ انھوں نے مشرق اور مغرب کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔“

رفتہ رفتہ معاویہ کو اپنی خامیوں کا پتا چل گیا اور اُس نے جان لیا کہ اُس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے یہ وطیرہ بنا لیا کہ جب بھی کوئی شخص اُس کے سامنے بنی ہاشم کے فضائل بیان کرتا تو وہ کہتا: ”عثمانؓ کو مظلوم قتل کیا گیا۔“

ایک دن معاویہ گروہِ قریش کے پاس سے گزرا۔ ابن عباسؓ کے علاوہ باقی سب لوگ اُس کے آگے کھڑے ہوگئے۔ معاویہ نے کہا: اے عباسؓ کے بیٹے! عثمانؓ کو مظلوم قتل کیا گیا تھا۔ ابن عباسؓ نے کہا: عمر بن خطابؓ کو بھی مظلوم قتل کیا گیا تھا۔ معاویہ نے کہا: عمرؓ کو ایک کافر نے قتل کیا تھا۔ ابن عباسؓ نے پوچھا: عثمانؓ کو کس نے قتل کیا تھا؟ معاویہ نے کہا: اُسے مسلمانوں نے قتل کیا تھا۔ ابن عباسؓ نے کہا: لہٰذا تمہارے الفاظ کی کوئی قیمت نہیں (کیونکہ مسلمانوں نے عثمانؓ کا قتل جائز سمجھا جبکہ عمرؓ کا قتل جائز نہیں تھا۔ اس طرح قتل عثمانؓ، قتل عمرؓ سے کم تر ہے)۔

تعذیب اور کشت وخون

ایمان کی تعریف یوں کی گئی ہے: یہ دل میں یقین، زبان سے اقرار اور

اعضاء و جوارح سے عمل کا نام ہے۔ معاویہ کی رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ سے دشمنی کی بھی یہی صورت تھی کیونکہ اُس کا دل بغض سے بھرا ہوا تھا۔ وہ زبان سے لعنت بھیجتا تھا اور کہتا تھا کہ لعنت بھیجتے بھیجتے شیرخوار جوان ہو جائیں اور جوان بوڑھے ہو جائیں اور جہاں تک اس کے افعال کا تعلق ہے وہ خاندان رسولؐ کا خون بہانے اور ان پر ظلم و ستم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو عراق کا امیر مقرر کیا۔ چونکہ زیاد پہلے شیعہ[۱] تھا اس لئے تمام اہل تشیع کو جانتا تھا۔ چنانچہ اُس نے بڑی انھیں ان کی پناہ گاہوں سے

۱۔ زیاد بن سمیہ پہلے امام علیؑ کے ساتھ تھا۔ بسر بن ابی ارطات بھی کچھ عرصہ امام علیؑ کے ساتھ تھا۔ امام علیؑ کو کافر اور واجب القتل کہنے والے خوارج بھی پہلے آپ ہی کے لشکر میں تھے۔

زیاد بن سمیہ نے جب سعید بن سرح کو قتل کرنا چاہا تو سعید نے امام حسنؑ کے پاس پناہ لے لی۔ زیاد نے اس کا گھر ڈھا دیا، اُس کا سامان ضبط کرلیا اور اس کے بھائی اور بیوی کو قید کر دیا۔ امام حسنؑ نے زیاد کو خط لکھا:

امابعد! تو ایک مسلمان کی جان کے درپے ہے۔ اس کا حق بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسروں کا اور اس سے بھی دشمنی ایسی ہی ہے جیسی دوسروں سے۔ تو نے اُس کا گھر ڈھا دیا۔ اُس کا مال ضبط کرلیا اور اُس کی بیوی کو قید کر دیا۔ جیسے ہی تجھے میرا یہ خط ملے اُس کا گھر دوبارہ بنوا دے۔ اُس کا مال اور اُس کی بیوی واپس کر دے۔ اُس نے مجھ سے سفارش کی درخواست کی ہے اور میں نے اسے پناہ دیدی ہے۔

زیاد نے جواب میں لکھا: منجانب زیاد بن ابی سفیان بنام حسن بن فاطمہ (ع)۔

امابعد! تمہارا خط ملا۔ تم نے یہ خط اپنے نام سے شروع کیا ہے حالانکہ تم سائل ہو۔ میں حاکم ہوں اور تم رعیت۔ تم مجھے اس طرح حکم دیتے ہو جیسے کوئی حاکم اپنی رعایا کو حکم دیتا ہے۔ تم نے ایک فاسق کو پناہ دی ہے اور پھر مجھے خط لکھا ہے۔ اُس نے تم سے غلط کام کرایا اور تم نے بخوشی کر دیا۔ بخدا! تم اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھڑا سکتے چاہے وہ تمہاری کھال اور گوشت کے بیچ میں ہی کیوں نہ چھپ جائے۔ بہترین گوشت جو میں کھانا پسند کروں گا وہ تمہارا گوشت ہوگا۔ لہٰذا اسے اُس کے ہمسائے کے سپرد کردو جو اس کو رکھنے کے لئے تم سے زیادہ موزوں ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اگر میں اُس کا گناہ معاف کردوں گا تو یہ تمہاری سفارش کی وجہ سے نہیں ہوگا اور اگر میں اسے قتل کر دوں تو یہ تمہارے فاسق (نعوذ باللہ) باپ کی دوستی کی وجہ سے ہوگا۔

ڈھونڈھ نکالا۔ پھر اس نے انھیں ہراساں کیا، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے، اُن کی آنکھوں میں سلائی پھیر دیں، انھیں کھجور کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دی، جلاوطن کیا اور قتل کیا یہاں تک کہ عراق کے شیعہ اکابرین کا خاتمہ ہوگیا۔

معاویہ نے اپنے عاملوں کو لکھا: کسی شیعہ کی گواہی قبول نہ کرو اور اپنے نمائندے عثمانؓ کے حامیوں میں سے چنو۔ جو لوگ عثمانؓ کے فضائل بیان کریں ان کی مجالس میں شرکت کرو۔ جو روایات بیان کی جائیں اُن کا متن میرے پاس بھیج دو اور راوی کا اور اُس کے باپ کا نام بھی لکھ بھیجو۔

معاویہ نے اُن راویوں پر بہت پیسہ خرچ کیا۔ چونکہ یہ آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا اس لئے فضائل عثمانؓ کی روایات پھیل گئیں۔ لوگ انعام کے لالچ میں جعلی روایات گھڑنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے میں مصروف ہوگئے۔

معاویہ کا مراسلہ

معاویہ نے اپنے عاملوں کو لکھا کہ عثمانؓ کی تعریف میں روایات تمام شہروں میں پھیل چکی ہیں۔ جب یہ خط تمھیں ملے تو تمھیں چاہیے کہ یہ حکم دیدو کہ لوگ رسول اکرمؐ کے صحابہ اور حکام کے بارے میں گفتگو کریں۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ جو روایت علیؑ کی فضیلت کے بارے میں ہے اسی جیسی روایت خلفاء کے بارے میں بھی وضع کرلی جائے کیونکہ ایسی کارگزاری میری خوشی کا باعث ہوگی۔

معاویہ نے لوگوں کو قتل کیا، اُن کا مال اسباب لوٹا، اُن کی جائداد تباہ کی اور اللہ اور اُس کے رسولؐ سے غلط باتیں منسوب کیں۔ معاویہ کو یہ تمام چیزیں عدل و انصاف قائم کرنے اور خدا و رسولؐ کا وفادار رہنے کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوتی تھیں۔ معاویہ کے اس طرزِ عمل کی دو وجوہ تھیں۔

۱۔ وہ گناہ کو گناہ کی خاطر چاہتا تھا۔ وہ جھوٹ کو اُس کے جھوٹ ہونے کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔

۲۔ وہ رسول کریمؐ سے آپ کی رسالت کی بنا پر دشمنی رکھتا تھا اور آپ کی عترت طاہرہ سے نہایت برا سلوک کرتا تھا۔

تاہم قانون کو نظر انداز کرتے ہوئے معاویہ کا خط لکھنا جس میں قتل کرنے، قید کرنے، لوٹ مار کرنے، گھر تباہ کرنے اور لوگوں کو ذلیل کرنے کے بارے میں ہدایات دی گئی ہوں ایسی چیزیں ہیں جو امام علیؑ کے پیروؤں کے لئے روا رکھی گئیں اُن کا جرم یہ تھا کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ سے محبت ان کا سرمایہ ایمان تھا۔

معاویہ امام علیؑ کے دوستوں سے کہا کرتا تھا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم علیؑ سے بیزاری کا اعلان کرو اور اُس پر لعنت بھیجو اور عثمانؓ سے محبت کا اظہار کرو۔ جو کوئی امام علیؑ سے نفرت کا اظہار کرتا تھا وہ اپنی جان بچالیتا تھا اور جو امام سے محبت کا دم بھرتا تھا اسے قتل کر دیا جاتا تھا (حالانکہ عقیدے کی آزادی انسان کا ایک بنیادی حق ہے)۔

کیا معاویہ کو یہ علم نہیں تھا کہ امام علیؑ کا دین وہی تھا جو اُن کے چچا زاد بھائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا؟ پھر وہ لوگوں کو کیوں ایذائیں دیتا تھا اور قتل کرتا تھا؟ یہ تمام تعذیب اس لئے تھی کہ وہ خاندان رسالتؐ سے محبت کرتے تھے۔

جن لوگوں کو معاویہ نے قتل کرایا ان میں سے حجر بن عدی اور ان کے رفقاء اور عمرو بن حمق خزاعی، رُشید ہجری وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ مقتولین کی تعداد سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

مشرق اور مغرب کے غیر وابستہ ممالک جو U.N.O کے ممبر ہیں امریکا اور جنوبی افریقا میں نسلی امتیاز[1] کے خلاف متحد ہیں کہتے ہیں کہ نسلی امتیاز آزادی بشر سے ہم آہنگ نہیں حالانکہ یہ امتیازی سلوک چند معمولی باتوں کے سلسلے میں ہے مثلاً

۱۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی تھی جب جنوبی افریقا پر نسل پرستوں کی حکومت تھی اور سیاہ فام امریکی بھی نسلی بنیادوں پر شہری حقوق سے محروم تھے۔

سیاہ فام، سفید فام سے شادی نہیں کر سکتے اور سیاہ فام اسمبلیوں، یونیورسٹیوں، کلبوں، ہوٹلوں اور دوسری عوامی جگہوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔

حجر بن عدی

حجر بن عدی رسول اکرمؐ کے معاونین میں سے تھے۔ آپ امیرالمومنینؑ اور امام حسنؑ کے صحابی تھے۔ حجر ایک متقی اور دین دار شخص تھے۔ صاحب مستدرک نے لکھا ہے: حجر اصحاب محمدؐ میں راہب تھے۔ (صلح الحسنؑ، شیخ آل یاسین، ص ۳۲۴)

حجر بڑے بہادر انسان تھے۔ وہ اُس فوج میں شریک تھے جس نے شام اور قادسیہ کی جنگوں میں فتح پائی۔ وہ امام علیؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان میں موجود تھے۔ وہ امام علیؑ کی بدگوئی کرنے یا منبر سے اُن پر لعن کہنے کے لئے تیار نہ تھے۔ حجر اور اُن کے ساتھیوں پر کیا کیا بلائیں نازل نہیں ہوئیں۔ اُن میں سے چھ بہترین افراد قتل ہوئے۔ کئی کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ کئی کو زندہ درگور کر دیا گیا۔ حجر کے ساتھیوں میں سے ایک صیفی بن فسیل تھا۔ انھیں زیاد کے سامنے لایا گیا اور اُن دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

زیاد: اے دشمن خدا! تو ابوتراب کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

صیفی: میں ابوتراب کو نہیں جانتا۔

زیاد: تم اسے کس حد تک جانتے ہو؟

صیفی: میں اُسے بالکل نہیں جانتا۔

زیاد: کیا تم علیؑ بن ابی طالبؑ کو نہیں جانتے؟

صیفی: کیوں نہیں! میں انھیں جانتا ہوں۔

زیاد: وہی علیؑ ابوتراب ہے۔

صیفی: تمہاری بات درست نہیں ہے۔ وہ ابوالحسنؑ اور ابوالحسینؑ ہیں۔

زیاد نے حکم دیا کہ میری چھڑی لائی جائے۔ پھر اُس نے صیفی سے مخاطب ہو کر کہا: تم کیا کہتے ہو؟

صیفی نے کہا: جو الفاظ میں نے اللہ کے ایک مومن بندے کے بارے میں کہے ہیں وہ بہترین ہیں۔

زیاد نے حکم دیا کہ اُسے اس قدر پیٹا جائے کہ وہ زمین پر گر جائے اور پھر اٹھ نہ سکے۔ چنانچہ اسے مسلسل زد و کوب کرنے کے بعد زیاد نے کہا: تم علیؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

صیفی نے کہا: وَاللّٰہِ! لَوْ شَرَّحْتَنِیْ بِالْمُوْسٰی وَالْمَدٰی مَا قُلْتُ اِلَّا مَا سَمِعْتَ مِنِّیْ. خدا کی قسم! اگر تم میری کھال کھینچ لو تب بھی مجھے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا جو تم مجھ سے سن چکے ہو۔

زیاد نے کہا کہ تمھیں علیؑ پر لعنت بھیجنا ہوگی ورنہ میں تمھیں قتل کر دوں گا۔

صیفی نے کہا جتنی جلدی ہو سکے مجھے قتل کر دو کیونکہ میں علیؑ کو ہرگز برا نہیں کہوں گا۔[1]

ڈاکٹر طہٰ حسین لکھتے ہیں:

حجر ایک صالح مسلمان تھے۔ وہ اور اُن کا بھائی ہانی ایک قافلے کے ساتھ شامل ہوگئے جو رسول اکرمؐ کی خدمت میں آ رہا تھا اور انھوں نے آنحضرتؐ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حجر نے شام کی جنگ میں شرکت کی اور بہت تکالیف اٹھائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوج کے ہراول دستے میں تھے جو دمشق کے قریب مرج عذرا میں داخل ہوا۔ بعد میں معاویہ کے حکم سے انھیں اسی مقام پر قتل کیا گیا اور دفن کر دیا گیا۔ اس سفرِ جنگ کے بعد وہ عراق گئے اور ایران کی جنگ میں حصہ لیا اور بہت تکالیف اٹھائیں۔ کوفہ میں وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ وہ ایک

۱۔ ذخیرۃ الدارین، ص ۳۰۔

نیک دل انسان تھے اور دینی معاملات میں بے حد مخلص تھے۔ وہ لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے تھے اور برائیوں سے روکتے تھے۔ وہ عادل حکمران کو پسند کرتے تھے اور ظالم حکمران سے نفرت کرتے تھے۔ وہ امام علیؑ پر لعنت کرنے کی بنا پر بنی امیہ پر شدید نکتہ چینی کرتے تھے اور اُن کے اس مکروہ فعل کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتے تھے۔

زیاد بن سمیہ نے انھیں گرفتار کر لیا اور اُن کے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ انھیں معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ معاویہ نے حکم دیا کہ انھیں دمشق کے قریب مرج عذرا کے مقام پر قید کر دیا جائے۔ جب حجر کو پتا چلا کہ جس گاؤں میں انھیں نظر بند کیا گیا ہے وہ مرج ہے تو انھوں نے کہا: بخدا! میں پہلا مسلمان تھا جس پر گاؤں کے کتے بھونکے تھے اور میں پہلا مسلمان تھا جس نے اس مقام پر نعرہ تکبیر بلند کیا تھا۔ حجر کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پہلے مجاہد تھے جو اس علاقے میں آئے اور دشمنانِ اسلام کے خلاف لڑے۔

معاویہ نے حجر اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں یہ حکم دیا۔

وہ علیؑ سے لاتعلقی کا اظہار کریں اور اُس پر لعنت کریں اور عثمانؓ سے محبت کا اظہار کریں۔ ان میں سے جو بھی ایسا کرے اسے رہا کر دیا جائے اور جو یہ شرط ماننے سے انکار کرے اسے قتل کر دیا جائے۔

کچھ اشخاص نے معاویہ کے پاس اُن لوگوں کی سفارش کی۔ جب معاویہ نے اُن کی سفارش قبول کی اُس وقت قیدیوں کی تعداد آٹھ تھی جن سے کہا گیا کہ وہ امام علیؑ سے اظہارِ برائت کریں۔ اُن میں سے چھ نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا اور باقی دو نے کہا کہ انھیں معاویہ کے پاس لے جایا جائے تاکہ وہ اس کے سامنے حقیقتِ حال کا اظہار کر سکیں۔ ان کی درخواست قبول کر لی گئی۔ جہاں تک مذکورہ چھ آدمیوں کا تعلق ہے انھیں قتل کر دیا گیا چنانچہ یہ ان لوگوں کا پہلا گروہ تھا

جنھیں اذیتیں دی گئیں اور قتل کر دیا گیا۔ باقی دو آدمیوں کو معاویہ کے پاس لے جایا گیا۔ اُن میں سے ایک نے امام علیؑ سے لاتعلقی ظاہر کی لیکن دوسرے نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے معاویہ کے سامنے اس کے اور عثمانؓ کے بارے میں جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا کہا۔ معاویہ نے اسے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور حکم دیا کہ اسے بدترین طریقے سے قتل کیا جائے۔ زیاد نے اسے زندہ دفن کر دیا۔[1]

یہ کتنی پریشان کن بات ہے کہ مسلمانوں کا حاکم ان لوگوں کا خون بہائے جن کے خون کی اللہ نے ضمانت دی ہے اور اُن کی کوئی بات سنے بغیر اور انھیں صفائی کا موقع دیئے بغیر قتل کرا دے؟

ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے معاویہ کو لکھا کہ وہ اس کی حکومت کے وفادار ہیں اور اُن کا اسے دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تاہم جو کچھ انھوں نے کہا سب بے سود تھا۔

حجر کے قتل کا لوگوں پر بہت گہرا اثر ہوا۔ جب ربیع بن زیاد نے حجر کی داستان سنی تو وہ صدمہ سے جاں بحق ہوگیا۔

ابو اسحاق سبیعی سے پوچھا گیا: لوگ کب ذلیل ہوئے؟ اس نے کہا: جب امام حسنؑ نے رحلت فرمائی۔ جب زیاد معاویہ کا بھائی بنا اور جب حجر کو قتل کیا گیا۔

معاویہ بن خدیج نے کہا: کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہم "قریش کے لئے" لڑتے ہیں اور اُن کی سلطنت کی حفاظت کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ

۱۔ زیاد وہ شخص تھا جس نے کوفہ اور بصرہ میں شیعوں کو گرفتار کیا، اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھیریں اور تختۂ دار پر لٹکایا۔ (ابو الفتوح ج ۴، ص ۳۲۰ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱۱، ص ۱۴۴)

اسی خبیث نے سب سے پہلے اسلام میں قتل صبر یعنی ہاتھ پاؤں باندھ کر قتل کرنے کی روایت ڈالی اور محبت علیؑ کے جرم میں عبدالرحمن بن حسان کو بقول ابن خلدون اور ابن اثیر زندہ دفن کر دیا۔ (شفاء الصدور ج ۱، ص ۳۱۵)

ہمارے عم زادوں پر حملہ کرتے ہیں اور انھیں قتل کرتے ہیں۔

بی بی عائشہؓ نے کہا:

میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کچھ لوگ عذرا میں قتل کئے جائیں گے جس کے نتیجے میں اللہ اور آسمانی مخلوق ناراض ہوگی۔ چنانچہ میں نے حجر کے قتل کی بنا پر بغاوت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن پھر مجھے خوف ہوا کہ کہیں جنگ جمل کا واقعہ نہ دہرایا جائے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کہتے ہیں:

حجر کا قتل تاریخ کا انتہائی دردناک واقعہ ہے۔ معاویہ کے ہمعصر صالح افراد سمجھتے تھے کہ معاویہ اسلام کے لئے دردِ سر ہے۔ خود معاویہ بھی یہ سمجھتا تھا کہ وہ اسلام کے لئے دردِ سر بن گیا ہے اور اس پر فخر کرتا تھا۔

عمرو بن حمق خزاعی

عمرو بن حمق رسول اکرمؐ کے صحابی تھے۔ وہ فتح مکہ سے قبل اسلام لائے تھے۔ وہ آنحضرتؐ کے مقربین میں سے تھے۔ ان کے لئے آنحضرتؐ نے دعا فرمائی تھی کہ وہ اپنی جوانی کا لطف اٹھائیں۔ لہٰذا جب اُن کی عمر ۸۰ سال ہوگئی تب بھی ان کے بال سفید نہیں ہوئے۔ امیر المومنین امام علیؑ نے ان کے لئے دعا فرمائی تھی: اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قَلْبَهٗ بِالتَّقْوٰی وَاھْدِهٖ اِلٰی صِرَاطِکَ الْمُسْتَقِیْمِ "اے پروردگار! عمرو کے تقویٰ کی بنا پر اس کا دل روشن کر دے اور اس کی رہنمائی تیرے سیدھے راستے کی جانب فرما۔"

زیاد جب کوفہ کا گورنر بنا تو اُس نے عمرو کو بلوا بھیجا لیکن وہ روپوش ہوگئے۔ اُن کی تلاش جاری رہی اور ان کی بیوی آمنہ بنت شرید کو گرفتار کرلیا گیا۔ بالآخر زیاد کے کارندوں نے عمرو کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ اسلام میں پہلی مرتبہ زیاد نے اُن کے

سر کی جگہ جگہ نمائش کی اور پھر معاویہ کے پاس بھیج دیا معاویہ نے دریا دلی اور رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عمرو کا سر اُن کی قیدی بیوی کے پاس بھجوا دیا اور وہ اُس کی گود میں پھینکا گیا۔ آمنہ نے اپنا ہاتھ عمرو کی پیشانی پر رکھا، اُن کے ہونٹ چومے اور کہا: ''تم نے ایک طویل مدت تک اُسے مجھ سے چھپائے رکھا اور اب اُس کا جسم تحفے کے طور پر لائے ہو۔ اللہ کی رحمت ہو عمرو پر جو میرے پاس بطور تحفہ آیا ہے۔ اُس نے نہ کبھی مجھے طیش دلایا اور نہ کبھی میرے ہاتھوں طیش میں آیا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یزید اپنے باپ معاویہ کی مانند تھا۔ یزید نے امام حسینؑ کا سر کاٹا اور اُن کے بیوی بچوں کے سامنے مختلف شہروں میں اس کی نمائش کی تاکہ انھیں زیادہ دکھ پہنچے۔ معاویہ نے عمرو کا سر مختلف شہروں میں پھرایا اور پھر اس کی بیوی کی گود میں پھنکوایا تاکہ اُس کا غم بڑھے۔

رُشید ہجری

رشید امام علیؑ کے لائق شاگردوں میں سے تھے۔ زیاد نے ان سے کہا کہ وہ امام علیؑ سے برأت کا اظہار کریں اور ان پر لعنت بھیجیں۔ ان کے انکار پر زیاد نے اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انھیں سولی دیدی۔

جویریہ بن مسہر عبدی

زیاد نے جویریہ کو گرفتار کیا، اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور انھیں کھجور کے درخت کی شاخ پر لٹکا دیا حتیٰ کہ اُن کی موت واقع ہوگئی۔ معاویہ نے جو مظالم ڈھائے اور بے گناہ لوگوں کو قتل کیا یہ اُس کی چند مثالیں ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ جو راوی سب چین ہے لکھتا ہے وہ صحیح نہیں۔

قیدی اور قید خانے

شیعوں کو قتل کرنے، اُن کے اعضاء کاٹنے، انھیں سولی دینے اور زندہ دفن

کرنے کے علاوہ معاویہ نے اتنے شیعہ مرد و زن قید کئے کہ قید خانے بھر گئے۔ وہ اپنے بغض کی آگ بجھانے کے لئے اُن قیدیوں سے ملاقاتیں بھی کیا کرتا تھا تاہم شیعہ قیدی ایسی باتیں کرتے تھے جن کی وجہ سے اُس کی کینے کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھتی تھی۔

مسعودی مُرُوجُ الذھب میں لکھتا ہے:

معاویہ نے صعصعہ بن صوحان اور عبد اللہ بن کواء جیسے امام علیؑ کے کچھ حامیوں اور کچھ قریشی سرداروں کو قید کر رکھا تھا۔ ایک دن وہ قید خانے میں آیا اور قیدیوں سے کہنے لگا: میں کیسا خلیفہ ہوں؟ ابن کواء نے کہا: تمہاری مادی دنیا وسیع ہے لیکن تمہاری آخرت سخت ہے۔ تم نے تاریکی کو روشنی میں اور روشنی کو تاریکی میں بدل دیا ہے۔ وہ کیسا خلیفہ ہوگا جو لوگوں پر زبردستی حکومت کرے اور اپنے غرور کی وجہ سے ان کی نظروں سے گر جائے اور مکر و فریب کے ذریعے اقتدار حاصل کرے بخدا! روز بدر تم میدان میں نہ تھے۔ تم اور تمہارا باپ رسول اللہؐ کے اُن دشمنوں میں سے تھے جو قافلے میں تھے اور بھاگ نکلے تھے۔ تمہارے دادا اور باپ کو رسول اللہؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ کیا ایک ایسا شخص خلافت کے لائق ہے؟ (ج ۳، ص ۴۹، طبع ۱۹۴۸ء)

معاویہ نے اللہ کے صالح بندوں کو قید کیا، قتل کیا، جلاوطن کیا، اُن کے اعضاء کاٹے اور انھیں زندہ جلا دیا۔ اُس نے یہ سلوک امام علیؑ کے دوستوں کے ساتھ اُس وقت کیا جب وہ اُس کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ اس کے باوجود کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ معاویہ نرم دل اور کریم النفس تھا۔ جارج جرداق نے اپنی کتاب الامام علیؑ میں ''معاویہ اور اُس کے جانشین'' کے عنوان کے تحت اس قول کا جواب دیا ہے۔ ہم اس کتاب سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

''ایک طرف تو معاویہ اتنا مہربان تھا کہ اس نے مصر اور مصری عمرو عاص کو

بخش دیے تھے۔ دوسری طرف وہ اتنا نامہربان تھا کہ اُس نے مصر اور مصریوں سے جینے کا حق بھی چھین لیا تھا... اگر اسی چیز کا نام مہربانی ہے تو ہر خون مہربانی ہے۔

جب آدمی معاویہ کے طرز حکومت کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ قید کرنا، قتل کرنا، سزائیں دینا معاویہ اور اُس کے تربیت شدہ فرزندوں کا کام ہے۔ قتل و غارت اور دھونس دھاندلی اس کی بنیادی پالیسی تھی جس میں دلکش وعدے کرنا، لالچ دینا، نیک لوگوں کو قتل کرنا، بدمعاشوں کی عزت افزائی کرنا، جھوٹا پروپیگنڈا کرنا اور بدکردار لوگوں سے مدد طلب کرنا شامل ہے۔

معاویہ کی شخصیت پر ابوسفیان کی سرشت کی گہری چھاپ تھی۔ اُس کی فطرت پر اُس کی ماں ہند کا بھی گہرا اثر تھا چنانچہ دونوں نے اس کی سرشت اور عادات کو ڈھالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

شیعہ عقیدے کے لئے معاویہ کی خدمات

قرآن و حدیث کی بنیاد پر شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اہل بیت رسولؐ سے محبت اور اُن کی اطاعت واجب ہے اور اُن کے دشمنوں سے بیزاری ضروری ہے۔ شیعہ علماء نے اس خاندان کے فضائل کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی ہیں تاہم قرآن و حدیث اور شیعہ عقیدے کی ترویج کے لئے لکھی گئی کتابیں اتنی مؤثر ثابت نہیں ہوئیں جتنی معاویہ کی پالیسیاں جو شیعہ عقیدے کی اشاعت اور مضبوطی کا سبب بن گئیں۔

بنی امیہ کے جرائم ہزارہا کتابوں سے زیادہ مؤثر تھے۔ وہ امیر المومنینؑ کا حق ثابت کرنے کے لئے ہزاروں دلائل سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوئے۔ اثبات حق کے لئے علمی اور منطقی تحریریں اتنی مؤثر نہیں ہوتیں جتنے تاریخی واقعات ہوتے ہیں کیونکہ تاریخی واقعات تجربوں کی مانند ہیں جن کے نتائج ناقابل تردید ہوتے ہیں۔

معاویہ کے زمانے میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک دنیا پرست آدمی تھا جبکہ امام علیؑ ایک ملکوتی شخصیت تھے۔ ایک پرانی کہاوت ہے کہ بدی سے تقابل کرنے پر نیکی کا پتا چلتا ہے۔

معاویہ نے کہا: میں نے اہل کوفہ پر حکومت کرنے اور اُن کے اموال پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ کی تھی۔ میری لڑائی نماز، روزے کے لئے نہیں تھی۔ اس بیان کا مقابلہ امام علیؑ کے اس جملے سے کیجیے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ امام نے اپنے جوتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ابن عباسؓ سے فرمایا تھا: ”میری نگاہ میں یہ جوتا حکومت سے بہتر ہے مگر یہ کہ اس کے ذریعے میں ایک حق کی حفاظت کروں اور اسے حقدار تک پہنچادوں اور باطل کو روکوں۔

معاویہ نے علیؑ و اولاد علیؑ کا نام لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دینے اور لوگوں کو عثمانؓ اور بنی امیہ سے دوستی کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اس مقصد کے لئے لوگوں کو قتل کیا، اُن پر مظالم ڈھائے اور اسے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور مہارت خیال کیا تاہم اس پالیسی کا نتیجہ اس کی خواہشات کے برخلاف نکلا اور وہ زمانہ بھی لد گیا۔ اب بنی امیہ کا نام ظلم، فساد، فریب، لوٹ مار اور قتل و غارت کا استعارہ بن گیا ہے جبکہ امام علیؑ کا نام ہدایت، سچائی اور مظلوموں کی حمایت کی پہچان ہے۔

عبداللہ بن عروہ بن زبیر نے اپنے بیٹے سے کہا تھا: ”دین کی جانب توجہ دو کیونکہ دنیا جو کچھ تعمیر کرتی ہے دین اُسے تباہ کر دیتا ہے لیکن جب دین کو بنیاد بنایا جاتا ہے تو دنیا اسے تباہ نہیں کر سکتی۔ علیؑ ابن ابی طالبؑ کو ہی دیکھ لو۔ بنی امیہ نے اُن کی جتنی بدگوئی کی وہ اتنے ہر دلعزیز بن گئے۔“

بخدا! بنی امیہ کا اپنے مردوں کے لئے رونا اور شاعروں کا اُن کی خاطر مرثیے کہنا ایک گلی سڑی نعش کا ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین اپنی کتاب علیؑ و بنوہ میں لکھتے ہیں:

کوئی چیز آمریت کی طرح نظریات کو پروان نہیں چڑھاتی اور لوگوں کو مخالفین کے نظریات کی پیروی کرنے پر آمادہ نہیں کرتی جتنا خود آمریت کرتی ہے کیونکہ آمریت قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں کو مظلوموں کی طرف موڑ دیتی ہے اور اُن کی حمایت کا سبب بن جاتی ہے۔ نظریات لوگوں کو بڑی شدت سے اپنی جانب کھینچتے ہیں اور آمروں کے جرائم کے مقابلے میں زیادہ قوت حاصل کر لیتے ہیں (اور بالآخر نظریات جیت جاتے ہیں)۔

اس بیان کی روشنی میں معاویہ کی بیس سالہ حکومت میں شیعوں نے اپنے نظریات اسلامی سلطنت کے مشرق و مغرب میں پھیلائے۔ جب معاویہ کی موت ہوگئی تو عراق کے تمام باشندے اور بیشتر مسلمان بنی امیہ سے دشمنی اور علیؑ و اولادِ علیؑ سے دوستی رکھتے تھے۔ بلاشبہ شیعہ عقیدہ اہل بیتؑ سے دوستی اور بنی امیہ سے دشمنی پر مبنی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی بنیاد معاویہ نے رکھی۔ ایسے ہتھکنڈوں کے ذریعے جن سے وہ شیعہ عقیدے کو کچل دینا چاہتا تھا اُس نے خود شیعہ عقیدہ ساری مملکت میں پھیلایا۔ معاویہ دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن شیعہ عقیدہ اور علیؑ کا خاندان باقی رہا اور انشاء اللہ تاابد باقی رہے گا۔ اگر ظلم کے لئے شکر گزار ہونا جائز ہوتا تو ہم معاویہ بن ہند کے اُن جرائم کے لئے شکر گزار ہوتے جو شیعہ عقیدے کی پیشرفت کا موجب بن گئے۔

مسلمانوں میں نااتفاقی کا ذمے دار کون؟

شیعوں کے بارے میں معاویہ کی پالیسی کی مثالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نااتفاقی کا ذمے دار کون ہے؟ مسلمانوں کے شیعہ اور سنی میں تقسیم ہو جانے کا باعث کون بنا؟ کیا یہ شیعہ تھے یا اہل سنت کے نامی گرامی افراد یا پھر ظالم حکمران جنھوں نے عوام کی آزادی سلب کی، اُن کا خون بہانا جائز

قرار دیا اور اپنے بعد آنے والے جابر حکمرانوں کے لئے اہل بیتؑ اور ان کے پیروؤں پر ظلم ڈھانے کی بنیاد رکھی؟

اصحاب رسولؐ پر منبر سے لعنت کرنے کی ابتدا کس نے کی؟ وہ کون تھا جس نے اپنے دور میں حضرت علیؑ پر لعنت بھیجنے کا حکم دیا حتیٰ کہ بچے جوان اور جوان بوڑھے ہوگئے؟ وہ کون تھا جس نے نازیبا زبان استعمال کرنے اور دشنام دینے والوں کو انعامات سے نوازا؟ وہ کون تھا جس نے لعنت نہ کرنے والوں کو جلاوطن کیا یا قتل کر دیا؟ وہ کون تھا جس نے زمین کے چپے چپے کو خوف و ہراس سے بھر دیا تھا؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف سے بتائیے کیا یہ تمام جرائم شیعوں نے کئے ہیں؟

(وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى)

بڑی سادگی سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمیں ان جھگڑوں اور جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم مرے ہوؤں کے اعمال پر بحث کیوں کریں جبکہ اُن کی ہڈیاں بھی مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہوگئی ہیں۔ اس کے برعکس ہمیں زندہ لوگوں کے بارے میں گفتگو کرنی چاہیے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ "صحیح ہے کہ ہمیں مُردوں کو دفن ہی رہنے دینا چاہیے اور ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد اور تعاون کرنا چاہیے لیکن مشکل یہ ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کے جرائم کی علامات ابھی تک دلوں میں باقی ہیں جو اپنے اثرات ظاہر کرتی رہتی ہیں اور" مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا" کے بمصداق ان کے اقوال سے آج بھی دلائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کے پیروکار جب اپنی بات کو دلیل و برہان سے ثابت نہیں کر سکتے تو وہ اتحاد، تعاون اور بھائی چارے کی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن جب انھیں شیعوں پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ لگتا ہے تو انھیں اتحاد اور تعاون سب بھول جاتا ہے۔ تعاون اور اتحاد کے معنی یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی بھلائی کے لئے کام کیا جائے لیکن اگر نیت یہ ہو کہ ہر شخص اپنے فائدے کو پیش نظر رکھے تو یہ اتحاد اور تعاون نہیں بلکہ دشمنی اور کم نظری ہے۔

یزید کی سرگرمیاں

اگر یزید کی سہ سالہ حکومت میں معاویہ زندہ ہوتا تو اُس کی کارکردگی کی داد دیتا۔ پہلے سال میں اُس نے فرزند رسول امام حسینؑ کو قتل کیا۔ اُن کے بچوں اور ساتھیوں کے سر کاٹے اور اُن کے اہل حرم کو اسیر کیا۔

دوسرے سال میں اُس نے اپنے سپاہیوں کو مدینہ میں من مانی کرنے کی اجازت دی جس کے نتیجے میں ایک ہزار سے زائد کنواری لڑکیوں کو بے آبرو کیا گیا اور ہزار آدمیوں کو قتل کیا گیا جن میں سات سو اصحاب رسولؐ تھے۔

تیسرے سال میں اُس نے منجنیقوں کے ساتھ خانۂ کعبہ پر حملہ کیا۔ اگر معاویہ زندہ ہوتا اور اپنے بیٹے کو یہ سب کچھ کرتے دیکھتا تو اُس کی پیشانی چوم لیتا اور کہتا کہ تم واقعی میرے بیٹے ہو۔

یزید نے فقط انھیں جرائم پر اکتفا نہیں کیا جن کا ارتکاب اُس نے کربلا، مدینہ اور مکہ میں کیا۔[1] اُس نے عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کا امیر بنایا تا کہ وہ شیعوں پر وہ

۱۔ کربلا کے بعد سخت المناک واقعہ جنگ حرہ کا تھا جو ۶۳ھ کے آخر اور خود یزید کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا۔ اس واقعے کی مختصر روداد یہ ہے کہ اہل مدینہ نے یزید کو فاسق و فاجر اور ظالم قرار دیکر اُس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اُسکے عامل کو شہر سے نکال دیا اور عبداللہ بن حنظلہ کو اپنا سربراہ بنالیا۔ یزید کو یہ اطلاع پہنچی تو اُس نے مسلم بن عقبہ المری کو (جسے سلف صالحین مسرف بن عقبہ کہتے تھے) ۱۲ ہزار فوج دیکر مدینہ پر چڑھائی کے لئے بھیج دیا اور اُسے حکم دیا کہ تین دن تک اہل شہر کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے رہنا۔ پھر اگر وہ نہ مانیں تو اُن سے جنگ کرنا اور جب فتح پالو تو تین دن کے لئے مدینہ کو فوج پر مباح کر دینا۔ اس ہدایت پر یہ فوج گئی۔ جنگ ہوئی۔ مدینہ فتح ہوا اور اُس کے بعد یزید کے حکم کے مطابق تین دن کے لئے فوج کو اجازت دیدی گئی کہ شہر میں جو کچھ چاہے کرے۔ ان تین دنوں میں شہر کے اندر ہر طرف لوٹ مار کی گئی۔ شہر کے باشندوں کا قتل عام کیا گیا جس میں امام زہری کی روایت کے مطابق سات سو معززین اور دس ہزار کے قریب عوام مارے گئے اور غضب یہ ہے کہ وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔
(خلافت و ملوکیت از مولانا مودودی، ص ۱۸۲)

مظالم دوبارہ ڈھائے جو اُس کے باپ زیاد نے ڈھائے تھے۔

ابن زیاد نے لوگوں کو قید کیا، جلاوطن کیا، قتل کیا، پھانسی دی اور اُن کے اعضاء کاٹے۔ اُس نے امام علیؑ کے شاگرد رشید اور دوست میثم تمار سے کہا: علیؑ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی پر لٹکا دوں گا۔ اس دھمکی کے جواب میں میثم نے امام علیؑ کی تعریف کی اور ابن زیاد اور بنی امیہ پر لعنت بھیجی۔ ابن زیاد نے اُن کی زبان، ہاتھ اور پاؤں کاٹ کر سولی پر لٹکا دیا یہاں تک کہ اُن کا دم نکل گیا۔

اس سے بڑا جرم اور کیا ہوسکتا تھا کہ ابن زیاد نے کربلا کی جنگ کے سلسلے میں ابن سعد کو لکھا: ''حسینؑ کو گھیر لو تا کہ تم اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو قتل کرسکو اور اُس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے کردو کیونکہ وہ قتل کئے جانے کے لائق ہے۔ جب تم حسینؑ کو قتل کر چکو تو اُس کی لاش کو گھوڑے دوڑا کر پامال کردو کیونکہ وہ ایک ظالم شخص ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک آدمی کے مر جانے کے بعد اُس کی لاش پر

اس ظلم عظیم کے باوجود ڈاکٹر ذاکر نائیک Peace TV پر ۲ر دسمبر ۲۰۰۷ء کے ایک پروگرام میں یزید کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے سے نہیں شرمائے۔

اسی طرح مصر کے شیخ خضری تاریخ امۃ الاسلامیہ کے صفحہ ۱۵۷ پر لکھتے ہیں:
"بلاشبہ حسین (ع) نے (یزید کے خلاف) خروج کرکے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ انھوں نے وحدت امت کی بنیادوں کو ہلا دیا جس سے امت ایسے اختلاف اور افتراق کے جنجال میں پھنس گئی کہ آج تک نکل نہیں سکی۔"

اسی لئے علامہ مغنیہ کا یہ کہنا بعید از فہم نہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کے جرائم کی علامات ابھی تک دلوں میں باقی ہیں اور اپنے اثرات ظاہر کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کون حسینی کیمپ میں ہے اور کون یزیدی کیمپ میں۔

ہر ایک یزید کی گردن میں ڈالنے کے لئے
ابھی بچے ہوئے لعنت کے ہار باقی ہیں
ہمارا اُن سے کبھی فیصلہ نہیں ہوگا
یزید مر گیا کچھ رشتے دار باقی ہیں

گھوڑے دوڑانے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے عہد کر رکھا ہے کہ اگر میں اُسے قتل کر دوں تو اس کے ساتھ ایسا ہی کروں گا۔ اگر تم میرے احکام کی تعمیل کروگے تو تمھیں جاننا چاہیے کہ جو لوگ میرے فرمانبردار ہوں میں انھیں بھاری انعام دیتا ہوں اور اگر تم ایسا نہیں کرسکتے تو پھر تم فوج کی کمان شمر بن ذی الجوشن کے سپرد کردو۔ میں نے اُسے ضروری ہدایات دیدی ہیں۔"

ابن زیاد نے جو ہدایات شمر بن ذی الجوشن کو دیں اُن میں امام حسینؑ کے علاوہ اُن کے چھوٹے بڑے حتیٰ کہ شیر خوار بچوں تک کو قتل کرنا شامل تھا تاکہ امام علیؑ کی نسل ختم ہو جائے۔

یزید و معاویہ کے درمیان اور ابن زیاد و زیاد کے درمیان پوری ہم آہنگی تھی کیونکہ اُن کے جرائم کا سرچشمہ صرف ایک چیز تھی یعنی خدا و رسولؐ سے عداوت۔ اُن میں سے ہر ایک نے حسب حوصلہ اس عداوت کا اظہار کیا۔ اُن لوگوں میں فقط ناموں کا فرق تھا ورنہ اعمال کے لحاظ سے وہ سب یکساں تھے۔

یزید نے ۳ سال ۷ ماہ اور ۲۲ دن حکومت کی۔ تاریخ میں اُس کے ایسے خوفناک جرائم درج ہیں جن کی بنا پر اُس کا دور حکومت قیامت تک مسلمانوں کی تاریخ میں کلنک کا ٹیکہ بنا رہے گا۔

کیا ہم خون حسینؑ کو بھلا سکتے ہیں؟ کیا اُس خون کو بھول جانا ممکن ہے جو تمام ادوار میں جوش کھاتا ہے اور تازہ رہتا ہے؟ مفتی موصل شیخ عبیدی کے بقول "حسینؑ کی شہادت اسلام کی جڑ کے ساتھ پیوست ہوگئی ہے اور ناقابل فراموش ہے۔"

مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ "لوگوں سے یزید کے لئے بیعت لے لو اور اسے اپنا ولی عہد بنا دو۔" پھر اُس نے کہا:

"میں نے معاویہ کا پاؤں ایک ایسی رکاب میں ڈال دیا ہے جو مسلمانوں کے لئے مضر ہے اور میں نے مسلمانوں کے درمیان ایسا رخنہ ڈال دیا ہے جس کا مداوا کبھی نہیں ہو سکے گا۔"

معاویہ دوم

اپنی موت سے پہلے یزید نے لوگوں سے اپنے بیٹے معاویہ کے لئے بیعت لی اور اُسے اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ تاہم اپنے باپ کے مرنے کے بعد معاویہ بن یزید نے خلافت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔

ابو محاسن اپنی کتاب النجوم الظاہرہ ج ۱، ص ۱۶۴ (طبع اول ۱۹۲۹ء) میں لکھتا ہے کہ یزید کے بیٹے معاویہ دوم نے منبر پر جا کر حمد و ثناء کے بعد کہا:

"اے لوگو! میرے دادا نے خلافت کے لئے اُن سے جھگڑا کیا جو رسول اکرمؐ سے قرابت کی بنا پر خلافت کے حقدار تھے۔ انھوں نے علیؑ کا حق غصب کیا۔ جب تک وہ زندہ رہے انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو تم جانتے ہو حتیٰ کہ وہ دنیا سے گزر گئے اور اپنے اعمال و کردار کا بوجھ لئے تنہا قبر میں دفن کر دیئے گئے۔ میرے دادا کے بعد میرے باپ نے خلافت غصب کی حالانکہ وہ اس کے اہل نہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی نفسانی خواہشات میں گزاری یہاں تک کہ موت نے انھیں آلیا اور وہ بھی گناہوں کا بوجھ اٹھائے قبر میں تنہا دفن کر دیئے گئے۔"

یہ کہہ کر وہ بہت رویا۔ پھر کہنے لگا: "میری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ میرے باپ کا انجام برا ہے۔ اُس نے رسول اکرمؐ کی اولاد کو قتل کیا، اپنے سپاہیوں کے لئے مدینہ کو حلال کیا اور خانہ کعبہ کو نقصان پہنچایا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ایسے ناپسندیدہ کام کروں۔ میں اختیار تمھیں منتقل کرتا ہوں۔ تم جسے چاہو میری جگہ منتخب کرلو۔"

اُس کی ماں نے کہا: "کاش تم میرے حیض کا ایک ٹکڑا ہوتے اور میرے بدن سے خارج ہوگئے ہوتے۔" (یعنی کاش کہ تم پیدا ہی نہ ہوتے) معاویہ دوم نے کہا: "کاش ایسا ہی ہوتا کیونکہ حیض ہونا یزید، معاویہ اور ابوسفیان کے ساتھ منسوب ہونے سے بہتر ہے۔"

اس کے بعد معاویہ دوم زیادہ دن زندہ نہیں رہا۔ بعض کا کہنا ہے کہ چونکہ اُس نے اپنے باپ اور دوسرے بنی امیہ کی طرح اولاد علیؑ اور شیعیان علیؑ کو ایذائیں نہیں دیں اور اُن کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے اس لئے اسے زہر دیدیا گیا۔[۱]

معاویہ بن ابی سفیان کا پوتا کہتا ہے کہ میرے دادا نے خلافت کے لئے اس سے جھگڑا کیا جو آفتاب نبوت کا قریب ترین رشتے دار، سابق الاسلام، اکابر مہاجرین میں باعزت، سب سے دلیر، صاحب علم وفضل، نبی کا ابن عم اور داماد تھا اس کے باوجود بھی بنی امیہ کے نمک خوار اس "بغاوت" کو خطائے اجتہادی گردانتے ہیں۔ بقول مرزا غالب

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

۱۔ اُس کے اتالیق کو بھی بعدازاں زندہ دفن کر دیا گیا کیونکہ بنی امیہ کا خیال تھا کہ معاویہ دوم نے یہ سب کچھ اپنے اتالیق سے متاثر ہو کر کیا ہے۔ اگرچہ اتالیق نے بھی اُسے متاثر کیا ہوگا لیکن لگتا ہے کہ دو کنیزوں کی گفتگو زیادہ موثر ثابت ہوئی تھی۔ معاویہ نے ایک کنیز کو یہ کہتے ہوئے سنا "دنیا کے حاکم حسن پرست ہوتے ہیں۔ چونکہ میں حسین ہوں اس لئے میں اُن پر حکومت کرتی ہوں۔" دوسری کنیز نے کہا: حکومت کا کیا فائدہ؟ اگر حاکم رعایا کی حالت پر دکھی ہو تو وہ ایک دن بھی خوش نہیں رہ سکتا اور سیر ہو کر کھا بھی نہیں سکتا۔ اگر وہ قوم کو چھوڑ دے اور عیش ونوش میں پڑ جائے تو اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ لہٰذا حکمران یا تو دنیا کی طرف توجہ دیتے ہیں یا آخرت کا خیال رکھتے ہیں۔" کنیز کی یہ بات سن کر معاویہ کو ایسا ہوش آیا کہ اُس نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ (تتمة المنتهى ج ۱، ص ۷۲)

بنی مروان

یزید کی موت کے بعد اسلامی حکومت ابوسفیان کی اولاد سے مروان کو منتقل ہوگئی۔ اُس نے نو مہینے حکومت کی۔ چونکہ ان نو مہینوں میں اُسے ایک طرف ابوسفیانیوں سے اور دوسری طرف ابن زبیر سے جنگیں لڑنی پڑیں اس لئے اسے شیعوں پر ظلم کرنے کا موقع نہ مل سکا مگر اس مختصر مدت میں اُس نے معاویہ اور یزید کی پالیسیاں جاری رکھیں۔ منبروں پر سے امام علیؑ پر لعنت جاری رہی۔ اُس نے ابن زیاد، حُصین بن نمیر اور شرجیل بن ذی الکلاع جیسے خبیث افراد کو پناہ دی اور انھیں اسلحے سے لیس کیا تاکہ وہ توابین سے لڑسکیں۔ (اُن میں سلیمان بن صرد خزاعی مسیب بن نجبہ فزاری اور عبداللہ ازدی جیسے شیعہ سردار شامل تھے) توابین کی تعداد پانچ ہزار تھی اور وہ امام حسینؑ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اٹھنے والا پہلا گروہ تھا۔ تاہم وہ یا تو قتل ہوگئے یا گرفتار کر لئے گئے۔

مروان کا بیٹا عبدالملک اُس کا جانشین بنا۔ عبدالملک نے شام کی اور ابن زبیر نے حجاز کی حکومت سنبھالی۔ انھوں نے عراق پر قبضے کے لئے آپس میں خونریز جنگیں لڑیں۔ تاہم جہاں تک امام علیؑ کے پیروؤں کو قتل کرنے اور ایذائیں دینے کا تعلق ہے دونوں نے سابقہ پالیسی جاری رکھی۔ عبدالملک اور اُس کے باپ مروان نے توابین کو قتل کرنے میں ابن زیاد کی مدد کی اور ابن زبیر نے مختار اور اُس کے ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

ابن زبیر

مسعودی مُروجُ الذہب میں لکھتا ہے کہ مصعب بن زبیر نے مختار[1] اور اُن کے ساتھیوں کا جن کی تعداد سات ہزار تھی خاتمہ کر دیا۔ یہ لوگ امام حسینؑ کے خون کا انتقام لینے کا دعویٰ کرتے تھے۔

مصعب بن زبیر نے مختار کو قتل کر دیا اور اُس کی عورتوں کو گرفتار کر کے اُن سے کہا: "تمھیں مختار سے لاتعلقی کا اعلان کرنا ہوگا۔" دو عورتوں کے سوا باقی سب نے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ اُن دونوں نے کہا کہ "ہم مختار سے برأت کا اظہار نہیں کریں گی کیونکہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا تھا، روزے رکھتا تھا اور تہجد پڑھتا تھا۔ اُس نے قاتلان حسینؑ کو قتل کر کے اپنا خون خدا و رسولؐ کی راہ میں بہایا اور یوں لوگوں کے دل خوش کیے۔"

مصعب نے اپنے بھائی عبد اللہ بن زبیر کو ایک خط لکھا جس میں ان عورتوں کے دعوے کا ذکر کیا۔ عبد اللہ نے جواب میں لکھا کہ اگر وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ مصعب نے تلوار ہاتھ میں لے کر اُن سے بات کی۔ اُن میں سے ایک نے مختار سے بیزاری ظاہر کی لیکن دوسری نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے شہادت منظور ہے لیکن میں اپنی بات پر قائم ہوں۔

"میں جانتی ہوں کہ میں قتل کر دی جاؤں گی اور بہشت میں رسول اکرمؐ اور اُن کے اہل بیتؑ کی خدمت میں حاضری دوں گی۔ بخدا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ہند کے بیٹے کو قبول کرلوں اور علیؑ کو چھوڑ دوں۔ اے پروردگار! تو گواہ رہنا کہ میں تیرے رسولؐ اور اُن کی بیٹی کے بیٹے اور اہل بیتؑ کی شیعہ ہوں۔"

۱۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جناب مختار ثقفی نے خون حسینؑ کا انتقام لینے کے لیے خروج کیا تھا اس لئے علمائے اہل سنت آج تک ان کی کردار کشی میں معروف ہیں۔ ابن تیمیہ نے تو مختار کو زندیق کہا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، باب البغاۃ ج ۲۷)

مصعب بن زبیر نے اُسے قتل کر کے شہیدوں میں شامل کر دیا۔ ابن زبیر بنی امیہ کا دشمن تھا لیکن اُس کی دشمنی دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لئے تھی۔ اُس نے اس غرض سے خونریز جنگیں لڑیں جس کے نتیجے میں دس ہزار آدمی کھیت رہے۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے دونوں اُس میں یکساں تھے۔ بنی امیہ منبروں سے علیؑ پر لعنت بھیجتے تھے اور ابن زبیر نے بھی یہ لعنت بھیجی۔

ایک دن جناب محمد بن حنفیہ کو معلوم ہوا کہ ابن زبیر منبر سے امیر المومنینؑ کی بدگوئی کر رہا ہے۔ محمد بن حنفیہ مسجد میں پہنچے اور انھوں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا:

يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ! شَاهَتِ الْوُجُوْهُ أَيُنْتَقَصُ عَلِيٌّ وَأَنْتُمْ حُضُوْرٌ...؟!

اے گروہ عرب! تم پر پھٹکار ہو! علیؑ کی برائی ہو رہی ہے اور تم بیٹھے ہوئے ہو؟ علیؑ دشمنان خدا کے لئے دست خدا تھے۔ علیؑ خداوند قہار کی خاکستر کر دینے والی بجلی تھے۔ علیؑ نے چونکہ اُن کو اُن کے کفر کی وجہ سے قتل کیا تھا اس لئے وہ علیؑ سے دشمنی رکھتے ہیں اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔

ابن زبیر نے جمعہ کے چالیس خطبوں میں رسول اکرمؐ پر درود نہیں بھیجا۔ جب اُس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو اُس نے کہا: اہل بیت رسولؐ نااہل لوگ ہیں۔ اگر میں اُن کا نام لیتا تو اُن کی ہمتیں بڑھ جاتیں اور وہ خوش ہو جاتے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ خوش ہوں۔

امام علیؑ نے فرمایا: زبیر میرا دوست تھا لیکن جب اُس کا منحوس بیٹا عبد اللہ پیدا ہوا تو اُس نے میرے ساتھ دوستی ختم کر دی۔

اگر بنی امیہ نے مردوں اور عورتوں کو اُن کے شیعہ ہونے کی بنا پر قتل کیا تو ابن زبیر نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ بات درست ہے کہ جو ذہنیت ہزار سال پہلے کے لوگوں کی تھی وہ اب بھی باقی ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جو سلوک بنی امیہ اور ابن زبیر نے شیعوں کے ساتھ کیا تھا وہی سلوک آج کل استعماری

طاقتیں کمزور قوموں کے ساتھ کرتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ استعماری طاقتوں میں باہمی اختلافات ہیں جو تیل اور سونا پیدا کرنے والے ممالک پر قبضے اور منڈیوں کے حصول کے لئے ہیں لیکن آزاد (اور محبِ وطن) لوگوں پر مظالم ڈھانے میں وہ سب متفق ہیں۔ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انھوں نے آزادی اور استقلال کی خواہشمند کمزور قوموں کے خلاف فوجی معاہدے کر رکھے ہیں اور اُن کے وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے استعماری طاقتیں آپس کے اختلافات کے باوجود محبِ وطن قوموں کے خلاف "ون پوائنٹ ایجنڈا" پر متحد ہیں۔

موجودہ دنیا کا یہ طرزِ عمل ابن زبیر اور بنی امیہ کے طرزِ عمل سے مختلف نہیں ہے وہ اپنی حکومتوں کو وسعت دینے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے لیکن آزاد لوگوں کو ایذائیں دینے اور بالخصوص امام علیؑ کے شیعوں پر ظلم ڈھانے میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔

عبد الملک

عبد الملک اور ابن زبیر کے مابین جنگ، عبد الملک بن مروان کی فتح اور ابن زبیر کے قتل پر منتج ہوئی۔ عبد الملک بن مروان نے اولادِ علیؑ سے سلوک کے سلسلے میں ایک نئی پالیسی وضع کی۔ اُس نے اپنے عامل حجاج بن یوسف کو لکھا کہ بنی عبد المطلب کا خون بہانے سے پرہیز کرو کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جب ابوسفیان کی اولاد نے اپنے ہاتھ ان کے خون سے رنگے تو اُن کی حکومت ختم ہوگئی عبد الملک نے حجاج کو لکھا کہ وہ بنی عبد المطلب کا خون نہ بہائے۔ اُس نے یہ ہدایت رسول اکرمؐ سے محبت یا خداخوفی کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے دی تھی کہ کہیں اُس سے تخت و تاج نہ چھن جائے۔

عبد الملک نے یہ الفاظ اُس وقت کہے جب اُس نے بنی ابوسفیان کی زندگی سے سبق سیکھ لیا اور اُن کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اسی بنا پر اُس نے حجاج کو حکم دیا کہ بنی عبد المطلب کا خون بہانے سے باز رہے لیکن جب بھی مخلص مومنین اور اہل بیتؑ کے شیعوں سے تخت کو کوئی خطرہ لاحق ہوا، اُن کا خون حلال سمجھا گیا۔

عبد الملک یہ بھول گیا کہ جلد یا بدیر استبدادی حکومت اپنی جڑیں خود ہی کاٹ دیتی ہے۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ شجرِ حریت کو قریش اور غیر قریش مردوں نے اپنے خون سے سینچا ہے۔

عبد الملک نے حجاج کو بنی عبد المطلب کا خون بہانے سے منع کیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ مکہ مکرمہ کا محاصرہ کرلے اور خانہ کعبہ کو گرا دے۔ اُس نے حجاز اور عراق کی حکومت اس کے سپرد کر دی اور لوگوں کو بدترین سزا دینے اور قتل کرنے کے لئے فری ہینڈ دیدیا۔

حجاج بن یوسف

حجاج فطرتاً خون آشام شخص تھا۔ وہ اپنے خون کی پیاس بجھانے کے لئے پیر و جواں سب کو قتل کرتا تھا۔ لوگوں کو قتل کرنے کے لئے صرف شیعہ ہونے کی تہمت لگانا کافی تھا۔ حجاج کے دور میں کافر کہلانا شیعہ کہلانے سے بہتر تھا۔

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ (ج ۳، ص ۱۵) میں لکھتا ہے کہ امام باقرؑ نے فرمایا: "جس شہر میں بھی ان کو ہمارے شیعہ مل گئے انھوں نے ان کو قتل کر دیا۔ جن لوگوں پر شیعہ ہونے کا شبہ تھا اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ جس شخص کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ ہمیں دوست رکھتا ہے اُسے قید کر دیا گیا، اُس کا اسباب لوٹ لیا گیا اور گھر مسمار کر دیا گیا۔ یہ ظلم ابن زیاد کے دور تک جس نے امام حسینؑ کو قتل کیا بڑھتا چلا گیا۔ پھر حجاج آیا جس نے محض شیعہ ہونے کے شبہے میں لوگوں کو قید یا قتل کر دیا۔"

شیعوں کے لئے ایسی نازک اور خطرناک صورتحال پیدا ہوگئی کہ ایک شخص امام علیؑ کا شیعہ کہلانے کی بجائے کافر کہلانے کو ترجیح دینے لگا۔ امام علیؑ کے دو حامی حجاج کے سامنے لائے گئے۔ اُن میں سے ایک سے کہا گیا کہ وہ امام علیؑ سے بیزاری کا اظہار کرے۔ اُس نے کہا: علیؑ نے کیا کیا ہے کہ میں اس سے بیزاری کا اظہار کروں؟ حجاج نے کہا: اگر میں تجھے قتل نہ کروں تو اللہ مجھے قتل کردے۔ اب مجھے بتا کہ تیرے ہاتھ کاٹوں یا پاؤں؟ اُس شخص نے جواب دیا: مجھے وہ عذاب دے جس میں تو خود قیامت کے دن مبتلا ہونا چاہتا ہے کیونکہ اُس دن اللہ مجھے تجھ سے انتقام لینے کا حق دے گا۔

حجاج نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: تیرا اللہ کہاں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ وہ ظالموں کی گھات میں ہے۔ حجاج نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سولی دیدی جائے۔ پھر وہ دوسرے شخص سے کہنے لگا: تجھے کیا کہنا ہے؟ اُس نے کہا: میرا جواب وہی ہے جو میرے اس دوست کا تھا جسے تو نے ابھی ابھی سولی دی ہے۔ حجاج نے حکم دیا کہ اس کی بھی گردن اڑا دی جائے اور لاش لٹکا دی جائے۔

جناب قنبر

جناب قنبر دنیا کی نظروں میں امام علیؑ کے غلام تھے لیکن امام علیؑ سے اکتساب فیض کرکے وہ روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے تھے۔ ایک دن حجاج نے جسے خونریزی کرکے خوش ہونے کا مرض لاحق تھا اپنے کارندوں سے کہا: آج میں علیؑ کے کسی ساتھی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا: اس مقصد کے لئے قنبر موزوں رہے گا۔ حجاج نے انھیں بلوایا اور پوچھا: کیا تو ہی قنبر ہے؟ جناب قنبر نے اثبات میں جواب دیا تو حجاج نے کہا: تو علیؑ کی خدمت میں کیا کرتا تھا۔ جناب قنبر نے کہا کہ میں اپنے مولا کو وضو کیلئے پانی پیش کرتا تھا۔ حجاج نے پوچھا: جب وہ وضو کرچکتے

تھے تو کیا کہتے تھے؟ جناب قنبر نے جواب دیا: وہ یہ آیت پڑھتے تھے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی جب انھوں نے اُس نصیحت کو جو اُن کو کی گئی تھی بھلا دیا تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب اُن چیزوں سے جو اُن کو دی گئی تھیں خوش ہوگئے تو ہم نے اُن کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اُس وقت مایوس ہوکر رہ گئے۔ غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریف خدائے رب العالمین ہی کو سزاوار ہے۔ حجاج نے کہا: میرا خیال ہے کہ وہ اس آیت کا اطلاق ہم لوگوں پر کرتے تھے۔ جناب قنبر نے کمال دلیری سے جواب دیا: ہاں۔ حجاج نے کہا: اگر میں تجھے قتل کردوں تو تو کیا کرے گا؟ جناب قنبر نے کہا: میں خوش بخت اور تو بدبخت ٹھہرے گا۔ حجاج نے کہا: علیؑ کے مذہب سے بیزاری کا اظہار کرو۔ جناب قنبر نے کہا: اس سے پہلے کہ میں علیؑ کے مذہب کو ترک کروں مجھے اس سے بہتر مذہب بتا۔ حجاج نے کہا: میں تجھے قتل کرنے والا ہوں۔ مجھے بتا کہ تجھے کس طرح قتل کروں۔ جناب قنبر نے کہا: امیرالمومنینؑ نے مجھے بتایا تھا کہ میں ایک بھیڑ کی طرح ذبح کیا جاؤں گا جبکہ میرا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ حجاج نے حکم دیا کہ انھیں ذبح کردیا جائے۔

جناب کمیل

جناب کمیل بن زیاد امام علیؑ کے مقربین میں سے تھے۔ حجاج نے انھیں بلا بھیجا لیکن وہ روپوش ہوگئے۔ حجاج نے اُن کے قبیلے کے وظائف بند کردیئے۔ کمیل نے سوچا میں اب بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری زندگی کا چراغ بجھنے کو ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ میری وجہ سے میرا قبیلہ اپنے حقوق سے محروم ہو جائے چنانچہ وہ

حجاج کے سامنے حاضر ہوگئے۔ جب حجاج نے انھیں دیکھا تو کہا: میں تمھیں گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ کمیل نے کہا: شیخی نہ بگھار اور دھمکی مت دے۔ خدا کی قسم! میری جتنی زندگی باقی ہے حباب کی مانند ہے۔ تجھے جو کرنا ہے کر۔ ہم ایک دوسرے کو خدا کے سامنے ملیں گے اور مارے جانے کے بعد اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔ امیرالمومنینؑ نے مجھے بتایا تھا کہ میں تیرے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔

حجاج نے کہا: پھر تو دلیل تمہارے خلاف ہے۔

کمیل نے کہا: اگر فیصلہ تیرے ہاتھوں میں ہو تو یہ بات درست ہے۔

حجاج نے حکم دیا کہ اُن کا سر قلم کر دیا جائے۔

جناب سعید بن جبیر

جناب سعید تابعین میں سے تھے۔ اُن کے پائے کے آدمی اُس وقت دنیائے اسلام میں دو چار سے زیادہ نہ تھے۔ وہ اپنے علم، تقویٰ اور زہد کے علاوہ بحیثیت مفسر بھی مشہور تھے۔ وہ امام زین العابدینؑ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ خالد بن ولید عشری نے انھیں گرفتار کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ جب حجاج نے انھیں دیکھا تو کہا "کیا تم ہی شقی بن کسیر ہو؟" "سعید بن جبیر جن پر حجاج کی ہیبت کارگر نہ تھی بولے:

سعید: میری ماں میرا نام بہتر جانتی ہے۔

حجاج: بتاؤ ابوبکرؓ اور عمرؓ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟

سعید: اگر تو جنت اور دوزخ میں دیکھ سکے تو تجھے پتا چل جائے گا۔

حجاج: تم خلفاء کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

سعید: میں ان کا وکیل صفائی نہیں ہوں۔

حجاج: تم کسے زیادہ پسند کرتے ہو؟

سعید: اس شخص کو جس نے اللہ کو زیادہ خوش کیا ہو۔

حجاج: اللہ کو کس نے زیادہ خوش کیا ہے؟

سعید: اللہ بہتر جانتا ہے کیونکہ وہ ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔

حجاج: جو کچھ میں کہتا ہوں کیا تم اس کی تائید نہیں کرنا چاہتے؟

سعید: میں تجھے جھٹلانا نہیں چاہتا۔

حجاج نے حکم دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔

سعید: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (میں نے سب سے منہ موڑ کر اُس ذات کی طرف رخ کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں)۔

حجاج: اس کا منہ کعبہ کے رخ سے ہٹا کر اسے قتل کر دو۔

سعید: أَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (تم جدھر بھی رخ کرو گے اُدھر اللہ ہی کو پاؤ گے)۔

حجاج: اسے منہ کے بل زمین پر لٹا کر قتل کر دو۔

سعید: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور ہم تم کو اسی میں لوٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے)۔

جب سعید اس حالت میں تھے کہ اُن کی گردن اڑا دی گئی۔

ابن اثیر لکھتا ہے کہ جب سعید کا سر زمین پر گرا انھوں نے تین مرتبہ کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک دفعہ بلند آواز میں اور دو دفعہ مدہم آواز میں۔

سعید کو قتل کرنے کے بعد حجاج اپنے حواس کھو بیٹھا۔ وہ مسلسل چلاتا تھا: "ہماری زنجیریں کھولو، ہماری زنجیریں کھولو" اور جب وہ سوتا تھا تو خواب میں دیکھتا کہ سعید اُس کا گریبان پکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں: اے دشمن خدا! تو نے مجھے کس

جرم میں قتل کیا؟[1]

حجاج کا درباری

مسعودی لکھتا ہے: ''عبداللہ بن ہانی، حجاج کے منظور نظر لوگوں میں سے تھا۔ عبداللہ کا چہرہ بے حد کریہہ اور چیچک زدہ تھا۔ اُس کے سر میں گومڑ تھا۔ اُس کا منہ ٹیڑھا اور اُس کی آنکھیں بھینگی تھیں۔''

حجاج نے عبداللہ کے لئے نیزے کی نوک پر دو بیویاں حاصل کیں۔ اُن میں سے ایک بنی فزارہ کے سردار اسماء خارجہ کی بیٹی اور دوسری یمانیہ کے سردار سعید بن قیس ہمدانی کی بیٹی تھی۔

ایک دن حجاج نے عبداللہ سے کہا: ''کیا تجھے معلوم ہے کہ تو فزارہ اور یمانیہ کے سرداروں کی بیٹیوں کے لائق نہیں تھا لیکن میں نے انھیں تیرے لئے حاصل کیا۔''

عبداللہ نے کہا: ''تم نے مناسب بات نہیں کہی کیونکہ مجھ میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو کسی دوسرے عرب میں نہیں۔''

حجاج: تمہاری خصوصیات کیا ہیں؟

عبداللہ: میری محفل میں کبھی عثمانؓ کی بدگوئی نہیں کی گئی۔

حجاج: ہاں یہ بات درست ہے۔

۱۔ یہ ظلم وستم اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز چیخ اٹھے کہ ''عراق میں حجاج، شام میں ولید، مصر میں قرہ بن شریک، مدینہ میں عثمان بن حیان، مکہ میں خالد بن عبداللہ قسری۔ خداوندا! تیری دنیا ظلم سے بھر گئی ہے۔ اب لوگوں کو راحت دے۔'' سیاسی ظلم کے علاوہ یہ لوگ عام دینی معاملات میں بھی بڑی حد تک انحراف پسند ہوگئے تھے۔ نمازوں میں غیر معمولی تاخیر ان کا معمول تھا۔ جمعہ کا پہلا خطبہ بیٹھ کر دیتے تھے۔ عیدین میں نماز سے پہلے خطبہ دینے کا طریقہ مروان نے اختیار کیا اور اُس کے خاندان کے لئے یہ مستقل سنت بن گیا۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۸۷، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

عبداللہ: میرے قبیلے کے ستر آدمی جنگ صفین میں معاویہ کی رکاب میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ابوتراب (ع) کی فوج میں ہمارا صرف ایک آدمی تھا جو مارا گیا اور وہ بھی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔

حجاج: ہاں! یہ بھی ایک خصوصیت ہے۔

عبداللہ: ہمارے کسی آدمی نے علیؑ کو چاہنے والی عورت سے شادی نہیں کی۔

حجاج: واللہ! یہ بھی ایک خصوصیت ہے۔

عبداللہ: ہماری عورتوں نے منت مانی تھی کہ حسینؑ کے قتل ہو جانے پر دس اونٹ نحر کریں گی۔

حجاج: واللہ! یہ بھی ایک خوبی ہے۔

عبداللہ: ہمارے خاندان کا جو شخص سنتا ہے کہ علیؑ پر لعنت ہو رہی ہے وہ اس پر اور حسنؑ، حسینؑ اور اُن کی ماں پر لعنت کرتا ہے۔

حجاج: بخدا! یہ بھی ایک خوبی ہے۔ (مُرُوجُ الذھب ج ۳، ص ۱۵۲)

ابن اثیر کے مطابق عبداللہ ابن زبیر پر غلبہ پانے کے بعد جب حجاج مدینہ آیا تو وہ اہل مدینہ کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا۔ اُس نے کئی لوگوں کی توہین کی۔ انھیں ذلیل کرنے کیلئے ہتھکڑیاں پہنائیں (یا اُن کے ہاتھوں پر مہریں داغیں)۔ (تاریخ کامل، ابن اثیر ج ۴، ص ۲۶)

ابن اثیر مزید لکھتا ہے کہ حجاج کا یہ طریقہ تھا کہ اُس نے فوج کو مختلف درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ بدعت جو اُس کے زمانے میں شروع ہوئی اب تک جاری ہے اور اس کے نتیجے میں جو گناہ ہوتا ہے وہ حجاج کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ (تاریخ کامل، ابن اثیر ج ۴، ص ۸۴)

حجاج کا قید خانہ

مسعودی مُرُوجُ الذھب میں لکھتا ہے کہ اُن مقتولین کو چھوڑ کر، جو جنگوں میں

کام آئے حجاج کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ جب وہ مرا تو اُس کے قید خانوں میں پچاس ہزار بے قصور مرد اور تیس ہزار عورتیں کسی مقدمے کے بغیر سڑ رہے تھے۔ اُن میں سے سولہ ہزار برہنہ تھے۔ حجاج کے قید خانے کی کوئی چھت نہیں تھی کہ قیدی گرمیوں میں دھوپ سے اور سردیوں میں ٹھنڈ اور بارش سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ اس کے علاوہ عقوبت کے دوسرے ذرائع بھی قید خانے میں موجود تھے۔

تاریخ ابن جوزی میں ہے کہ حجاج کا قید خانہ محض چار دیواری پر مشتمل تھا جس کی کوئی چھت نہ تھی۔ جب قیدی دھوپ سے بچنے کیلئے دیوار کی چھاؤں میں بیٹھتے تو چوبدار انھیں پتھر مارتے تھے۔ حجاج انھیں کھانے کے لئے جو میں راکھ اور نمک ملی روٹی دیتا تھا جس سے قیدی کا رنگ حبشیوں کی طرح سیاہ ہو جاتا تھا۔ ایک آدمی کو اس قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ چند دن بعد اُس کی ماں اُسے ملنے آئی تو اُسے پہچان نہ سکی کیونکہ وہ کالا بھجنگ لگتا تھا۔ اُس نے کہا: یہ میرا بیٹا نہیں، یہ تو کوئی حبشی ہے لیکن جب اُسے یقین آگیا کہ وہی اُس کا بیٹا ہے تو اس نے چیخ ماری اور مرگئی۔

یہ ہیں حجاج کے بہیمانہ جرائم جو بہت سے مؤرخین نے تحریر کیے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے کے دوران مجھے حجاج جیسا ظالم آدمی نظر نہیں آیا۔ ایک نیرو تھا جس نے روم کو آگ لگا دی اور شعلوں کو دیکھ کر جو بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو نگل رہے تھے بانسری بجاتا رہا۔ حجاج بنیادی طور پر خدا اور خلق خدا کا دشمن تھا اور رسولؐ و اہل بیت رسولؐ کے لئے دل میں بغض رکھتا تھا۔

اگر ہم سانحہ کربلا سے صرف نظر کرلیں تو حجاج کا دور شیعوں کے لئے معاویہ اور یزید کے دور سے زیادہ کربناک تھا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دور میں کافر کہلانا شیعہ کہلانے سے بہتر تھا تو پتا چلتا ہے کہ اس نے شیعوں پر ظلم کی حد کر دی تھی۔ حجاج نے یہ حقیقت کئی مرتبہ خود تسلیم کی۔ ایک دن اُس نے کوفہ کے لوگوں

سے کہا: "میں حج کرنے جا رہا ہوں اور میں نے اپنے بیٹے محمد کو نائب مقرر کیا ہے میں نے اُسے ہدایات دیدی ہیں کہ وہ نیک لوگوں کی باتیں قبول نہ کرے اور تمہارے گنہگاروں کو نہ بخشے۔" (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ج ۱، ص ۱۱۴)

اس میں کلام نہیں کہ اگر تمام اہل کوفہ امام علیؑ کے طرفدار نہیں تھے تب بھی اُن میں سے اکثر آپ سے محبت کرتے تھے (لہٰذا جو کچھ حجاج نے کہا وہ اسی بنا پر تھا) شیعوں کے بارے میں یہ خوفناک پالیسیاں معاویہ اور ابن زیاد کے دور سے لے کر یزید، ابن زیاد، عبد الملک اور حجاج کے ادوار میں بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہی ہیں۔ غرض کہ ہر دور کا "مرد آہن" شیعوں کے ساتھ "آہنی ہاتھ" سے نمٹتا رہا۔

عبد الملک نے حجاج جیسے "جنونی قاتل" کو عراق اور حجاز پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ لوگوں کا "اجتماعی قتل" کرتا تھا اور انھیں کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اُسے قتل کرنے کا اتنا جنون تھا کہ وہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں نیز ان لوگوں کو بھی قتل کر دیتا تھا جو اُس کی اطاعت قبول کر لیتے تھے۔

یہ مظالم کرکے جنھیں سن کر ہی انسان کانپ جاتا تھا حجاج، عبد الملک کا منظور نظر بن گیا۔ اُس نے اُسے حکومت میں اپنا شریک بنا لیا اور عراق، فارس کرمان، سیستان، خراسان، عمان اور یمن اُس کے کنٹرول میں دے دیئے۔ اُس نے اپنی زندگی میں حجاج کا خاص خیال رکھا اور مرتے وقت اُس کے حق میں وصیت کی۔

ابن اثیر کہتا ہے: جب عبد الملک نے محسوس کیا کہ اُس کی موت کا وقت آپہنچا ہے تو اُس نے اپنی اولاد سے کہا: اُوصِیکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَاِکْرَامِ الْحَجَّاجِ یعنی میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ کو اپنا شعار بنانا اور حجاج کی عزت کرنا کیونکہ وہی ہے جس نے ہمارے لئے سلطنت کی راہ ہموار کی، دشمنوں کو مغلوب کیا اور ہمارے خلاف اٹھنے والوں کو دبا دیا۔

یہ وصیت اُس ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے جس کے ساتھ یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔ کتنی مضحکہ خیز منطق ہے! ایک طرف تو اپنی اولاد کو تقویٰ کی تلقین کی جا رہی ہے اور دوسری طرف حجاج کی عزت کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ اندھیرا روشنی ہے، جھوٹ سچ ہے اور انصاف ظلم ہے۔

ہر دور کے آمر کی نظروں میں انصاف اور تقویٰ کے معنی لوگوں کو قتل کرنے، اُن کا مال لوٹنے، انھیں قید کرنے اور سولی دینے کے رہے ہیں۔ اپنا تخت بچانے کے لئے وہ لوگوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور لوٹتے ہیں تاکہ وہ بلا چون و چرا اُن کی اطاعت کریں اور اگر کوئی احتجاج کے لئے منہ کھولے تو بقول اُن کے اسے اللہ کے نام پر اور اللہ کے حکم کے مطابق قتل کر دیا جاتا ہے اور اُس کا نام ہے تقویٰ!

ابن عبد ربہ لکھتا ہے کہ ایک دن عبد الملک نے برسرِ منبر کہا:

"میں عثمانؓ کی طرح ڈرپوک، معاویہ کی طرح سازشی یا یزید کی طرح متذبذب بزدل خلیفہ نہیں ہوں۔ جو کوئی میری مخالفت میں اپنا سر بلند کرتا ہے میں اُس کا سر اپنی تلوار کے نیچے لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ منبر سے اتر آیا۔

یہ الفاظ عبد الملک نے یزید بن مقنع عذری سے مستعار لئے ہیں۔ اس نے معاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: "اگر معاویہ قتل ہو جائے تو یہ یزید اُس کی جگہ لے گا۔" پھر اُس نے یزید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "جو بھی اس شخص کی مخالفت کرے اُس کے لئے تلوار ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنی تلوار کی جانب اشارہ کیا۔

بنی امیہ کی حکومت کی بنیاد طاقت، جبر، ظلم اور تشدد پر رکھی گئی تھی۔ بالآخر اُس حکومت کا تختہ الٹ گیا اور فساد کا یہ دیو بھسم ہوگیا۔

حجاج کے وحشی پن نے عجیب عجیب قصوں کو جنم دیا مثلاً کہا گیا ہے:

۱۔ حجاج کا باپ یوسف، حجاج کی ماں کے پاس پہنچا اور اُس سے ملاپ کی

خواہش کی۔ اُس نے کہا کہ ابھی تو تم مجھ سے مل کر گئے ہو حالانکہ وہ نہیں ملا تھا۔ چنانچہ یوسف ایک نیک آدمی کے پاس گیا اور اُسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اُس آدمی نے کہا: "شیطان تیری شکل میں تیری بیوی سے مل کر گیا ہے جس سے وہ حاملہ ہوگئی ہے۔ اب جب تک وہ بچہ جن نہ لے تو اُس سے ملاپ نہ کرنا۔" لہٰذا حجاج کے پیدا ہونے تک یوسف اپنی بیوی سے دور رہا۔

۲۔ جب حجاج پیدا ہوا تو اُس کی مقعد نہیں تھی۔

۳۔ علامہ دمیری کی حیات الحیوان میں ہے: "بعض مورخین لکھتے ہیں کہ شیطان حرث بن کلدہ کی صورت میں ظاہر ہو کر آیا اور کہا کہ آپ لوگ کیوں پریشان ہیں تو لوگوں نے جواب دیا کہ یہ لڑکا یوسف کا ہے، فارعہ کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور یہ ماں کا دودھ نہیں پی رہا ہے۔ چنانچہ شیطان نے یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ کالا بکرا ذبح کر کے اُس کا خون اسے چٹاؤ۔ اور پھر دوسرا کالا بکرا ذبح کر کے اس کے خون میں اس کو ڈال دو۔ پھر اس کے چہرے کو اس خون سے تین دن تک مالش کرتے رہو تو چوتھے دن سے یہ ماں کا دودھ پینے لگے گا، چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو اُس نے ماں کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ حجاج خونریزی کے لئے بہت بے چین رہا کرتا تھا حجاج خود کہا کرتا تھا کہ مجھے خونریزی اور وہ کام کرنے میں جس کو دوسرا نہ کر سکتا ہو خوب مزہ آتا ہے۔ (حیات الحیوان ج ۱، ص ۱۱۱ مطبوعہ دار الاشاعت کراچی)

خواہ یہ روایات سچی ہوں یا جھوٹی ان سے اندازہ ضرور ہو جاتا ہے حجاج کس قدر بدنہاد شخص تھا۔

خبیثوں کا سرغنہ

جب حجاج کی عمر ۵۴ سال کی ہوگئی تو اُسے پیٹ کی ایک بیماری لاحق ہوگئی جو پندرہ دن تک جاری رہی۔ اس دوران اُسے یقین ہوگیا کہ وہ جہنم رسید ہونے والا

ہے۔ طبیب نے اُس کا معائنہ کرنے کے بعد گوشت کا ایک ٹکڑا دھاگے سے باندھ کر اُس کے حلق میں اتار دیا۔ جب دھاگا باہر کھینچا تو گوشت پر بے شمار کیڑے چمٹے ہوئے تھے۔

اُن دنوں اسے لرزہ اور ٹھنڈ کی تکلیف بھی ہوگئی۔ اُس کے اطراف میں آگ جلائی جاتی جو اس قدر قریب ہوتی کہ ممکن تھا کہ اُس کی جلد جل جاتی لیکن اسے اُس کی تپش محسوس نہ ہوتی۔

حجاج نے اپنی بیماری کا ذکر حسن بصری سے کیا تو حسن بصری نے کہا: میں نے تم سے کہا تھا کہ اللہ کے نیک بندوں کو تنگ نہ کرو لیکن تم نے اس سے بھی بدتر کام کئے۔ حجاج نے کہا: میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میری صحت یابی کی دعا کرو بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی ایسی تدبیر کرو کہ میں جلد مر جاؤں۔ جب وہ مرگیا تو حسن بصری نے سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا: "پروردگار! جس طرح تو نے اس کو ختم کیا ہے اسی طرح اس کی ناپسندیدہ پالیسیوں کا بھی خاتمہ کر دے۔"

حجاج کی موت ۹۵ھ میں ولید کے دورِ خلافت میں شہر واسط میں ہوئی اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا۔ اُس کی قبر کا نشان مٹا کر پانی چھوڑ دیا گیا۔ ولید نے اس کی مجلس سوگ منعقد کی۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا تھا کہ "اگر دنیا کی تمام قومیں خباثت کا مقابلہ کریں اور اپنے اپنے سارے خبیث لے آئیں تو ہم تنہا حجاج کو پیش کر کے ان پر بازی لے جاسکتے ہیں۔" (خلافت و ملوکیت، مولانا مودودی ص ۱۸۶)

ولید بن عبد الملک

۲۱ سال اور ۴۵ دن حکومت کرنے کے بعد ۸۶ھ میں عبد الملک بن مروان کی موت واقع ہوگئی اور ولید اس کا جانشین ہوا۔

مسعودی کہتا ہے کہ ولید ایک ظالم شخص تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے وصیت کی تھی کہ حجاج کی عزت کرنا۔ چیتے کی کھال پہن کر کھڑے ہوجانا اور جو کوئی تیری بیعت سے انکار کرے اُسے قتل کر دینا۔ ولید نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق حجاج کو لوگوں پر مسلط رکھا۔ حجاج نے سعید بن جبیر جیسے عابد و زاہد کو ولید کے زمانے میں ہی قتل کیا۔ ابن اثیر نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ولید نے کس طرح حجاج کی عزت افزائی کی۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ ولید بیہوش ہوگیا اور یہ سمجھا گیا کہ وہ مرگیا ہے۔ جب حجاج کو یہ خبر ملی تو اُس نے اپنے ہاتھ ایک ستون کے ساتھ رسی سے باندھ کر کہا: اے پروردگار! مدت ہوئی میں نے دعا کی تھی کہ مجھے ولید سے پہلے موت دے دینا۔ جب ولید کو ہوش آیا تو اُس نے کہا کہ "میں اپنی صحت یابی پر حجاج سے بڑھ کر کسی کو خوش نہیں دیکھتا۔"

ولید کے دور میں عمر بن عبدالعزیز والی مدینہ تھے۔ وہ مظلوموں اور مفروروں کو پناہ دیتے تھے۔ جو کوئی حجاج کے مظالم سے تنگ آ کر بھاگتا وہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس پناہ لیتا تھا۔ عمر بن عبد العزیز نے ولید کو ایک خط لکھا جس میں اہل عراق پر حجاج کے مظالم کی شکایت کی۔ ولید نے حجاج کو خوش کرنے کے لئے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ کی ولایت سے ہٹا دیا اور حجاج کو لکھا کہ وہ جس کو چاہے حجاز کا والی مقرر کردے۔ حجاج نے جواب میں لکھا کہ خالد بن عبد اللہ قسری اس عہدے کے لئے نہایت موزوں شخص ہے لہٰذا ولید نے یہ عہدہ اُسے دیدیا۔[1]

حوادث ۸۹ھ کے ذیل میں ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتا ہے: خالد قسری

---

[1] ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ جس وقت عبدالملک بن مروان مرنے لگا تو اُس نے اپنے بیٹے ولید کو بلا کر یہ نصیحت کی کہ اے ولید! مجھے یہ پسند نہیں کہ میری نعش قبر میں رکھی جائے تو تم پریشان لوگوں کی طرح پھرتے پھرو۔ بلکہ تم کپڑے پہن کر تیار ہو جانا، چیتے کی کھال پہن کر کھڑے ہوجانا۔ اگر تمہاری بیعت کے خلاف کوئی بھی انکار میں سر ہلا دے تو تم اُسے سخت سزا دے کر ہلاک کر دینا۔ (حیات الحیوان اردو ص ۲۰۵ بحوالہ اخبار الطوال)

جب مکہ کا عامل بنا تو اُس نے خطبہ دیتے ہوئے کہا: اے لوگو! ولید کی خلافت اور حضرت ابراہیمؑ کی امامت میں سے کون سی چیز بہتر ہے؟ بخدا! تم لوگ خلیفہ کے مرتبے سے واقف نہیں ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے پانی کے لئے دعا کی تو اللہ نے انھیں کڑوا اور کھاری پانی دیا لیکن جب ولید نے اللہ سے پانی مانگا تو اُس نے اُسے میٹھا پانی دیا۔ کڑوے پانی سے خالد کی مراد آب زمزم تھا اور میٹھے پانی سے مراد ولید کے کھودے ہوئے کنویں کا پانی تھا۔ خالد نے ولید کے کنویں کا پانی چاہ زمزم کے قریب ایک حوض میں منتقل کروا دیا تاکہ لوگ اس پانی کی فضیلت جان لیں۔ اس کے نتیجے میں ولید کا کنواں سوکھ گیا۔

خالد بن عبداللہ قسری آب زم زم کو ام الجعلان (کثافتوں کا سرچشمہ) کہا کرتا تھا۔ ایک دن وہ منبر سے ازراہ تمسخر کہنے لگا: ہمارا جھوٹ تمہارے سچ پر کس قدر حاوی رہا؟ کیا ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ تمہاری خاطر اللہ ہم سے خفا ہو جائے اور ہمیں فنا کر دے؟ اگر امیرالمومنین ولید مجھے حکم دیں کہ میں خانہ کعبہ کو ڈھا دوں اور اُس کے پتھر شام بھیج دوں تو میں ایسا کر گزروں گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ کی نظر میں ولید کی عزت پیغمبروں سے زیادہ ہے۔ (ابوالفرج اصفہانی، اغانی ج ۱۹، ص ۵۹)

ابوالفرج اصفہانی مزید کہتا ہے: ''خالد کافر تھا اور اُس کی ماں عیسائی تھی۔ اُس نے عیسائیوں اور مجوسیوں کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا تاکہ مسلمانوں کو اذیتیں دیں۔ اس نے عیسائیوں کو اجازت دیدی کہ وہ مسلمان کنیزوں کو خرید کر ان سے شادیاں کرلیں۔''

جرمن مستشرق ویل ہاسن لکھتا ہے:

کوفہ کا والی بننے پر خالد نے اپنی ماں کے لئے مسجد کے قبلے کے عقب میں ایک گرجا Chapel بنوایا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنی جوانی میں خالد لوطی تھا۔ وہ

عورتوں کی دلالی کرتا تھا۔ وہ بیت اللہ، رسول اللہؐ، اہلبیتؑ اور قرآن کی توہین کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ ایک سمجھدار آدمی قرآن حفظ نہیں کرتا (تاریخ الدولۃ العربیہ، ص ۳۱۹)

بنی امیہ کی پالیسی تھی کہ وہ ہر اُس شخص کو نوازتے اور سیاسی عہدے دیتے تھے جو خود اُن کی طرح بے دین ہوتا تھا۔ قصہ مختصر ولید کے انحراف کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اُس نے حجاج پر اعتماد کیا اور اپنے باپ عبدالملک کے کردار کی تائید کی۔ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مسلم سے پوچھا کہ قیامت کے دن حجاج کہاں ہوگا؟ یزید نے کہا: ''قیامت کے دن تمہارا باپ عبدالملک دائیں طرف سے آئے گا اور تمہارا بھائی ولید بائیں طرف سے آئے گا۔ اب تم ان دونوں کے درمیان جہاں تمہارا جی چاہے حجاج کی جگہ متعین کردو۔''

سلیمان بن عبدالملک

ولید نے نو سال اور ایک مہینہ حکومت کی۔ ۹۶ھ میں اُس کے مرنے پر اُس کا بھائی سلیمان تخت نشین ہوا۔ وہ عورتوں کا رسیا اور پرخور تھا۔ بقول مسعودی ''سلیمان کی توند بہت بڑی تھی اور وہ جوع البقر میں مبتلا تھا۔ جونہی باورچی کڑھائی میں بھنا ہوا مرغ لے کر آتے سلیمان اُس پر ٹوٹ پڑتا۔ ایک دن وہ غسلخانے سے نکلا تو اُسے بھوک محسوس ہوئی چنانچہ اُس کے لئے بیس بزغالے لائے گئے جسے وہ چالیس چپاتیوں کے ساتھ چٹ کر گیا۔ اس کے بعد جلد ہی کھانا لایا گیا تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس طرح کھانے لگا جیسے اُس نے پہلے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ وہ حلوے کی پلیٹیں اپنے بستر کے پاس رکھتا تھا اور جب نیند سے اٹھتا تو بچی ہوئی پلیٹیں بھی چٹ کر جاتا۔

سلیمان بن عبدالملک نے دو سال اور چند ماہ حکومت کی۔ اگر وہ اور جیتا تو اُس کا انجام بھی اُس کے پرکھوں سے مختلف نہ ہوتا۔ تاہم اُس نے خالد قسری کو (جو حجاج کے بعد ظالم ترین شخص تھا) ولایت سے نہیں ہٹایا۔

ابن عبد ربہ لکھتا ہے کہ "سلیمان کے زمانے میں خالد مکہ کا عامل تھا۔ ایک جمعہ کو وہ منبر پر گیا اور اُس نے حجاج کی تعریف کی۔" (العقد الفرید، ج ۴، ص ۱۹۱، مطبوعہ ۱۹۵۳ء)

سلیمان نے عظیم عرب فاتح موسیٰ بن نصیر کو جس نے کئی افریقی شہر، اسپین اور پرتگال فتح کئے تھے قتل کر دیا کیونکہ اُس نے مال غنیمت سلیمان کے تخت نشین ہونے تک اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ پہلے ہی ولید کو بھیج دیا تھا۔ اُس نے قتیبہ بن مسلم کو بھی قتل کر دیا جس نے فارس سے چین تک پھیلے ہوئے علاقے فتح کئے تھے۔ سلیمان نے اُسے اس لئے قتل کیا کیونکہ اُس نے سلیمان کو ولی عہدی سے ہٹانے کے لئے ولید کی رائے کی تائید کی تھی۔

غرضیکہ سلیمان کی پالیسی اپنے پیشروؤں سے مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اُسے روبعمل لانے کے لئے اُسے کافی مہلت نہیں ملی جو کچھ ہم نے کہا ہے اُس کی صداقت کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ایک دفعہ جب اُس کے سامنے معاویہ کا نام لیا گیا تو اُس نے معاویہ اور اُس کے آباؤاجداد کے لئے رحمت کی دعا کی اور کہا:

"بخدا! معاویہ جیسا دوسرا کوئی شخص دیکھنے میں نہیں آیا۔" سلیمان نے معاویہ کے لئے دعا اس لئے کی تھی کہ اُس نے معاویہ جیسا چالاک اور فریبی شخص نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا واسطہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا تھا جو مظالم اور جرائم کرنے میں معاویہ جتنا جری ہو۔ یہی بنی امیہ کی اصلی فطرت تھی۔

عمر بن عبدالعزیز

مسعودی لکھتا ہے کہ سلیمان ۲۰ / صفر ۹۹ھ بروز جمعہ مرا اور اُسی دن عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنائے گئے۔ عمر بن عبدالعزیز جمعہ ۲۵ / رجب ۱۰۱ھ کو حمص کے نواح میں دیر سمعان کے علاقے میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ انھوں نے

۳۹ سال عمر پائی۔ اُن کی خلافت کا دور مسعود دو سال پانچ مہینے اور دس دن ہے۔

دوسرے اموی حکمرانوں کی طرح عمر بن عبدالعزیز کی قبر کھود کر اُن کی لاش نہیں نکالی گئی۔ لوگوں نے بنی امیہ کی قبریں کھود کر لاشوں کو نکالا اور انھیں جلا دیا تھا لوگ بنی امیہ پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن وہ عمر بن عبدالعزیز کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کی قبر پر حاضری دیتے ہیں اور اُن کی قبر کو مبارک خیال کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ چیزیں اُن کے اچھے اعمال کا نتیجہ ہیں۔

جیسا کہ ذکر ہوا معاویہ نے امام علیؑ پر لعنت کی ابتدا کی اور یہ عمل یزید، مروان اور بنی مروان کے زمانے تک جاری رہا۔ ولید جب جناب امیرؑ پر لعنت بھیجتا تو کہتا تھا لَعَنَہِ اللّٰہُ لوگ اُس کے لفظ لعنت کا غلط تلفظ سن کر تعجب کرتے تھے۔ جب ولید کہتا کہ علی (ع) چور اور چور کا بیٹا ہے تو لوگ کہتے کہ ہم نے آج تک یہ نہیں سنا کہ علی (ع) چوری کرتے تھے۔

خالد قسری نے مکہ میں برسرِ منبر کہا:

اللہ کی لعنت ہو علی (ع) پر جو رسول اللہ (ص) کا داماد اور حسن وحسین (ع) کا باپ تھا۔ پھر اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا: "میں نے علی (ع) کا تو ذکر نہیں کیا۔" پھر اُس نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو برا کہنا شروع کیا۔

عبید اللہ سہمی نے خالد کو ٹوکا اور یہ اشعار پڑھے:

لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ یَسُبُّ عَلِیًّا — وَحُسَیْنًا مِنْ سُوْقَۃٍ وَ اِمَامٍ

اَیُسَبُّ الْمُطَھَّرُوْنَ جُدُوْدًا — وَالْکِرَامُ الْاٰبَاءِ وَالْاَعْمَامِ

یَاْمَنُ الطَّیْرُ وَالْحَمَامُ وَلَا — یَاْمَنُ آلُ الرَّسُوْلِ عِنْدَ الْمَقَامِ

طِبْتَ بَیْتًا وَطَابَ اَھْلُکَ اَھْلًا — اَھْلُ بَیْتِ النَّبِیِّ وَالْاِسْلَامِ

رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلَیْھِمْ — کُلَّمَا قَامَ قَائِمٌ بِسَلَامِ

اللہ کی لعنت ہو اُس پر جو علیؑ اور حسینؑ پر اور اُن سے پچھلے والے امام (حسنؑ) پر لعنت کرے۔ کیا تو اُن پر لعنت کرتا ہے جن کے اب و جد اور چچا پاک طینت تھے؟ کبوتر اور دوسرے پرندے تو مکہ میں امن سے ہیں لیکن آلِ رسولؐ بے امان ہیں۔ میں کاشانۂ نبوت کے اہل بیت پاک کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اُن پر تا قیام قیامت اللہ کی رحمتیں اور اُس کا سلام ہوتا رہے۔ (ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۳۶۶ ۔ ج ۳، ص ۴۷۶)

لعنت کی بدعت کا خاتمہ

اہل بیت رسولؐ پر عمر بن عبدالعزیز کے عہد تک لعنت کا سلسلہ جاری رہا۔

عمر بن عبدالعزیز کے بقول اس لعنت کے خاتمے کا سبب یہ واقعہ تھا۔

"میں عتبہ بن مسعود کی اولاد میں سے ایک شخص سے قرآن پڑھتا تھا۔ ایک دن جب میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور علیؑ پر لعنت بھیج رہا تھا میرا استاد میرے پاس سے گزرا اور مسجد میں چلا گیا۔ میں بھی بچوں کو چھوڑ کر قرآن کا سبق لینے مسجد میں پہنچا۔ میرے استاد نے نماز کو طول دیا اور مجھے نظر انداز کر دیا۔ میں نے اُس سے خفگی کا سبب پوچھا تو اُس نے مجھ سے کہا: کیا یہ تم ہو جو کچھ دنوں سے علیؑ پر لعنت بھیج رہے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اُس نے کہا: تمھیں کہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ علیؑ پر غضبناک ہوا ہے؟ جو لوگ بدر میں لڑے تھے اور جنھوں نے بیعت رضوان کی تھی کیا اللہ اُن پر غضبناک ہوا ہے؟ میں نے پوچھا: کیا علیؑ اہل بدر میں سے ہیں؟ اُس نے کہا کہ اہل بدر کا افتخار علیؑ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ میں نے کہا: آئندہ میں علیؑ پر لعنت نہیں بھیجوں گا۔ میرے استاد نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آئندہ ایسی نازیبا حرکت نہیں کروں گا۔ میں نے بھی وعدہ کر لیا۔"

عمر بن عبدالعزیز مزید کہتے ہیں:

"میرا باپ ہر جمعہ کو مدینہ میں برسرِ منبر بڑی روانی سے خطبہ دیتا تھا لیکن جونہی وہ علیؑ پر لعنت بھیجنے لگتا اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ اُسے اس موضوع پر بولنے میں دقت ہوتی تھی۔ مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے اپنے باپ سے کہا: آپ فصیح البیان ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ جب آپ علیؑ پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں تو زبان آپ کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے؟ میرے باپ نے کہا: کیا تم نے اس بات کو محسوس کیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں! میرے باپ نے کہا: اگر شامیوں کو اور دوسروں کو فضائل علیؑ معلوم ہو جائیں تو وہ ہماری اطاعت نہیں کریں گے اور علیؑ کی اولاد سے جا ملیں گے۔"

مجھے اپنے باپ اور استاد کی بات یاد تھی اور میں نے خدا سے وعدہ کیا کہ اگر میں خلیفہ بن گیا تو علیؑ پر لعنت بھیجنے کی بدعت ختم کر دوں گا۔

عمر بن عبدالعزیز نے اپنا وعدہ پورا کیا اور لعنت کی بدعت ختم کر دی اور حکم دیا کہ جمعہ کے خطبے میں لعنت کی جگہ یہ آیت پڑھی جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ. "بے شک اللہ انصاف اور احسان کرنے اور رشتے داروں کو اُن کے حقوق دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور وہ بے حیائی، برائی اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔" (سورہ نحل: آیت ۹۰)

اُس نے اس بارے میں اسلامی دنیا کے تمام شہروں کو ہدایات بھیج دیں اور اسے ایک فرض کے طور پر اپنا لیا گیا اور یہ معاشرے میں مضبوطی سے جڑ پکڑ گیا۔ لوگوں نے اس بنا پر عمر بن عبد العزیز کی بہت تعریف کی ہے۔ (تاریخ کامل بہ ابن اثیر ۹۹ھ کے واقعات اور ابن ابی الحدید ج ۱، ص ۳۵۶)

عمر بن عبد العزیز بنی امیہ میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا لیکن اُس کا استاد

عبید اللہ بن عبد بن عتبہ بن مسعود امام علیؑ اور اہل بیتؑ کا ارادت مند تھا۔ وہ جان کے خوف سے محبت اہل بیتؑ کو چھپائے ہوئے تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کے بچپن میں عبید اللہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور امام علیؑ کی عظمت اُس پر واضح کر دی۔ بعد میں عمر بن عبد العزیز کو یاد آیا کہ جب اُس کا باپ خطبہ دیتا تھا تو امام علیؑ پر لعنت بھیجتے ہوئے اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور یوں استاد نے جو کچھ کہا تھا اُس کی تصدیق ہوگئی۔ اُس کے باپ نے بھی سچی بات کردی اور یوں حقیقت واضح ہوگئی۔ عمر بن عبدالعزیز کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ امام علیؑ افضل اور سچے ہیں اور بنی امیہ گمراہ ہیں۔ اس کے قلب نے دعوت حق پر لبیک کہی اور اُس نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔

یہ ایک ایسا عمل تھا جو منطقی سبب کے نتیجے کے طور پر ظاہر ہوا۔ یہ پھیلا اور بڑھا اور جب مناسب موقع آیا تو صحیح سوچ کی بدولت اچھا فعل انجام دیا گیا۔ سب سے زیادہ قابل تحسین عمر بن عبدالعزیز کا استاد ہے جس نے اُسے سیدھا راستا دکھایا۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا معاویہ بن یزید خلافت سے دستبردار ہوگیا تھا اور اُس نے اپنے باپ دادا پر اُن کے گناہوں کی وجہ سے نکتہ چینی کی تھی کیونکہ اُس نے ایک مومن سے تعلیم پائی تھی جس نے اپنا ایمان مخفی رکھا تھا۔ معاویہ دوم کے خلافت سے دستبردار ہونے اور امام علیؑ کے لئے رحمت کی دعا کرنے کی بنا پر بنی امیہ نے اُس کے استاد کو زندہ دفن کردیا۔

یہ عمر بن عبد العزیز ہی تھے جنھوں نے فدک اولاد فاطمہؑ کو واپس کردیا۔ انھوں نے یہ باغ امام محمد باقرؑ کے حوالے کیا۔ کچھ قریشیوں اور شامیوں نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ اس کا مطلب ابوبکرؓ اور عمرؓ کے فیصلے پر نکتہ چینی کرنا اور یہ کہنا ہے کہ انھوں نے حضرت فاطمہؑ کو اُن کے حق سے محروم کر دیا تھا اور وہ غاصب اور ظالم تھے۔

عمر بن عبد العزیز نے کہا: حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ معقول تھا اور باغ اُن کے قبضے میں تھا۔ زنان بہشت کی سردار ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے حق میں ہبہ کے جواز میں کوئی جھوٹی بات رسول اکرمؐ سے منسوب نہیں کرسکتی تھیں اس فعل سے میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا قرب چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مجھے حضرت فاطمہ زہراؑ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شفاعت نصیب ہوگی۔ اگر میں ابوبکرؓ کی جگہ ہوتا تو حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ تسلیم کرلیتا اور اُن سے جھوٹ منسوب نہ کرتا۔ (سفینة البحار ج ۲، ص ۲۷۲، طبع ۱۳۵۵ھ)

امام علیؑ تمام مسلمانوں سے افضل ہیں

ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ (ج ۴، ص ۵۲۰، طبع قدیم) میں لکھتا ہے:

"ہمارے ہم مذہبوں یعنی معتزلہ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن حضرت علیؑ کا درجہ بہت اونچا ہوگا۔ اپنے فضائل، اخلاق ستودہ اور اوصاف حمیدہ کی بنا پر وہ بہترین خلائق ہیں۔ اُن کا دشمن اللہ کا دشمن ہے اور وہ کافروں اور منافقوں کے ساتھ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ تاہم اگر حضرت علیؑ کا دشمن توبہ کرلے اور تائب ہوکر دنیا سے جائے تو اللہ اُسے معاف کر دے گا۔"

"جہاں تک اُن حضرات کا تعلق ہے جو اُن سے سابق میں خلیفہ ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر حضرت علیؑ نے اُن کی مخالفت کی ہوتی یا اُن پر غضبناک ہوئے ہوتے تو وہ مغضوب الٰہی ہیں لیکن چونکہ آپ اُن پر غضبناک نہیں ہوئے، آپ نے اُن کے خلاف جنگ نہیں کی اور خلافت کو اپنی جانب نہیں کھینچا اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ آپ اُن سے راضی تھے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے: "جو علیؑ سے جنگ کرتا ہے وہ مجھ سے جنگ کرتا ہے اور جو علیؑ سے صلح کرتا ہے وہ مجھ سے صلح کرتا ہے۔""

"پروردگار! جو علیؑ سے دوستی رکھے اُسے دوست رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے اُسے دشمن رکھ۔"

"علیؑ کا دوست مومن اور علی کا دشمن منافق ہے۔"

"چونکہ حضرت علیؑ ان کی خلافت سے راضی تھے، آپ نے اُن کی بیعت کی، اُن کے پیچھے نمازیں پڑھیں، ان کو اپنی بیٹی دی اور اُن کے اموال سے استفادہ کیا اس لئے ہم اُن کی سیرت سے تجاوز نہیں کرسکتے اور جو کچھ اُن سے منسوب کیا گیا ہے[1] اُسے نظر انداز نہیں کرسکتے۔"

"چونکہ حضرت علیؑ نے معاویہ سے بیزاری کا اظہار کیا اور اُس پر لعنت کی اس لئے ہم بھی اُس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور لعنت بھیجتے ہیں۔ جب انھوں نے شامیوں کو گمراہ قرار دیا حالانکہ اُن میں عمرو بن عاص اور اُس کے بیٹے عبداللہ جیسے صحابی بھی موجود تھے تو ہم بھی انھیں گمراہ قرار دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان نبوت کے سوا کوئی فرق نہیں۔"

"جہاں تک اُن بزرگ صحابہ کا تعلق ہے جن کی حضرت علیؑ نے مذمت نہیں کی ہم بھی مذمت نہیں کرتے۔ ہم اُن کے ساتھ بعینہٖ وہی معاملہ کرتے ہیں جو حضرت علیؑ نے کیا تھا۔"

"تفضیل علیؑ کے عقیدے کا اظہار اکثر صحابہ اور اُن کے پیروؤں نے کیا ہے صحابہ میں سے عمّار بن یاسر، مِقداد بن اَسود، ابوذر غِفاری، سلمان فارسی بُریدہ، حُذیفہ، اُبی بن کعب، جابر بن عبداللّٰہ انصاری، ابو ایوبؓ انصاری، سُہیل بن حُنیف، عثمان بن حُنیف، ابو الھیثم بن تیہان، خزیمہ بن ثابت، ابو طُفیل عامر بن واثلہ، عباس بن عبد المطّلب اُن کے

۱۔ واضح رہے کہ یہ ابن ابی الحدید کی رائے ہے ورنہ نہج البلاغہ میں امام علیؑ کے خطبۂ شقشقیہ سے حقائق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بیٹے نیز تمام بنی ہاشم اس کے قائل تھے۔" علامہ اقبال اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی

"بنی امیہ میں سے خالد بن سعید بن عاص اور عمر بن عبد العزیز بھی تفضیل علیؑ کے قائل تھے۔"

اولادِ عقیل کا فیصلہ

ابن کلبی نے لکھا ہے کہ ایک روز عمر بن عبد العزیز دربار میں بیٹھے تھے کہ دربان دو آدمیوں اور ایک لڑکی کے ساتھ جو گندمی رنگ، بلند قامت اور خوش اندام تھی وارد ہوا۔ انھوں نے عمر کو میمون بن مہران کا ایک خط دیا۔ عمر بن عبد العزیز نے خط کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ "اللہ کی رحمت ہو عمر بن عبد العزیز پر! ایک قضیہ ہمارے سامنے پیش ہوا ہے جس کا فیصلہ کرنے سے ہم نے اجتناب برتا ہے اور فرمان الٰہی وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ... رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (سورۂ نساء: آیت ۸۳) کے بموجب آپ کی خدمت عالیہ میں بھیج رہے ہیں تاکہ آپ حکم الٰہی کا اجرا فرمائیں۔

قضیہ یہ ہے کہ دلہن کا باپ کہتا ہے میرے داماد نے قسم کھائی تھی کہ اگر علیؑ مسلمانوں میں افضل اور رسول اللہؐ کے سب سے قریبی رشتے دار ہیں تو میری بیٹی کو طلاق ہوجائے گی اور چونکہ علیؑ مسلمانوں میں افضل ترین نہیں ہیں اس لئے میری بیٹی کا نکاح ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ اُس کی بیوی نہیں رہی۔

دولہا کہتا ہے کہ میرا دعویٰ سچا ہے اور میری قسم بھی صحیح ہے کیونکہ علیؑ مسلمانوں

میں سب سے افضل ہیں۔ اگرچہ میرا خسر خفا ہے لیکن میری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی۔

دولہا قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو نہیں چھوڑے گا اور خسر قسم کھاتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو گھر لے جائے گا۔ ہم نے قضیہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے اور آپ کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ خدا آپ کو توفیق بخشے اور آپ کی رہنمائی فرمائے۔

عمر بن عبد العزیز نے بنی ہاشم، بنی امیہ اور قبائل قریش کو بلا بھیجا۔ پھر اس نے دلہن کے باپ سے کہا: تمھیں کیا کہنا ہے؟ اُس نے اپنا موقف دہرایا (کہ علیؑ افضل نہیں ہیں)۔ پھر خلیفہ نے دولہا سے کہا: تم کیا کہتے ہو؟ اُس نے اپنا دعویٰ دہرایا (کہ علیؑ افضل ہیں)۔

دولہا کی بات سنتے ہی دربار میں کھلبلی مچ گئی اور بنی امیہ اُسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگے تاہم کوئی بولا کچھ نہیں۔ تمام نگاہیں خلیفہ کے چہرے پر جم گئیں۔ تھوڑی دیر تک خلیفہ اپنی انگلی زمین پر پھیرتے رہے اور سوچتے رہے۔ پھر انھوں نے حاضرین سے پوچھا: تم لوگ قسم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ سب خاموش رہے۔ خلیفہ نے کہا: تم جو کہنا چاہو کہو کیونکہ جو بات غلط کو دبا نہ دے وہ سچ ہوتی ہے۔

بنی امیہ میں سے ایک شخص بولا: ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

خلیفہ نے فرزند عقیل بن ابی طالبؑ سے پوچھا: "تم کیا کہتے ہو؟" عقیلی نے کہا: "میں بولوں گا بشرطیکہ میری بات مانی جائے اور اُسے وزن دیا جائے۔ اگر میری بات کو وزن نہ دیا جائے تو چپ رہنا زیادہ بہتر ہے اور یہ چیز دوستی برقرار رکھنے کے لئے زیادہ مؤثر ہوگی۔"

خلیفہ نے کہا: تمہاری بات مانی جائے گی۔ اس پر بنی امیہ نے خلیفہ سے کہا: آپ نے انصاف نہیں کیا۔ آپ نے فیصلہ ایک ایسے شخص پر چھوڑ دیا ہے جو بنی امیہ میں سے نہیں۔

خلیفہ نے کہا: چپ رہو۔ ابھی ابھی میں نے پوچھا تھا کہ اس معاملے میں کون

فیصلہ دینا چاہتا ہے تو تم لوگ سرزنش یا عاجزی کی وجہ سے خاموش رہے۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کس سے مشابہ ہو؟" انہوں نے کہا ہمیں نہیں معلوم۔ خلیفہ نے کہا: فرزند عقیل یہ بات جانتا ہے۔ پھر خلیفہ نے اُس سے پوچھا: یہ لوگ کس سے مشابہ ہیں؟ عقیلی نے کہا: ایک شاعر کا شعر ان پر صادق آتا ہے جو کہتا ہے: تمھیں ایک قضیے میں بولنے کے لئے بلایا گیا۔ جب تم عاجز ہوگئے تو ایک اور شخص جو عاجز نہیں تھا بول پڑا۔ جب تم نے یہ دیکھا تو نادم ہوئے لیکن ندامت کوئی پناہ گاہ مہیا نہیں کرتی۔

عمر بن عبدالعزیز بولے تم نے سچ کہا۔ اب میرے سوال کا جواب دو۔ عقیلی نے کہا: عورت کو طلاق نہیں ہوئی۔

پھر اس نے عمر بن عبدالعزیز سے کہا:

"میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک دن رسول اکرمؐ حضرت فاطمہؑ سے ملنے ان کے گھر گئے اور ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں بیمار ہوں۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کہ بیٹی کیا کچھ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ انھوں نے فرمایا: بابا جان انگور کھانے کو جی چاہ رہا ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ یہ انگور کا موسم نہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اللہ اس بات پر قادر ہے کہ یہ چیز ہمارے لئے بھیج دے۔ پھر آپ نے دعا مانگی: "اے پروردگار! ہمارے لئے انگور بھیج اور ساتھ ہی میری امت کے "بہترین فرد" کو بھی بھیج۔ اس کے فوراً بعد امام علیؑ گھر میں داخل ہوئے۔

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ سے پوچھا: تمہارے پاس کیا ہے؟ امام علیؑ نے جواب دیا یہ انگور ہیں جو میں فاطمہؑ کے لئے لایا ہوں۔ حضور نے فرمایا: اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اے پروردگار! جیسے تو نے علیؑ کے بارے میں میری دعا بطور خاص قبول کی ہے اسی طرح میری بیٹی کو ان انگوروں کے ذریعے شفا عطا فرما۔ پھر آپ نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا: اللہ کا نام لے کر یہ انگور کھاؤ۔ انھوں نے انگور کھائے اور اس سے پہلے کہ آنحضرتؐ ان کے گھر سے رخصت ہوتے وہ شفایاب ہوگئیں۔

عمر بن عبد العزیز نے کہا: طلاق کے غیر مؤثر ہونے کے بارے میں تمہارا فیصلہ درست ہے۔ میں نے فیصلہ سن لیا ہے اور اسے نافذ کروں گا۔ پھر انھوں نے دولہا سے کہا: اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑو اور جاؤ۔ اگر اس کا باپ اسے لے جانے میں مزاحمت کرے تو اس کی ناک رگڑ دو۔

پھر انھوں نے بنی عبد مناف سے کہا: اللہ کی قسم! جو کچھ دوسرے جانتے ہیں ہم اس سے بے خبر نہیں ہیں اور اپنے مذہبی معاملات کے بارے میں اندھے نہیں ہیں تاہم ان اشعار کا اطلاق ہم پر ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے:

"دنیا اپنے جال سے انسانوں کا شکار کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ اچھائی کو نہیں سمجھ پاتے اور برائی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ دولت کی ہوس لوگوں کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے اور انھیں بجز نقصان اور گناہ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

جب عمر بن عبد العزیز نے یہ اشعار پڑھے تو بنی امیہ ہکا بکا رہ گئے اور دولہا اپنی دلہن کو لے کر چلا گیا۔

سچائی کے فائدے اور نقصانات

عمر بن عبد العزیز کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنی امیہ نے معاویہ دوم کی طرح انھیں بھی زہر دے کر ختم کر دیا کیونکہ وہ سچائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اولاد علیؑ کے جن فضائل سے وہ خود واقف تھے وہ لوگوں کو معلوم نہ ہو جائیں اور لوگ اُن کے قریب نہ ہو جائیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے عمر بن عبد العزیز نے تسلیم کیا تھا کہ اُن کا باپ جب امام علیؑ پر لعنت کرتا تھا تو اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔

بنی امیہ سچائی سے خوف کھاتے تھے کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ سچائی اُن کی حکومت کا تختہ الٹ دے گی تاہم وہ سچ کو جتنا دباتے تھے اتنا ہی وہ ابھرتا تھا اور سر چڑھ کر بولتا تھا۔

کسی نے کہا ہے کہ "عمر بن عبد العزیز ایک معمولی آدمی تھے۔ اُن کی عظمت اس میں تھی کہ وہ چیزوں کو دیکھ سکتے تھے لیکن انھیں اندھوں (بنی امیہ) کے درمیان رکھ دیا گیا تھا۔" منصور کہتا ہے: جس وقت ابن عبد العزیز سریر آرائے خلافت ہوئے کچھ لوگوں نے دین میں تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اس سے قبل اسلام میں اتنا ظلم کبھی نہیں ہوا تھا اور اسلام سے اتنی بے اعتنائی کبھی نہیں برتی گئی تھی جتنی اُن کے خلیفہ بننے سے پہلے برتی گئی۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ امام علیؑ پر منبروں سے لعنت کی جاتی تھی اور جب عمر ابن عبد العزیز نے اُس کی ممانعت کر دی تو اسے صالحین بلکہ خلفائے راشدین میں شمار کیا گیا۔ یہ بات کثیر کے ایک شعر سے ثابت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

وَلِیتَ فَلَمْ تَشْتِمْ عَلِیًّا وَلَمْ تُخِفْ
بَرِیًّا وَلَمْ تَتْبَعْ مَقَالَةَ مُجْرِمِ

"کاش تم نے علیؑ کو برا نہ کہا ہوتا، بے گناہوں کو ہراساں نہ کیا ہوتا اور گنہگاروں کی بات نہ مانی ہوتی۔"

مختصر یہ کہ عمرؒ نے اچھا طرز عمل دوسروں کے برے طرز عمل سے سیکھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگ دینی خانوادوں میں پلتے ہیں اور اسلامی علوم حاصل کرنے میں زندگیاں کھپا دیتے ہیں لیکن پھر بھی راہ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔ وہ آزمائشوں کا مقابلہ نہیں کر پاتے اور دنیا کی چمک دمک کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ تاہم عمر بن عبد العزیز نے اپنے خاندانی کردار اور عادات کو ترک کر دیا اور حکومت کے نشے میں نہیں بہکے بلکہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ عمر بن عبد العزیز کی عظمت اس چیز سے عیاں ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی کی اور ثابت کیا کہ وہ راہ راست سے بھٹک گئے تھے۔ ہم عمر بن عبد العزیز کی عزت کرتے ہیں کیونکہ اُن کا دل بیدار تھا اور انھیں جھوٹ سے نفرت

تھی۔ ایمان اور جہاد ان کی سرشت میں تھا۔ خدا اُن پر اپنی رحمت نازل کرے کیونکہ اُن کی پالیسی نے بنی امیہ کی بداعمالیوں کو طشت از بام کردیا تھا۔ یہ بات ایسی فضیلت ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا اور ایسا افتخار ہے جو رسول اکرمؐ کی رکاب میں جہاد کرنے کے برابر ہے ؂

درد دل پاس وفا جذبۂ ایمان ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انسان ہونا

یزید بن عبدالملک

عمر بن عبدالعزیز نے اُس وقت انتقال کیا جب وہ اللہ کی خوشنودی کے امیدوار تھے اور یزید بن عبدالملک ان کا جانشین بنا۔ مسند آرا ہوتے ہی اُس نے اپنے عاملوں کو لکھا کہ ”عمر بن عبدالعزیز کو دھوکا دیا گیا اور یہ دھوکا اسے تم نے اور تمہارے رفقاء نے دیا۔ تم نے ٹیکسوں اور دوسرے محصولات میں کمی کے بارے میں جو خطوط انھیں لکھے تھے وہ میں نے پڑھے ہیں۔ جب تمھیں میرا خط ملے اپنے سابقہ رفقاء اور دوستوں کو بلاؤ اور لوگوں کو اُن کی پہلی حالت پر لے آؤ۔ اُن پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی طرح خواہ زندہ ہوں یا مردہ ٹیکس ادا کریں۔ والسلام“ (العقد الفرید ج ۵، ص ۱۷۶)

عمر بن عبدالعزیز نے فَـدَک اولاد فاطمہؑ کو واپس کر دیا تھا لیکن یزید نے اسے دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیا۔ یزید بن معاویہ کی طرح یزید بن عبدالملک بھی عیش وعشرت، شراب خوری اور عورتوں کا دلدادہ تھا۔ یزید بن معاویہ اُس کا نانا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس نام میں کوئی ایسی خاص بات ہے جو اُس کے مسمّی کو فتنہ وفساد اور جرم وگناہ کا مجسمہ بنا دیتی ہے۔

سلامۃ القس اور حبابہ نامی دو کنیزیں یزید کی منظور نظر تھیں۔ اُن میں سے

ایک شراب پلاتی تھی اور دوسری گانا سناتی تھی۔ ایک دن جب وہ اُن کنیزوں کے ساتھ نشے میں دھت تھا اُس نے کہا: میں اڑ جانا چاہتا ہوں۔ حبابہ نے کہا: ہم تو آپ کے زیر کفالت ہیں۔ یزید نے کہا: واللہ! میں اڑ کر جانے والا ہوں۔ حبابہ نے پوچھا: آپ سلطنت کس کو سونپ کر جا رہے ہیں؟ یزید اُس کا ہاتھ چوم کر بولا: واللہ میں یہ سلطنت تجھے سونپ کر جا رہا ہوں۔

ایک بار حبابہ سیر وتفریح کے لئے یزید کے ساتھ اردن گئی۔ یزید نے انگور کا ایک دانہ[1] اس کے منہ میں ڈالا تو وہ دانہ اُس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ مرگئی۔ یزید اس کا چہرہ چوم چوم کر روتا رہا اور تین دن تک اس کی میت دفن نہیں ہونے دی۔ (تاریخ کامل، ابن اثیر ۱۰۵ھ سال کے واقعات)

ابن عبد ربہ نے لکھا ہے کہ ابوحمزہ نے یزید کی کیفیت یوں بیان کی ہے: وہ حبابہ کو اپنی دائیں جانب اور سلامہ کو اپنی بائیں جانب بٹھاتا تھا۔ پھر وہ حبابہ کو گانے کے لئے اور سلامہ کو شراب کے لئے کہتا تھا۔ جب وہ نشے میں چور ہو جاتا تو اپنے کپڑے پھاڑ دیتا اور کہتا: میں اڑنا چاہتا ہوں اور اڑ کر جہنم میں پہنچ جانا چاہتا ہوں جو مجرموں کا مقام ہے۔ (العقد الفرید ج ۴، ص ۲۰۲)

ایک دن یزید ابولہب کی تعریف کر رہا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ ابولہب کافر تھا

---

[1] یزید بن عبدالملک اسی طرح عیش وآرام کی زندگی گزار رہے تھے کہ ایک مرتبہ حبابہ انار کا ایک دانہ کھا رہی تھی۔ کھاتے کھاتے ہنسنے لگی۔ اتنے میں وہ دانہ گلے میں اٹک گیا اور حبابہ کی موت واقع ہوگئی۔ حبابہ کی موت سے یزید کی زندگی انتہائی مشکل ہوگئی۔ عقل ماؤف ہوگئی، عیش و آرام مکدر ہوگیا۔ سارا خلافت کا نشہ جاتا رہا۔ یزید پر ایسا وجد طاری ہوا کہ اُس نے حبابہ کو چند دن تک دفن کرنے نہیں دیا۔ اُس کے بوسے لیتا، اُس کو چومتا یہاں تک کہ اُس کی لاش بدبودار ہوگئی۔ پھر اُس کے دفن کرنے کا حکم صادر فرمایا پھر اُس کو قبر سے نکال لیا۔ پھر اُس کے بعد یزید ۱۵ دنوں سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ (علامہ دمیری حیات الحیوان، اردو ترجمہ ص ۲۱۷، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی)

اور رسول اکرمؐ کے در پے آزار رہتا تھا۔ یزید نے کہا: میں یہ بات جانتا ہوں۔ تاہم میں اسے پسند کرتا ہوں کیونکہ اُس کی آواز اچھی تھی۔

ہشام بن عبد الملک

یزید بن عبد الملک ۴ سال ایک ماہ اور دو دن حکومت کرنے کے بعد ۳۷ سال کی عمر میں ۱۰۵ھ میں مرگیا اور اس کی جگہ ہشام بن عبد الملک خلیفہ ہوا۔ انقلاب کے قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ بنی امیہ جرائم میں گھر گئے تھے اور ہر طرف سے ان پر لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ اُن کی سیاست کو ہر طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور یہ خطرہ فقط شیعوں کی جانب سے نہیں تھا۔

ہشام نے حالات بہتر بنانے اور برائیوں کی روک تھام کے لئے کوئی اقدام نہ کیا بلکہ بنی امیہ کی غلطیوں کی تائید کی اور اُن کے جرائم میں اضافہ کیا۔ اُس نے عاملوں کو لکھا: "شیعوں کے ساتھ سختی کرو اور انھیں قید کرو۔" اس نے حکم دیا کہ شیعوں سے جان چھڑائی جائے۔ ان کا خون بہایا جائے اور انھیں تمام حقوق سے محروم کردیا جائے۔

اس نے حکم دیا کہ شاعر اہل بیت کمیتؔ کا مکان منہدم کردیا جائے۔ اس نے کوفہ کے عامل عمر ثقفی کو یہ ہدایت بھی کی کہ خاندان رسولؐ کی تعریف کرنے کے جرم میں کمیتؔ کی زبان کاٹ دی جائے۔ اس نے مدینہ کے عامل خالد بن عبد الملک کو لکھا کہ بنی ہاشم کو قید کردیا جائے اور (ان کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کیا جائے یعنی) انھیں شہر چھوڑنے سے روکا جائے۔ ہشام کے حکم پر خالد نے بنی ہاشم پر سختیاں کیں اور امام زین العابدینؑ کے بیٹے جناب زید سے نازیبا گفتگو کی جو انھیں سخت ناگوار گزری۔

جناب زید دمشق گئے تاکہ اپنی شکایات ہشام بن عبد الملک کے سامنے پیش

کریں لیکن اس نے انھیں دربار میں آنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ انھوں نے ہشام کو ایک خط لکھا جس میں ملنے کی اجازت چاہی۔ ہشام نے خط کے آخر میں لکھا: "مدینہ واپس چلے جاؤ۔" جناب زید نے کہا: اللہ کی قسم! میں واپس خالد کے پاس نہیں جاؤں گا۔

کچھ دن بعد ہشام نے جناب زید کو دربار میں آنے کی اجازت دیدی۔

جناب زید کے دربار میں آنے سے پہلے ہشام نے اپنے درباریوں سے کہا کہ وہ اُن کے لئے کوئی جگہ نہ چھوڑیں تاکہ وہ اُس کے نزدیک نہ آسکیں جب جناب زید دربار میں داخل ہوئے تو انھیں بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ سب کچھ عمداً کیا گیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے ہشام کو مخاطب کرکے کہا: "اللہ سے ڈرو۔" ہشام نے کہا: "کیا تم جیسا شخص مجھے متقی بننے اور اللہ سے ڈرنے کی تلقین کر رہا ہے؟"

جناب زید نے فرمایا: "نصیحت کے معاملے میں اللہ کے بندوں کے درمیان ادنیٰ و اعلیٰ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ میں نے تمھیں ایک نصیحت کی ہے اور تمھیں پرہیزگار ہونا چاہیے۔" ابن ابی الحدید لکھتا ہے: ہشام نے جناب زید سے کہا: "میں نے سنا ہے کہ تم حکومت حاصل کرنا چاہتے ہو لیکن چونکہ تم ایک کنیز کے بیٹے ہو اس لئے اس منصب کے اہل نہیں ہو۔"

جناب زید نے جواب دیا: "کوئی شخص اللہ اور اس کے رسولؐ سے افضل نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند حضرت اسماعیلؑ ایک کنیز کے بیٹے تھے لیکن اللہ نے انھیں پیغمبر بنایا اور حضرت محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُن کی اولاد میں سے تھے۔" ہشام نے پوچھا: "تمہارا بھائی بقرہ کیا کر رہا ہے؟" یہ سن کر جناب زید کو سخت طیش آیا (کیونکہ بقرہ گائے کو کہتے ہیں) اور انھوں نے غصے سے کہا: "اے ہشام! رسول اکرمؐ نے انھیں باقر کا نام دیا تھا اور تو انھیں بقرہ کہہ رہا ہے۔"

تیرا فعل رسول اکرمؐ کے فعل سے بہت دور ہے اور قیامت کے دن بھی تو اُن سے اتنے
ہی فاصلے پر ہوگا۔ وہ (امام باقرؑ) جنت میں جائیں گے اور تو دوزخ میں جائے گا۔"
ہشام نے غرا کر کہا: "اس احمق کا ہاتھ پکڑو اور اسے باہر نکال دو۔" ہشام
کے غلاموں نے جناب زید کو محل سے باہر نکال دیا اور اس دن سے انھوں نے اپنی
توجہ کوفہ پر مرکوز کردی۔

جناب زید کے معرکے

ابو الفرج اصفہانی رقم طراز ہے: "کوفہ کے پندرہ ہزار شیعوں نے جناب زید
کی بیعت کی تھی۔ اس تعداد میں ان کے وہ حامی شامل نہیں ہیں جن کا تعلق مدائن،
واسط، موصل، خراسان، رے اور جرجان سے تھا۔ جناب زید کے پیروؤں میں
علماء اور دیگر عمائدین شامل تھے۔ جناب زید اور یوسف بن عمر ثقفی کے درمیان جو
بصرہ و کوفہ کا عامل تھا جنگ شروع ہوئی تو جناب زید کے کوفی ساتھی بھاگ گئے۔
فقط تھوڑے سے لوگ جو پیچھے رہ گئے مقابلے پر ڈٹے رہے اور طرفین کی حالت
نازک ہوگئی۔ (مقاتل الطالبین، ص ۱۳۵)
شیخ ابو زہرہ مصری نے اپنی کتاب "الامام زید" میں لکھا ہے: "علیؑ کا پوتا اور
رسولؐ کا بیٹا زید تقریباً تین سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں اترا۔ دشمن کی فوج
مقابلتاً بڑی تھی اور اسے باقاعدہ کمک بھی پہنچ رہی تھی۔ زید اپنی مختصر لیکن دلاور سپاہ
کے ساتھ بڑی بے جگری سے لڑے اور بنی امیہ کی فوج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔
جب اموی فوج کے تقریباً ۷۰ آدمی مارے گئے اور اُن کے قدم اکھڑنے لگے تو
بنی امیہ نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ تیروں کی بارش نے جنگ کا سارا نقشہ ہی
بدل دیا اور جناب زید کی فوج مغلوب ہوگئی۔ ایک تیر اُن کی پیشانی میں آکر
پیوست ہوگیا۔ جب اسے کھینچا گیا تو اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

جب بنی امیہ نے دیکھا کہ وہ ہار رہے ہیں تو انھوں نے جناب زید کے خلاف
"تیروں کی بارش" کا وہی حربہ استعمال کیا جو انھوں نے حضرت امام حسینؑ کے
خلاف استعمال کیا تھا کیونکہ اولاد علی مرتضیٰؑ سے دست بدست لڑائی میں کوئی مائی کا
لال جیت نہیں سکتا تھا۔
ہشام نے جناب زید کی لاش کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا کہ یزید اور
ابن زیاد نے امام حسینؑ کی لاش کے ساتھ کیا تھا۔
یحییٰ بن زید نے اپنے باپ کی لاش خفیہ طور پر ایک ندی میں دفن کر کے اس
کے نشانات مٹانے کے لئے اس پر گھاس پھوس ڈال دی تاکہ کوئی اُس کا پتا نہ
چلا سکے۔ تاہم ایک شخص نے جسے اس بات کا علم تھا اموی افسروں کو مخبری کر دی اور
اُن کی ذلت وخواری کے انمٹ داغوں میں ایک اور داغ کا اضافہ کر دیا۔ انھوں
نے قبر سے لاش نکالی، اُس کے ناک کان کاٹے اور ہشام کے حکم کے مطابق کوفہ
کے مذبلہ کے پاس لٹکا دی۔

بنی امیہ اور حضرت فاطمہؑ

یہ جنگ بڑی خوفناک تھی اور مذہب کی نگاہ میں جو کچھ مقدس ہے بنی امیہ
کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ روایت ہے کہ بنی امیہ کا ایک سپاہی جو ایک
خوبصورت گھوڑے پر سوار تھا حضرت فاطمہؑ کو برا بھلا کہنے لگا۔ یہ دیکھ کر جناب زید
اس قدر روئے کہ ان کی پوری داڑھی بھیگ گئی۔ پھر انھوں نے کہا: کیا ایسا کوئی
شخص نہیں جسے فاطمہ بنت رسولؐ کی خاطر غصہ آئے۔ کیا کوئی ایسا شخص نہیں جسے
اللہ کے رسولؐ کی خاطر غصہ آئے؟ یہ سن کر جناب زید کا ایک پیرو اٹھا اور غائب
ہوگیا۔ اُس نے پیچھے سے حملہ کر کے گھڑ سوار کو قتل کر دیا اور اُس شخص کے گھوڑے پر
سوار ہوکر واپس آگیا۔ بنی امیہ نے اس پر حملہ کیا لیکن جناب زید کے ساتھیوں نے

اسے بچالیا۔ جناب زید بہت خوش ہوئے اور اُس شخص کی پیشانی چوم کر بولے،
تم نے میری مدد کی ہے اور دنیا و آخرت کی عظمت اور رحمت سمیٹ لی ہے۔

بنی امیہ نے جناب زید کو شہید کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے اُن کی لاش قبر سے نکالی، ان کے ناک کان کاٹے، سر قلم کیا اور بدن سولی پر چڑھا دیا جو پانچ سال تک برہنہ سولی پر لٹکا رہا۔ جب ولید بن یزید خلیفہ بنا تو اُس نے کوفہ کے عامل کو لکھا کہ جناب زید کی لاش سولی کے ہمراہ جلا دی جائے اور راکھ ہوا میں بکھیر دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عامل نے راکھ دریائے فرات کے کنارے ہوا میں بکھیر دی۔

ابن تیمیہ منہاج السنہ میں لکھتا ہے کہ جب جناب زید کی لاش کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو کچھ اہل کوفہ اُس جگہ پہنچے اور انھوں نے آپ کی نماز پڑھی۔ ہشام نے زید کا سر مدینہ بھیج دیا جہاں وہ ایک دن رات قبر رسولؐ کے پاس نصب رہا۔ اُن دنوں مدینہ کا عامل محمد بن ابراہیم بن ہشام مخزومی تھا۔

اہل مدینہ نے اس سے سر نیچے اتارنے کی درخواست کی لیکن وہ نہیں مانا۔ لوگ اسی طرح روئے پیٹے جیسے وہ امام حسینؑ کی شہادت کی خبر ملنے پر روئے پیٹے تھے۔ عامل نے لوگوں کو بلایا اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ علیؑ، حسینؑ، زیدؒ اور ان کے پیروؤں پر لعنت بھیجیں۔ یہ عمل سات دن ہوتا رہا۔ پھر اس نے سر مصر بھیج دیا جہاں وہ جامع مصر کے قریب نصب رہا۔ مصریوں نے یہ سر چرا لیا اور "جامع ابن طولون" کے قریب دفن کر دیا۔ عین ممکن ہے کہ مصر کی وہ مسجد جو "مسجد الحسین" کے نام سے مشہور ہے امام حسینؑ کے پوتے زیدؒ بن علیؑ بن حسینؑ کے سر کا مدفن ہو۔

علی، فاطمہ، حسن، حسین علیہم السلام کو ناسزا کہنا، اولاد رسولؐ کو قتل کرنا اُن کو آزار پہنچانا اور اُن کے سر کاٹ کر شہر بہ شہر پھرانا وہ ہتھکنڈے تھے جو بنی امیہ کے تمام حکمرانوں نے استعمال کئے۔

امام علیؑ کی اولاد کا جرم یہ تھا کہ وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان کے نانا حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دین کو کھلونا بنا لے، لوگوں کی قسمت سے کھیلے اور اُن کے حقوق غصب کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ بنی امیہ پر لعنت بھیجتے تھے اور امام علیؑ اور اُن کی اولاد کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ایک حقیقت جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ ہے کہ شیعہ عقیدے کو پھیلانے اور مضبوط کرنے میں بنی امیہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔

سیرت رسولؐ اور امام علیؑ کی اولو العزمی کی خوشبو

یہاں پر پروفیسر محمد ابوزہرہ کے چند الفاظ نقل کرنا مناسب ہوگا۔

"زید لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ وہ بہادر اور کھرے انسان تھے اور حقوق کا دفاع کرنے والے تھے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے دین میں تحریف کی جائے اور جھوٹ کا بول بالا ہو۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ لوگوں کے حقوق پامال کئے جائیں، اللہ کے احکام نظر انداز کئے جائیں اور مذہب میں بدعتیں داخل کی جائیں تاکہ اسلام کی بنیاد ڈھے جائے اور ظلم اور جرائم پنپتے رہیں۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جابر حکمران عوام کا جینا اجیرن کر دیں۔ انھوں نے دین کی خاطر آبرومندانہ موت کو گلے لگایا اور وہ مرتبہ حاصل کیا جو صدیقین اور شہداء کے لئے مخصوص ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: سید الشہداء میرے چچا حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص ہے جو ایک جابر حاکم کے سامنے سچ بولے۔

اللہ تعالیٰ نے شہداء کی مثالیں بیان فرمائی ہیں تاکہ اُن کی پیروی کی جائے اور انسان اُن کی روشنی سے ہدایت حاصل کرے کیونکہ انھوں نے اپنی عزیز جانیں اسلام کے راستے میں قربان کر دی ہیں۔ مناسب ہے کہ ہر مومن کو علم ہو کہ امام علیؑ کے فرزند کیا چاہتے تھے اور سچائی کا ہر جگہ پرچار کرے اور یہ کافی ہے کہ سچ بولنے

کے نتیجے میں اسے اُن کی شہادت کے برابر ثواب حاصل ہو جائے۔

اس معرکے سے کیا فائدہ ہوا؟

بعض اوقات کہا جاتا ہے: ''شہیدوں نے جو سچی باتیں کیں ان کا کیا فائدہ ہوا؟ اگر وہ فتح پاتے اور حکومت کرتے تو یہ الفاظ مفید ہوتے لیکن وہ یہ مقصد حاصل نہ کر سکے۔''

ہم جواب میں کہتے ہیں: ''جو سچی باتیں امام علیؑ کی اولاد نے کہی ہیں اور ان کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں انھوں نے ''حق'' کو فائدہ پہنچایا ہے اور مومنین کے دلوں کو روشن کیا ہے۔ یہ جاننا کافی ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت نے ابوسفیانی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور جناب زید کے قتل نے مروانی حاکموں کو ملیا میٹ کر دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اور لوگوں کے درمیان زمانے کے نشیب و فراز بدلتے رہتے ہیں تاکہ اللہ ایمان والوں کی جانچ کرلے اور تم میں سے کچھ شہید چن لے اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۰)

تمام اہل علم نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ جناب زید بلند پائے کے عالم تھے انھیں حجاز اور عراق کے فقہاء کے معتقدات کا پورا پورا علم تھا۔ فضلاء نے کسی شخص کی علمیت کو اتنی وقعت نہیں دی جتنی جناب زید کی لیاقت اور علمیت کو دی ہے۔ شیعہ، سنی، مرجئہ اور معتزلہ اس بات پر متفق ہیں کہ جناب زید علم و دانش میں اپنے وقت کی ممتاز ترین شخصیت تھے اور فقہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ علماء کے نزدیک جناب زید کی بغاوت ظلم کے خلاف اہل علم اور صالحین کی بغاوت تھی۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جناب زید کی فوج فقہاء اور قاریان قرآن پر مشتمل تھی۔ امام ابوحنیفہؒ جنھوں نے دو سال تک مختلف علوم جناب زید سے حاصل

کیے تھے کہتے ہیں۔ ''میں نے زید کے زمانے میں اُن کے پائے کا عالم نہیں دیکھا اور ایسا بھی کوئی شخص نہیں دیکھا جو اُن کی مانند حاضر جواب ہو زید واقعی بے نظیر تھے۔'' پھر وہ کہتے ہیں: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لوگ اُن کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور جیسے اُن کے باپ کو دھوکا دیا تھا ویسے انھیں دھوکا نہیں دیں گے تو میں اُن کی رکاب میں لڑتا کیونکہ وہ ایک حقیقی رہنما ہیں۔ میں نے انھیں دس ہزار درہم کی امداد بھیجی اور اُن سے معذرت بھی کی۔''

فقیہوں، قاریوں، محدثوں اور صالح لوگوں کے معرکوں کا اہتمام اسی طرح ہوتا ہے (سرحد پار سے کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں آتا۔ اگر انھیں کسی ایسی مدد کی پیشکش بھی کی جائے تو وہ قبول نہیں کرتے)۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم اور اعلیٰ اخلاق اولاد رسولؐ کا ایسا ورثہ ہے جو انھیں اپنے بزرگوں سے ملا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ اُن کی روح میں سما گئی ہے اور اُن کا مقدس لہو اُن کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ ائمہ اہلبیتؑ کی ہر صفت پر سیرت رسولؐ اور امام علیؑ کی کریمانہ روح کی گہری چھاپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہمعصر اُن کی عزت کرتے تھے اور اب بھی شیعہ اور غیر شیعہ اُن کا ادب کرتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اُن جیسا اعلیٰ اخلاق دوسروں میں خال خال دیکھنے میں آتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کی شخصیت میں علم اور اعلیٰ اخلاق کے سوا کچھ نہیں دیکھا اور اُن جیسا اور ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ جیسا کسی کو نہیں پایا۔ امام مالک، امام جعفر صادقؑ کا بے حد احترام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مدینہ میں ان جیسا کوئی نہیں ہے۔

امام علیؑ کی تمام اولاد بالخصوص پہلی اور دوسری صدی میں جناب زید اور اُن کے بھائی خاندانی شرافت و وجاہت اور بہترین اخلاق کے مالک تھے کیونکہ اُن کی تربیت امام زین العابدینؑ کے زیر سایہ ہوئی تھی جن کے اخلاق، عالی ظرفی اور علم

محتاج بیان نہیں۔ ان حضرات میں بہترین نمونہ جناب زید تھے جو ستودہ صفات اور عظمت کے مالک تھے اور جنھوں نے اپنی متاعِ جان اللہ کی راہ میں لٹا دی۔

ولید بن یزید بن عبد الملک

۱۹ سال اور چند ماہ حکومت کرنے کے بعد ہشام مرا تو ولید بن یزید نے مسند خلافت سنبھال لی۔ اُس کی ماں کا نام اُم الحجاج تھا۔ وہ محمد بن یوسف ثقفی کی بیٹی اور حجاج بن یوسف ثقفی کی بھتیجی تھی۔ مورخین متفق ہیں کہ ولید عیش و عشرت، سیر و شکار، شراب اور عورتوں کا رسیا تھا۔ وہ پہلا فرمانروا تھا جس نے حکم دیا کہ پیشہ ور گویے اس کے دربار میں بھیجے جائیں۔ وہ انتہائی نازیبا حرکتیں کرتا تھا۔[1] اُس کے

[1] مشہور کالم نگار جاوید چوہدری کے ۷ دسمبر ۲۰۰۹ء کو روزنامہ ایکسپریس کراچی میں چھپنے والے کالم بعنوان "محمد شاہ رنگیلا" سے اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ اس کالم میں موصوف نے اگرچہ قدیم و جدید دنیا کے بہت سے رنگیلوں کا ذکر کیا ہے مگر بنی امیہ اور بنی عباس کے رنگین مزاج حکمرانوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ شاید موصوف اُن کو اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ مانتے ہوں۔ بہرحال جاوید چوہدری لکھتے ہیں:
"شہزادے کا اصل نام روشن اختر تھا۔ وہ شاہ جہاں خجستہ اختر کا بیٹا اور شاہ عالم بہادر شاہ اول کا پوتا تھا۔ سید برادران نے اسے جیل سے رہا کرایا اور ۱۷ ستمبر ۱۷۱۹ء کو تخت پر بٹھا دیا۔ اُس نے اپنے لئے ناصر الدین محمد شاہ کا لقب پسند کیا لیکن تاریخ نے اسے محمد شاہ رنگیلا کا نام دیدیا۔ محمد شاہ رنگیلا ایک عیش طبع غیر متوازن شخص تھا۔ چوبیس گھنٹے نشے میں دھت رہتا تھا اور رقص و سرود اور فحاشی و عریانی کا دلدادہ تھا۔ وہ قانون بنانے اور قانون توڑنے کے خبط میں بھی مبتلا تھا۔ وہ ایک ایسا پارہ صفت انسان تھا جو اچانک کسی شخص کو ہندوستان کا اعلیٰ ترین عہدہ سونپ دیتا تھا اور جب چاہتا وزیر اعظم کو کھڑے کھڑے جیل بھجوا دیتا تھا۔ وہ اکثر دربار میں ننگا آجاتا تھا اور درباری بھی اُس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری میں کپڑے اتار دیتے تھے۔ وہ بعض اوقات جوشِ اقتدار میں دربار عام میں پیشاب کر دیتا تھا اور تمام معزز وزراء، دلی کے شرفاء اور اُس وقت کے علماء اور فضلاء واہ واہ کہہ کر بادشاہ سلامت کی تعریف کرتے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے حکم دیتا تھا کل تمام درباری زنانہ کپڑے پہن کر آئیں اور فلاں فلاں وزیر پاؤں میں گھنگرو باندھیں گے اور وزراء اور درباریوں کے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ وہ دربار میں آتا تھا اور اعلان کر دیتا

ایک شعر کا ترجمہ ہے کہ "شراب کا پیالہ ایک تازہ چشمہ ہے۔ اگر میں اسے نہ چکھوں تو زندہ نہیں رہ سکتا۔"

شام کے ایک گویے ابو کامل کے بارے میں ولید نے کہا: میری طرف سے ابو کامل سے کہہ دو کہ جب تک وہ میرے پاس نہیں آئے گا میں اُس عورت کی طرح پریشان خیال رہوں گا جس کا بیٹا مر گیا ہو۔

مسعودی لکھتا ہے: ابن عائشہ نے ایک گیت گایا تو ولید خوشی سے بے حال ہوگیا اور کہنے لگا: اے میری فوج کے سالار! تو نے اچھا گایا ہے۔ تجھے عبد شمس کا واسطہ یہی گیت پھر گا۔ ابن عائشہ نے وہ گیت دوبارہ گایا۔ پھر ولید نے کہا کہ تجھے امیہ کا واسطہ یہی گیت پھر گا۔ ابن عائشہ نے وہی گیت پھر گایا۔ تب ولید اٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے اپنے آپ کو گویے پر گرا دیا اور اس کا سارا بدن چوما۔ وہ اُس کا عضو تناسل بھی چومنا چاہتا تھا لیکن ابن عائشہ نے اسے اپنی رانوں کے درمیان چھپا لیا۔ ولید نے کہا: واللہ! جب تک میں تیرا یہ عضو چوم نہ لوں تجھے جانے نہیں دوں گا

تھا کہ جیل میں بند تمام مجرموں کو آزاد کر دیا جائے اور اتنی ہی تعداد کے برابر مزید لوگ جیل میں ڈال دیے جائیں۔ بادشاہ کے حکم پر سپاہی شہروں میں نکلتے تھے اور انھیں راستے میں جو بھی شخص ملتا تھا وہ اسے پکڑ کر جیل میں پھینک دیتے تھے۔ وہ وزارتیں تقسیم کرنے اور خلعتیں پیش کرنے کا بھی شوقین تھا۔ وہ روز باؤ لے لوگوں کو وزیر بناتا تھا اور سو پچاس لوگوں کو شاہی خلعت پیش کرتا تھا اور اگلے ہی دن یہ وزارتیں اور یہ خلعتیں واپس لے لی جاتی تھیں۔ وہ طوائفوں کے ساتھ دربار میں آتا تھا اور ان کی ٹانگوں، بازوؤں اور پیٹ پر لیٹ کر کاروبار سلطنت چلاتا تھا۔ وہ قاضی شہر کو شراب سے وضو کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اُس کا حکم تھا ہندوستان کی ہر خوبصورت عورت بادشاہ کی امانت ہے اور جس نے اس امانت میں خیانت کی اُس کی گردن مار دی جائے گی اور اُس نے اپنے دور میں اپنے عزیز ترین گھوڑے کو وزیر مملکت کا اسٹیٹس دیا اور یہ گھوڑا شاہی خلعت پہن کر وزراء کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ محمد شاہ رنگیلا کثرت شراب نوشی کے باعث ۲۶ اپریل ۱۷۴۸ء کو انتقال کر گیا لیکن آج بھی جب تاریخ محمد شاہ رنگیلا تک پہنچتی ہے تو اُس کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ محمد شاہ رنگیلا اس نوعیت کا واحد کردار نہیں تھا۔ انسانی تاریخ ایسے سینکڑوں، ہزاروں کرداروں سے لتھڑی پڑی ہے۔"

بالآخر اس نے اُس کا عضو تناسل بھی چوما، اسے ایک ہزار دینار انعام دیا اور ایک خچر پر سوار کر کے کہا "شاہی قالین عبور کرو۔"

ولید نے اپنے باغ میں شراب کا ایک حوض بنوایا تھا۔ جب اُسے نشہ چڑھ جاتا تو وہ حوض میں کود جاتا اور طوائفوں کے ساتھ اُس میں نہایا کرتا تھا۔ اُس کی بلانوشی کے مضر اثرات ظاہر ہوئے اور ایک دن اُس نے اپنی بیٹی پر مجرمانہ حملہ کیا اور بولا "جو لوگوں کی پروا کرتا ہے وہ پریشانی سے مرجاتا ہے۔" (مُرُوجُ الذہب)

قرآن مجید — تیراندازی کا ہدف

مسعودی کہتا ہے کہ ایک دن ولید نے قرآن مجید کھولا اور یہ آیت سامنے آئی:
وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ
"اور پیغمبروں نے خدا سے فتح کے لئے دعا کی تو ہر ضدی سرکش تباہ ہوا اور اُس کے بعد اس کے لئے جہنم ہے جہاں اُسے پیپ والا پانی پلایا جائے گا۔" (سورۂ ابراہیم: آیت ۱۵۔۱۶)

ولید نے قرآن مجید پر تیر برسائے اور کہا: کیا تم ضدی اور سرکش شخص کو عذاب سے ڈراتے ہو؟ میں ضدی اور سرکش ہوں۔ جب تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے جاؤ تو اسے بتانا کہ اے پروردگار! ولید نے مجھے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

یہ تھے اموی حکمران جو شراب پیتے، بدکاری کرتے، شکار کھیلتے، بندر پالتے اور گویے کی شرمگاہ چومتے تھے۔ رسول اکرمؐ، امام علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ پر سب وشتم کرتے تھے۔ نیک لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ مکینوں کے سروں پر اُن کے مکان کی چھتیں گرا دیتے تھے۔ لوگوں کے اعضاء کاٹ دیتے اور لاشیں قبروں سے نکال کر سولی پر لٹکا دیتے تھے۔

عیش ونوش، راگ رنگ، زنا اور ایسے ہی دوسرے قبیح اعمال نے ولید کو ظلم کرنے سے باز نہیں رکھا اور اُس نے امام علیؑ کی اولاد کے بارے میں اپنا معاندانہ رویہ نہیں بدلا۔ اس نے حکم دیا کہ جناب زید کی میت سولی سمیت جلا دی جائے اور راکھ ہوا میں بکھیر دی جائے۔ ولید کے زمانے میں یحیٰی بن زید نے جوزجان میں جو خراسان کا ماتحت علاقہ تھا لوگوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔ خراسان کے والی مسلم بن احواز مازنی کو ہدایت کی گئی کہ یحیٰی کو قتل کر دیا جائے۔ یحیٰی کی کنپٹی پر ایک تیر مارا گیا جس سے اُن کی موت واقع ہوگئی۔ اُن کا سر کاٹ کر ولید کو بھیج دیا گیا اور بدن جوزجان میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔

مُرُوجُ الذہب (ج ۳، ص ۲۲۵) میں ہے کہ ابھی اُن کا بدن سولی پر لٹکا ہوا تھا کہ ابومسلم خراسانی نے بغاوت کر دی۔ ابومسلم نے مسلم بن احواز کو قتل کر دیا اور یحیٰی کی میت سولی پر سے اتار کر نماز جنازہ پڑھی اور انھیں دفن کر دیا۔ خراسان کے لوگوں نے سات دن تک تمام شہروں میں یحیٰی کا ماتم کیا اور اس سال میں جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام یحیٰی یا زید رکھا۔ اس وقت اُن کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے۔

یہ ہے بنی امیہ کی حکومت کی کارگزاریوں سے متعلق حقائق نامہ جو مسلمان مؤرخین نے قلمبند کیا ہے۔

کمیت اسدی کی خدمات

انسانیت اور اسلام پر بنی امیہ کے مظالم کے خلاف مختلف انقلابی تحریکیں چلیں جن میں سے مندرجہ ذیل تحریکوں نے بڑے اہم نقوش چھوڑے

۱۔ امام حسینؑ کی تحریک (امر بالمعروف ونہی عن المنکر)۔

۲۔ توابین کی تحریک جو سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا انتقام لینے کے لئے جناب سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں اٹھے۔

۳۔ امام حسینؑ کے قتل کا انتقام لینے کے لئے جناب مختار کی تحریک۔

۴۔ جناب زید بن علیؑ بن حسینؑ کی تحریک۔

۵۔ جناب یحیٰ بن زید کی تحریک۔

۶۔ جناب عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر کی تحریک جو مروان کے زمانے میں شہید ہوئے۔ یہ بنی امیہ کے خلاف آخری تحریک تھی۔

حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی اولادوں نے اپنی جانیں انصاف، آزادی اور مساوات کی راہ میں قربان کیں۔ وہ یکے بعد دیگرے جام شہادت نوش کرتے رہے تاکہ اپنی جانوں کا نذرانہ دیکر یہ عظیم مقصد حاصل کرلیں۔ اس کشت وخون اور ان تحریکوں نے ایک ایسا شاعر پیدا کیا جس کا ثانی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنی سچائی، اخلاص، ایثار، اخلاق اور دلاوری کے لحاظ سے بینظیر تھا۔ اس نے سچ کا دفاع کیا اور جھوٹ کو رسوا کیا اور اس کے عوض دولت، شہرت اور منصب کی چیز کا طلبگار نہیں ہوا۔ اس شاعر انقلاب کا واحد مقصد عترت رسولؐ کی حمایت میں آواز اٹھانا تھا۔ جس زمانے میں سچ کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا اور لوگ اونچی آواز میں سانس لینے سے بھی ڈرتے تھے کہ مبادا بے خطا قید نہ کردیے جائیں اُس نے لوگوں کو بولنے کا حوصلہ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ظلم کے ایوان گرادے، ظالموں کا نشان مٹا دے اور انسانوں کو طوق وسلاسل سے آزاد کرادے۔ یہ شاعر کمیت بن زید اسدی تھا۔

مسعودی لکھتا ہے کہ جب کمیت نے اپنا کلام تیار کرلیا تو بصرہ آئے اور مشہور شاعر فرزدق سے ملے۔ انھوں نے فرزدق سے کہا: اے ابو فراس! میں تمہارا بھتیجا ہوں۔ فرزدق نے کہا: اپنے باپ کا تعارف کراؤ۔ انھوں نے اپنے باپ کا تعارف کرایا تو فرزدق نے کہا: تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب بتاؤ کیا کام ہے۔ کمیت نے کہا کہ میں نے کچھ اشعار کہے ہیں۔ چونکہ آپ قبیلہ مضر کے شاعر ہیں اور ان کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے اشعار سنیں اور

مشورہ دیں کہ انھیں شائع یا مخفی رکھوں۔

فرزدق نے کمیت سے ولائے اہل بیتؑ کی خوشبو میں ڈوبا ہوا کلام سن کر کہا کہ تم نے بڑا دلنواز کلام کہا ہے اور زبردست کام کیا ہے۔ تم نے کم نسب لوگوں کو نظر انداز کر کے خاندان عصمت سے عقیدت کا جو اظہار کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ تم صحیح ڈگر پر چل رہے ہو اور تم نے جو کچھ کہا ہے اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ فرزدق نے دو مرتبہ کہا کہ اپنے اشعار شائع کردو اور اسلام کے دشمنوں کو ذلیل کردو۔ بخدا! تم سابقہ اور موجودہ شعراء میں عظیم ترین ہو۔

بعدازاں کمیت واپس مدینہ آئے اور امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب انھوں نے امام کو قصیدۂ میمیہ سنایا تو اس شعر نے امام کو رلا دیا:

"جب فخر بنی ہاشم (حسینؑ مظلوم) کے گلے پر چھری چل رہی تھی تو امت جفا کار خوشی سے فتح کے نعرے لگا رہی تھی۔"

امام باقرؑ نے فرمایا: کمیت! اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں تمھیں انعام دیتا مگر میں تمہارے لئے اسی طرح دعا کرتا ہوں جس طرح حسان بن ثابت کے لئے رسول اکرمؐ نے دعا کی تھی کہ "جب تک تم ہماری حمایت اور نصرت کرو اللہ تمہاری مدد فرمائے۔"

کمیت، عبد اللہ بن حسن سے بھی ملے اور انھیں بھی اپنے اشعار سنائے۔ عبداللہ نے کہا: اے ابو مستہل! میں نے چار ہزار دینار میں ایک جائیداد خریدی ہے اور یہ اس کا بیع نامہ ہے۔ میں چند آدمیوں کو بلاتا ہوں تاکہ وہ اس جائیداد کو تمہارے نام منتقلی کی گواہی دے سکیں۔ کمیت نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میں دوسروں کے لئے اشعار دولت کی خاطر کہتا ہوں لیکن آپ کے بارے میں اللہ کی خاطر کہتا ہوں اور جو اشعار میں اللہ کی خاطر کہوں ان کے لئے رقم قبول نہیں کرتا۔ عبداللہ نے بہت اصرار کیا تو کمیت نے وہ بیع نامہ لے لیا اور چلے گئے۔

چند دن بعد وہ واپس آئے اور عبد اللہ سے بولے کہ فرزند رسولؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میری ایک درخواست ہے۔ عبد اللہ نے کہا: تمہاری جو بھی درخواست ہے ہم قبول کریں گے۔ کمیت نے مذکورہ بیع نامہ انھیں پیش کیا اور کہا: یہ قبول کیجیے۔ عبد اللہ نے بیع نامہ اٹھا لیا اور قبول کرلیا۔

عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر ہاشمیوں سے کہنے لگے کہ کمیت نے تمہاری مدح میں اشعار کہے ہیں اور آج جب لوگوں نے تمہاری مدح کرنا چھوڑ دی ہے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر بنی امیہ کے مظالم آشکار کیے ہیں۔ تمھیں بھی چاہیے کہ ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرو اور جہاں تک ہو سکے ان کی مدد کرو۔ عبد اللہ اس شاعر اہل بیتؑ کے لئے رقم جمع کرنے لگے تو عورتوں نے اپنے زیور تک پیش کر دیے۔ تقریباً ایک لاکھ درہم کی خطیر رقم کمیت کو پیش کی گئی تو انھوں نے کہا: میں نے یہ اشعار خدا و رسولؐ کی خوشنودی کے لئے کہے ہیں اور میں ان کے عوض کوئی رقم قبول نہیں کروں گا۔ اگرچہ عبد اللہ نے بڑی منت سماجت کی لیکن کمیت نہیں مانے لہٰذا جس نے جتنی رقم جمع کرائی تھی وہ اسے لوٹا دی گئی۔

کمیت نے اپنے اشعار میں بنی امیہ کی بداعمالیوں کو نظم کیا تھا۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ بنی امیہ آزاد شدگان کی اولاد ہیں اور رسول اکرمؐ نے ان پر لعنت کی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں کہا کہ امام علیؑ دین و دنیا میں وسیلۂ نجات ہے دنیا کی بھلائی کا انحصار ان کی اطاعت پر ہے اور قیامت کے دن رستگار و کامگار وہ ہے جو دنیا میں ان کا دوست ہے اور ان کے دامان ولایت سے وابستہ ہے۔ کمیت نے یہ اقدام اس وقت کیا جب امام علیؑ پر منبروں سے لعنت بھیجی رہی تھی اور شیعہ کہلانا کافر کہلانے سے زیادہ خطرناک تھا۔ انھوں نے یہ اشعار اس وقت کہے تھے جب حضرت علیؑ کی مدح کرنا ناقابل معافی جرم تھا اور اس کی سزا اعضاء کاٹے جانے، سولی دیے جانے اور زندہ دفن کیے جانے کی صورت میں ملتی تھی۔

کمیت نے بنی امیہ پر نکتہ چینی کی اور انھیں ظالموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا انھوں نے بنی امیہ کے وہ جرائم اور مظالم جن سے ڈاکو اور لٹیرے بھی نفرت کرتے تھے تمام محفلوں میں بیان کیے۔ انھوں نے بنی امیہ سے کہا: اے ظالمو! ہمارا خون چوس چوس کر تمہارے پیٹ پھول گئے ہیں۔ تم عیاشی کر رہے ہو جبکہ ہم تنگدستی اور سختی میں دن گزار رہے ہیں۔

بلاشبہ کمیت نے طبقاتی امتیاز پر اعتراض کیا ہے اور لوگوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ طبقہ ہے جو عیش کرتا ہے، جرم کرتا ہے، خون بہاتا ہے اور دوسرا وہ طبقہ ہے جسے کوڑا سمجھ کے سڑک کے کنارے پھینک دیا جاتا ہے تاکہ وہ سسک سسک کر مر جائے۔

اس موضوع پر جن شیعہ دانشوروں اور شاعروں نے لکھا ہے ان کے سرخیل جناب کمیت بن زید اسدی ہیں۔

جارج جرداق القومیة العربیة (ج ۵، ص ۱۹۰) میں لکھتا ہے:

"جو جابر حکمران انسان اور حیوان میں فرق نہیں کرتے تھے ان کے خلاف شیعوں کے شعری انقلاب کی ابتدا کمیت نے کی۔"

کمیت کہتے ہیں: "امام سیاست دان ہوتے ہیں لیکن ان کی سیاست یہ نہیں ہوتی کہ قوم کے مخدوموں کو چرواہوں کی صف میں کھڑا کر دیں۔ ان کی سیاست عبد الملک، ولید، سلیمان اور ہشام کی طرح نہیں ہوتی۔"

ہشام اور بنی مروان کے بارے میں کمیت نے کہا:

"جب تک وہ منبر پر بیٹھے ہوتے ہیں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں لیکن جب وہ منبر سے نیچے اترتے ہیں تو ہزاروں جرائم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری گفتار پیغمبروں اور رہنماؤں کی طرح دلنشین ہوتی ہے لیکن ہمارا کردار دور جاہلیت کی غمازی کرتا ہے۔"

بنی امیہ نے کمیت کو قید میں ڈالا اور شکنجوں میں کسا مگر اہل بیتؑ کے اس عاشق کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

کمیت کا شعر ہے کہ "میں گھبراتا نہیں اور نہ ہی بنی امیہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے اقتدار کے باوجود پست ہیں۔ اگر میں مرگیا تو شک، تردد، منافقت اور جہالت کی موت نہیں مروں گا۔"

جب بنی امیہ[1] نے کمیت کو قتل کی دھمکی دی تو اس مرد جری نے کہا:

"اے یزید! چیخو چلاؤ، رعب دکھاؤ، بادل کی طرح گرجو اور مجھے دھمکاؤ مگر تمہاری یہ دھمکیاں مجھ پر کارگر نہیں ہوں گی۔"

۱۔ بنی امیہ کے بارے میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک تم پر سب سے سخت فتنہ جو نمودار ہوگا، وہ بنو امیہ کا فتنہ ہوگا کیونکہ یہ خود بھی تاریک ہے اور دنیا کو بھی تاریک کر دے گا۔ اس کا فرمان سب کے لئے عام مگر بلائیں اہل بیتؑ کے لئے خاص ہوں گی۔ جو کوئی اس فتنے میں بینا رہا وہ بلا اور سختی کا شکار ہوگا اور جو نابینا رہا اُس سے مصیبت اور بلا دور رہے گی۔

خدا کی قسم! میرے بعد بنو امیہ تمہارے لئے برے حاکم ثابت ہوں گے اُس شریر اونٹنی کی مانند جو دودھ دوہنے والے کو کاٹ کھاتی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اُسے روندتی ہے اور پاؤں سے پامال کرتی ہے اور اپنے دودھ کو روک لیتی ہے۔

یہ بڑی مدت تک تم پر مسلط رہیں گے۔ یہ صرف اُسی کو صحیح سلامت چھوڑیں گے جو اُن کے لئے مفید ہو یا کم از کم اس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ ان کی آفت اُن سے دور نہ ہوگی تا آنکہ تم میں (کا) دادخواہ ان کے سامنے اس طرح ہو جائے گا جیسے آقا کے سامنے غلام اور متبوع کے سامنے تابع، اُن کا فتنہ تم پر اس بری طرح اور خوفناک طور پر وارد ہوگا کہ نہ اس میں ہدایت کا کوئی مینار ہوگا اور نہ حق کی کوئی ایسی علامت جو دیکھی جاسکے۔"

"(اے بنو امیہ!) دنیا تمہارے لئے شیریں اور لذیذ نہیں بن سکتی اور اس کے پستان سے دودھ پینے کی توانائی تم میں نہیں آئی مگر اس کے بعد کہ تم نے اسے اس حالت میں پالیا کہ اس کی مہار ڈھیلی تھی اور اس کا پالان جنبش میں تھا (اور یہ اسی کا اثر تھا کہ) اس دنیا کا حرام ان صاحبان خلافت تو میوں (قبیلوں) کے نزدیک بے کانٹے کی بیری تھی اور حلال نہ صرف دور بلکہ موجود ہی نہیں تھا (یعنی اُن کی

کمیت اپنی آخری سانس تک بنی امیہ کے خلاف نبرد آزما رہے۔

شیعہ شاعر ڈرتے نہیں تھے۔ وہ بنی امیہ کو اس بات پر ہدف تنقید بناتے تھے کہ وہ اللوں تللوں میں پڑے ہوئے ہیں اور قوم کا برا حال ہے۔

ایک شیعہ شاعر ہمام بن عبد اللہ نے یزید کو ایک نظم بھیجی جس میں لکھا کہ "ہم اس قدر طیش میں ہیں کہ اگر ہم بنی امیہ کا خون پی لیں تب بھی سیر نہیں ہوں گے۔

رفتار و کردار میں اسلام کی کوئی جھلک نہیں تھی) اور یہ گمان نہ کرنا کہ دولت بنو امیہ اسی طرح قائم رہے گی بلکہ بخدا تم نے اُسے ایک عرصہ دراز تک پھیلے ہوئے سایہ کی مانند پایا۔ پس زمین تمہارے لئے خالی ہے اور تمہارے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں اور پیشوایان (حقیقی) کے ہاتھ تم سے رکے ہوئے ہیں۔ تمہاری تلواریں ان پر مسلط ہیں اور اُن کی تلواریں تم سے روک لی گئی ہیں ..."

"اے بنو امیہ! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بہت جلد تم دیکھ لو گے کہ ریاست و دولت تم سے چھن کر دوسروں کے ہاتھ میں آجائے گی اور تمہارے دشمنوں (بنو عباس) کے گھر میں منتقل ہو جائے گی۔"

"یہ فتنہ و فساد کے جھنڈے درحقیقت گمراہی کے پرچم ہیں جو گمراہی کے مرکز میں گڑے ہوئے ہیں اور اپنے شعبوں اور شاخوں کے ساتھ ہر طرف پھیل گئے ہیں اور تمہیں اپنے پیمانے سے وزن کر رہے ہیں اور اپنے ہاتھ سے تمہیں پیٹ رہے ہیں۔ اس بیرق کا قائد اور پرچم دار اسلام سے خارج اور راہ ضلالت پر ایستادہ ہے ..."

"اس زمانے میں تو اینٹ کا مکان اور اُون کا خیمہ بھی ایسا نہ باقی ہوگا کہ جس میں ظلم و ستم کے بانیوں کی سختیاں نہ پہنچ چکی ہوں اور اُن کے مظالم نہ گھس گئے ہوں۔ اُس وقت نہ آسمان میں اُن کا کوئی عذر باقی رہا ہوگا اور نہ زمین پر کوئی مددگار۔

تم نے غیر مستحق کا انتخاب کیا اور خلافت کو نامناسب جگہ پر رکھا اور خدا ظلم کرنے والے سے بہت جلد بدلہ لے گا۔ کھانے کا کھانے اور پینے کا پینے سے۔ کھانے کو ایلوا اور پینے کو حد سے زیادہ تلخ اور کڑوا پانی ملے گا، پہننے کو خوف اور تلوار کا لباس۔ وہ لوگ (بنی امیہ) غلطیوں کی سواری ہیں اور گناہوں کا بوجھ۔" (نہج البلاغہ مترجمہ رئیس احمد جعفری، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور)

"میں قسم پر قسم کھاتا ہوں کہ میرے بعد بنی امیہ کو یہ خلافت اس طرح تھوک دینا ہوگی جس طرح بلغم تھوکا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ مزہ اُن کو قیامت تک چکھنا نصیب نہ ہوگا۔"

(نہج البلاغہ مترجمہ علامہ مفتی جعفر حسین)

قوم بیچاری تباہ ہوگئی ہے لیکن تم ہماری حالت سے لاپروا ہوکر خرگوشوں کا شکار کرتے پھرتے ہو۔"

جوشؔ ہم ادنیٰ غلامان علیؑ مرتضیٰ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہانبانی کے ساتھ

بنی امیہ کی کرپٹ انتظامیہ کے مقابلے پر شیعہ شعراء کی بیباکی کا ایک اور نمونہ فرزدقؔ ہیں۔ انھوں نے ہشام بن عبدالملک کے بارے میں کہا:

"اس کا سر سرداری کے لائق نہیں اور اس کی بھینگی آنکھوں کا عیب عیاں ہے۔"

کمیتؔ کے اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ چاہتے تھے حکومت اولادِ علیؑ کو مل جائے کیونکہ یہ خاندان انصاف قائم کرے گا، لوگوں کے لئے رحمتیں لائے گا اور انھیں اپنی جانب مائل کرے گا۔ یقیناً یہ بزرگوار قیامت کے دن کی سختیوں اور اللہ کے غضب سے بچاؤ کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اپنے مؤقف کی راہ میں کمیتؔ نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ (یہ جو آج کل حقوق، انصاف، آزادی اور مساوات کے نعرے لگ رہے ہیں اس کی بنیاد میں فرزدقؔ، کمیتؔ، دعبلؔ اور ان جیسے کئی جرأت مند اور تاج شکن شاعروں کا لہو شامل ہے)۔

کمیتؔ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے منطقی استدلال بھی کیا۔ بقول جاحظ کمیتؔ نے شیعوں کے استفادہ کے لئے استدلال کا دروازہ کھول دیا۔ کمیتؔ کہتے ہیں:

"اگر خلافت ان چند آدمیوں کے لئے سزاوار ہے تو رسول اللہؐ کے اقربا ان سے سزاوار تر ہیں۔ اگر خلافت موروثی چیز ہوتی تو تمہاری بات درست ہوتی؟ میں کہتا ہوں کہ اگر خلافت موروثی چیز ہے تو بکیل اور ارجب کے قبائل کا بھی اس میں حصہ ہونا چاہیے۔"

اولادِ علیؑ کے بارے میں کمیتؔ کہتے ہیں:

"علیؑ کی اولاد نیک کاموں سے بہت قریب اور برے کاموں سے بہت دور ہے۔ بنی ہاشم حق الناس ادا کرنے میں سب سے زیادہ مہربان اور کارزارِ عقل میں سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔"

"ان کے ہاتھ سخاوت کے لئے تو دراز رہتے ہیں مگر ظلم کے لیے دراز نہیں ہوتے۔ جب اسلام ترک کرنے کے اسباب پیدا کئے جاتے ہیں تو وہ اسلام پر قائم رہنے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ بہترین خلائق ہیں خواہ زندہ ہوں یا نہ ہوں۔ میرے دل کی دنیا پر ان ہی کا راج ہے اور وہی اس کے لائق بھی ہیں۔ میں خاندان عصمت کے سوا کسی کی پیروی نہیں کرتا۔ ان کے سوا کون ہے جس کی میں پیروی کروں۔ میں مذہب حق کے سوا کسی مذہب کی پیروی نہیں کرتا۔"

علامہ اقبالؔ کہتے ہیں:

اے محو ثنائے تو زبانہا   اے یوسف کاروان جانہا
اے باب مدینہ محبت   اے نوح سفینہ محبت
اے ماحی نقش باطل من   اے فاتح خیبر دل من

جب ہم کمیتؔ کے کلام پر غور کرتے ہیں تو ان میں ایسا خلوص نظر آتا ہے جسے ہر ہر مرحلے پر برقرار رکھا گیا ہے۔ جوں جوں ان پر سختیاں بڑھتی گئیں ان کا ایمان اور زیادہ پختہ ہوتا گیا۔

علیؑ اور اولادِ علیؑ کی مدح میں کمیتؔ اسدی کے ۵۳۶ اشعار پر مشتمل دیوان الھاشمیات کے نام پہلے یورپ اور پھر مصر سے چھپ چکا ہے۔ نیز عرب اسکالرز اور مستشرقین نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔

جب کمیتؔ اموی عامل یوسف بن عمر ثقفی کے دربار میں موجود تھے تو آٹھ پہرے داروں نے ان پر تلواروں سے حملہ کیا اور اس وقت چھوڑا جب انھوں نے یہ سمجھا کہ اب یہ مر چکے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کمیتؔ نے آنکھیں

کھولیں اور کہا: اَللّٰهُمَّ آلِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ آلِ مُحَمَّدٍ، اَللّٰهُمَّ آلِ مُحَمَّدٍ.
محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیجتے ہوئے کمیت تو دنیا سے چلے گئے لیکن جس عقیدے کی راہ میں انھوں نے جان دی وہ آج مشرق و مغرب میں رہنے والے کروڑوں انسانوں کا عقیدہ ہے جو اسلام اور قرآن کے ساتھ ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔ کمیت اسدی کا پیغام، ان کی سیاست اور ان کا عقیدہ صرف ایک بات اجاگر کرتا ہے اور وہ ہے اولادِ علیؑ سے پرخلوص محبت کرنا اور دنیا و آخرت کے امور میں ان پر اعتماد کرنا کیونکہ وہ حق و انصاف اور مساوات کے بہترین نمونے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کمیت نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جہاد کیا اور اس راہ میں شہادت کا بلند مرتبہ پایا۔

بنی عباس

بنی امیہ کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں ہوتی رہیں اور تحریکیں چلتی رہیں۔ اموی دور کے اوائل میں ہونے والی بغاوتوں اور تحریکوں پر جلد قابو پالیا جاتا تھا کیونکہ اُن کی نوعیت ہمہ گیر نہیں ہوتی تھیں لیکن اموی حکومت کے آخری دور میں مروان حمار کے خلاف جو ہمہ گیر بغاوت اور سول نافرمانی ہوئی اُس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس بغاوت میں عوام کے مختلف طبقے اُس کے خلاف ہوگئے فوج اور پولیس نے اُس کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا اور دوستوں نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بالآخر مروان کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ داد و دہش اور عہدوں کا لالچ بھی اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

فوج کی ایک بڑی تعداد نے مروان کے خلاف بغاوت کردی چنانچہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگتا پھرا۔ جب بھی وہ کسی شہر میں داخل ہوتا تو وہاں کے لوگ اسے آڑے ہاتھوں لیتے۔ جب وہ موصل پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اُس کے خلاف نعرے بازی کی اور شہر کے دروازے بند کر دیئے۔ جب قنسرین گیا تو لوگوں نے اُس کے لشکر پر ہلہ بول دیا اور جب حماۃ گیا تو وہاں بھی اُس کے خلاف شدید ہنگامہ آرائی ہوئی چنانچہ وہ شام واپس آگیا مگر اہل شام نے بھی اسے نکال باہر کیا۔ بالآخر فلسطین چلا گیا مگر فلسطینیوں نے بھی اُس سے منہ موڑ لیا۔ الغرض اس شہریار کو کسی شہر میں پناہ نہ ملتی تھی۔

ان تمام شہروں میں بنی عباس کی فوج مروان حمار کا پیچھا کرتی رہی تا آنکہ ۱۳۲ھ کے اواخر میں اُس نے مصر کے نواحی شہر بوصیر میں اسے جا لیا اور قتل کر دیا۔ اس قتل کے ساتھ ہی بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ پس جس قوم نے ظلم کیا اُس کی جڑ کاٹ دی گئی اور تمام تعریف خدا ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ (سورۂ انعام: آیت ۴۵)

ایک ہزار مہینے کی حکومت

مسعودی کہتا ہے: ”اُس وقت تک جب ابو العباس سفاح کے ہاتھ بیعت کی گئی بنی امیہ کی حکومت کی کل مدت ۱۰۰۰ مہینے تھی کیونکہ بنی امیہ نے ۹۰ سال ۱۱ مہینے اور ۱۳ دن حکومت کی۔“

تفسیر رازی میں ہے کہ قاسم بن فضل، امام حسنؑ سے روایت کرتے ہیں: رسول اکرمؐ نے خواب میں دیکھا کہ بنی امیہ آپ کے منبر پر بندروں کی طرح اچھل کود رہے ہیں۔ یہ خواب دیکھ کر آنحضرتؐ بہت پریشان ہوئے تو خدا نے سورۂ قدر نازل کی اور اپنے حبیبؐ کو بتایا کہ ایک شب قدر بنی امیہ کی ہزار مہینے کی حکومت سے بہتر ہے۔ قاسم کہتا ہے: جب ہم نے حساب کیا تو پتا چلا کہ بنی امیہ کا دور حکومت ایک ہزار مہینے کا تھا۔[1]

۱۔ بنی امیہ کی حکومت کی کل مدت ۱۰۹۱ مہینے ہے اور مسعودی نے مروج الذهب جلد دوم کے صفحہ ۱۵۶ پر جو فہرست دی ہے اُس کے مطابق یہ مدت ۱۳۲۵ مہینے اور ۲۴ دن بنتی ہے۔ امام حسنؑ اور ابن زبیر کی حکومت کے ۹۹ مہینے اور ۱۳ دن نکال کر یہ مدت ۱۲۲۶ مہینے اور ۱۳ دن رہ جاتی ہے لہٰذا بنی امیہ کی حکومت کی میعاد کے بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے چنانچہ بنی امیہ کا ۱۰۰۰ مہینے حکومت کرنا ایک حتمی تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ اس کو سورۂ قدر میں ”الف شہر“ ایک ہزار مہینے سے تطبیق دیا جاسکے۔

بنی عباس کا اس صورتحال سے فائدہ اٹھانا

اُس وقت عالم اسلام ایک عجیب بے چینی اور بدامنی کی گرفت میں تھا۔ سب لوگ بوجوہ بنی امیہ کی حکومت سے تنگ تھے۔ اُن کے دل و دماغ اولادِ علیؑ کی جانب مائل تھے۔

۱۔ بنی امیہ کے خلاف بغاوت ”دین“ کے نام پر اور ”اسلام“ کے تحفظ کی خاطر کی گئی تھی۔ فرزندان رسولؐ دین کے امین اور اسلام کے محافظ تھے۔ اگر وہ عنان حکومت سنبھال لیتے تو سنت رسولؐ کے مطابق عمل کرتے، عدل قائم کرتے اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرتے۔

۲۔ پہلا گروہ جو ظلم اور ظلمتوں کے سوداگروں کے خلاف اٹھا اور اُن سے برسرپیکار ہوا وہ اولادِ علیؑ اور شیعیان علیؑ کا گروہ تھا۔ انھوں نے اس راہ میں اپنے مال اور اپنی جانوں کی قربانی دی۔ انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ جس کسی کا نقصان کیا گیا ہے اُس کا کلیم قبول کیا جائے اور اُن کے نقصان کی تلافی کی جائے۔

۳۔ اولادِ علیؑ اور شیعیان علیؑ ایک مضبوط ”حزب مخالف“ کے طور پر بنی امیہ کے خلاف گلی محلوں میں چھپ چھپ کر تحریک منظم کرتے تو حکومت پکڑ دھکڑ کرتی تشدد کرتی، جیلوں میں پھینک دیتی اور قتل تک کر دیتی جیسا کہ ابن اثیر کی تاریخ کامل کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے:

”اموی دور سے نجات پانے کا دن لوگوں نے یوم تشکر کے طور پر منایا اُن کا خیال تھا کہ اب بنی امیہ کی جگہ اولاد رسولؐ حکومت کرے گی کیونکہ بنی عباس حضرت امام حسینؑ، جناب زید اور جناب یحییٰ کی شہادت کے انتقام کا نعرہ لے کر اٹھے تھے۔ انھوں نے امویوں کے ساتھ شیعوں کے جھگڑے اور اولاد علیؑ کے ساتھ اپنی وابستگی کا بھرپور فائدہ اٹھایا مگر کون جانتا تھا کہ بنی عباس اپنی آستینوں میں خنجر چھپائے ہوئے تھے۔

شروع شروع میں بنی عباس کہتے تھے کہ ہمارا مقصد بنی امیہ کا تختہ الٹنا اور لوگوں کو ظلم سے نجات دلانا ہے۔ جب بنی امیہ کا معاملہ ختم ہو جائے گا تو ہم اتفاق رائے سے فرزندان رسولؐ میں سے کسی کو اپنا امیر چن لیں گے۔

تحریک کے شروع میں بنی عباس نے اپنوں یا دوسروں میں سے کسی کو امیر نامزد نہیں کیا بلکہ فقط اپنے پہلے مقصد یعنی بنی امیہ کی شکست کی بات کی جیسے فرانس اور برطانیہ نے ترکی کے خلاف عربوں کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیتے وقت کہا تھا کہ اُن کا مقصد عربوں کو ترکوں کے مظالم سے آزادی دلانا ہے اور فتح پالینے کے بعد وہ حکومت عربوں کے سپرد کردیں گے لیکن انھوں نے عربوں کے ساتھ دھوکا کیا اور ترکی کی شکست کے بعد فرانس نے شام و لبنان پر اور برطانیہ نے عراق و اردن پر قبضہ کرلیا اور فلسطین بطور تحفہ اسرائیل کو دیدیا۔[1]

مشہور مستشرق ویل ہاسن تاریخ الدولۃ العربیہ میں لکھتا ہے:

''بنی عباس نے بنی فاطمہ کو حکومت سے محروم رکھنے کے بارے میں اپنے ارادے مخفی رکھے۔ وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے کہتے تھے کہ ہم اولاد فاطمہؑ کے

۱۔ اخلاق مطلق Absolute ہوتا ہے یا نسبی Relative ہوتا ہے اس سلسلے میں استاد مرتضیٰ مطہری اپنی کتاب سیری در سیرۂ نبویؐ میں لکھتے ہیں:

''رسول اکرمؐ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک تمام دینی رہبروں نے ''باطل اخلاقی اصولوں'' کو مسترد کیا ہے کیونکہ ایسے اصولوں کو ہر صورت میں مسترد کردینا چاہیے۔

وہ لوگ جو اخلاق کو ایک نسبی چیز بتاتے ہیں ''دھوکا دہی کا اصول'' ان کے نزدیک کیسا ہے؟ دنیا کے تقریباً تمام سیاست دان دھوکا دیتے ہیں۔ بعض سیاست دانوں کی تو پوری سیاست ہی دھوکا دہی پر مبنی ہوتی ہے جبکہ بعض کبھی کبھی دھوکا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سیاست میں ''اخلاقیات'' بے معنی چیز ہے۔ ایک سیاست دان وعدہ کرتا ہے اور قسم کھاتا ہے لیکن وہ اپنے وعدے اور قسم پر اُس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اُس کا مفاد ہوتا ہے۔ مفاد حاصل ہوتے ہی وہ اپنا وعدہ توڑ دیتا ہے۔ اُن کے بقول وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

میں نے چرچل کی اُس کتاب کے چند اقتباسات پڑھے ہیں جو اُس نے دوسری عالمی جنگ کے

حق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ خراسان اور بعض دوسری جگہوں پر انھوں نے کہا کہ وہ بنی فاطمہؑ کے خون ناحق کا گن گن کر حساب لیں گے۔ اس طرح وہ شیعوں کی حمایت سے اور اُن کے کندھوں پر چڑھ کر اقتدار کے سنگھاسن تک پہنچنا چاہتے تھے۔ جب شیعہ شراکت اقتدار کی بات کرتے تو وہ کہتے کہ ہم مل بیٹھ کر اس مسئلے کو بعد میں حل کرلیں گے۔ بنی عباس نے علویوں اور شیعوں کے نام پر جو بنی امیہ کے خلاف بھرپور تحریک چلا رہے تھے حکومت حاصل کرلی۔ جب حکومت مل گئی تو بنی عباس نے علویوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس طرح انھوں نے سنگ دلی اور ظلم کا مظاہرہ کیا۔

بنوعباس کون ہیں؟

ظلم و ستم اور بدکرداری کے معاملے میں بنی عباس دوسرے بنی امیہ تھے۔ کھلم کھلا گناہ کرنے اور کفر کا اظہار کرنے میں اُن دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا

بارے میں لکھی ہے اور جسے ایران کے اخبارات قسط وار شائع کرتے تھے۔ اُس کتاب میں ایران پر اتحادیوں کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے چرچل کہتا ہے کہ ''ہم نے ایرانیوں سے وعدہ کیا تھا اور اُس وعدے کے مطابق ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' پھر خود ہی کہتا ہے:

''یہ عہد اور ایفائے عہد چھوٹے پیمانے پر تو اچھی چیز ہے۔ جب دو افراد ایک دوسرے سے وعدہ کریں تو انھیں وعدہ پورا کرنا چاہیے لیکن سیاست میں جب ایک قوم کے مفاد کی بات آتی ہے تو اخلاق بیکار چیز ہے۔ میں اس اعتبار سے برطانیہ عظمیٰ کے مفادات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک ملک سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دینا خلاف اخلاق ہے۔ یہ باتیں وسیع تناظر میں درست نہیں ہوتیں۔'' دھوکا دہی کا یہی اصول ہمیں معاویہ کی سیاست میں نظر آتا ہے۔ جو چیز امام علیؑ کو دوسرے سیاست دانوں سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ دھوکا نہیں دیتے تھے خواہ حکومت ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ امام علیؑ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے پاسبان تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ میری حکومت کا مقصد ان اصولوں کی حفاظت کرنا ہے۔ سچائی کی حفاظت، امانت کی حفاظت، ایفائے عہد کی حفاظت اور میں ان ہی باتوں کے لئے خلیفہ بنا ہوں۔ میں کیسے ان اصولوں کو پامال کردوں؟!

اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے دلوں میں دین یا مقدسات دین کا کوئی پاس لحاظ نہ تھا۔ اُن کی آنکھیں بس دولت دنیا پر لگی ہوئی تھیں اور اُن کی خواہشوں کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ لوگوں کو ذبح کرتے ، اُن کے بدن سولی پر لٹکاتے اور جو زندہ ہوتے اُن کے سروں پر گھروں کی چھتیں گرا دیتے تھے۔ ابراہیم اور اُس کا بھائی سفاح معاویہ کی طرح تھے ۔منصور اور ہارون ،ہشام کی مانند تھے اور متوکل یزید بن معاویہ کا دوسرا روپ تھا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے حکمران اپنی کرسی مضبوط کرنے کے لئے خون بہاتے ہیں یا اُن کے اپنے الفاظ میں امن و امان قائم کرنے کے لئے بدامنی پیدا کرتے ہیں لیکن بنی امیہ کے بارے میں جو بیان گزر چکا اور بنی عباس کے بارے میں جو کچھ بیان ہو گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مقصد سلطنت کا استحکام یا امن و امان کا قیام نہیں بلکہ خیانت اور خونریزی تھا۔

''جب اپنی آفاق گیر برائیوں کی وجہ سے بنی امیہ کیفر کردار کو پہنچنے لگے اور مظلوموں کا خون بہانے کے نتیجے میں اُن پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور پوری سلطنت میں بغاوت پھیل گئی تو ابوالعباس سفاح کے بھائی ابراہیم[1] نے ابومسلم خراسانی کو خراسان بھیجا اور کہا: ''میری ہدایات غور سے سنو ! اہل یمن میں دلچسپی لو۔ اُن کی عزت کرو اور اُن کے ساتھ میل جول بڑھاؤ کیونکہ خدا خلافت کو اُن کے ذریعے مکمل کرتا ہے۔ قبیلۂ ربیعہ کو بدنام کرو اور کہو کہ قبیلۂ مضر کے دن گنے جا چکے ہیں۔ جن لوگوں پر تمھیں شک ہو انھیں قتل کر دو اور اگر ہو سکے تو خراسان سے عربوں کا صفایا کر دو۔ ہر اُس لڑکے پر جس کا قد ایک میٹر ہو الزام لگاؤ اور اُسے قتل کر دو۔''

احمد بن علی مقریزی اپنی کتاب النزاع والتخاصم فی ما بین بنی امیہ و بنی ہاشم میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: خدا تمھیں عزیز رکھے! ایسی

۱۔ مروان حمار نے ابراہیم کو قید کر دیا۔ اسے قید خانے میں ہی قتل کر دیا گیا یا زہر دے دیا گیا۔

ہدایات کا اُن ہدایتوں سے کیا تعلق ہے جو خلفائے راشدین اپنے عمال کو دیا کرتے تھے؟ خدا کی قسم ! اگر ابومسلم کو مشرکین سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوتا تب بھی ایسی ہدایات دینا جائز نہ تھا جبکہ اس وقت اُسے ایک اسلامی علاقے میں بھیجا جا رہا تھا۔ اُس سے خواہش کی گئی کہ مہاجر و انصار کی اولادوں کو بلکہ تمام عربوں کو نیست و نابود کر دے اور وہ علاقے چھین لے جو انھوں نے دشمن سے اور اپنے آباء و اجداد سے حاصل کئے تھے۔ عباسی چاہتے تھے کہ زمینوں پر قبضہ کریں ، بیت المال سے موج اڑائیں اور خلق خدا کو اپنا غلام بنائیں۔

ابومسلم نے ابراہیم کی ہدایات پر عمل کیا۔ سوال یہ ہے کہ ابراہیم کے الفاظ ''جن اشخاص پر تمھیں شک ہو انھیں قتل کر دو'' اور معاویہ کے الفاظ ''جس شخص پر علیؑ کے شیعہ ہونے کا شبہ ہو اُسے کڑی سزا دو اور اُس کا گھر ڈھا دو'' میں کیا فرق ہے؟

ابوالعباس سفاح نے محمد بن صول کو موصل کا عامل مقرر کیا تو اہل موصل نے اُس کی اطاعت قبول نہ کی۔ اُس نے سفاح کو لکھا کہ اُس کی جگہ کسی اور کو بھیج دے۔ سفاح نے اپنے بھائی یحییٰ کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ اتنا بڑا لشکر دیکھ کر اہل موصل ڈر گئے اور جان کی امان مانگنے لگے۔ انھیں امان دینے کے بعد یحییٰ نے وہ قتل عام کیا کہ خدا کی پناہ ! گلیوں میں اتنا خون جمع ہو گیا تھا کہ راہگیروں کے پاؤں اُس میں ڈوب جاتے تھے۔ رات کو یحییٰ نے جب اُن عورتوں کے بین سنے جن کے شوہر مارے گئے تھے تو اُس نے کہا کہ ان عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کر دو۔ یہ قتل عام تین دن تک جاری رہا۔ (تاریخ کامل ، ابن اثیر ج ۴ ، ص ۳۴۰)

جب ہم ابراہیم کی ہدایات سے اس واقعہ کا تقابل کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ظلم ڈھانے میں بنی عباس ، بنی امیہ سے دو ہاتھ آگے تھے۔ اگر ہم تناسخ کے قائل ہوتے تو کہہ سکتے کہ معاویہ اور حجاج کی ظالم روحیں ابراہیم اور یحییٰ میں حلول کر گئی تھیں۔

سفاح عباسی

سفاح کا نام عبداللہ اور کنیت ابوالعباس تھی۔ وہ بنی عباس کا پہلا حکمران تھا۔ ۱۳۲ھ میں اُس کی بیعت کی گئی۔ وہ چار سال سے کچھ اوپر حکومت کرنے کے بعد ۱۳۶ھ میں مرگیا۔ عباسی آئے تو تھے بنو امیہ کے مظالم کی تلافی کا دعویٰ لے کر لیکن جب انھیں حکومت مل گئی تو انھوں نے ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری میں بنو امیہ کو بھی مات کر دیا اور حتی الامکان بنی امیہ کے ایک ایک فرد کو ڈھونڈھ نکالا اور چن چن کر بڑے وحشیانہ طریقے سے قتل کیا۔

جب تک سفاح کو یہ احساس رہا کہ بنی امیہ کی جان میں جان باقی ہے وہ نچلا نہیں بیٹھا۔ اُس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اُن سب لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا جن کی وفاداری مشکوک تھی یا جن سے حکومت بنی عباس کو خطرہ تھا جیسا کہ اُس نے ابی سلمہ خلال کے ساتھ کیا۔ اُس کے بھائی یحییٰ نے موصل میں، اُس کے ایک چچا نے حجاز میں، دوسرے چچا سلیمان نے بصرہ میں اور ابومسلم نے خراسان میں ایسے ہی اقدامات کیے۔ بخارا میں شریک بن شیخ مہری کا ابومسلم سے جھگڑا ہوگیا۔ شریک نے کہا: تمھیں عدل سے کام لینا چاہیے۔ ہم نے بنی عباس کی بیعت اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ خون بہائیں۔ یہ سن کر ابومسلم نے اسے قتل کر دیا اور اس کے تیس ہزار ساتھیوں کو سزائیں دیں۔

ابوالعباس کو سفاح یعنی خونی کا لقب اس لئے دیا گیا کہ اس نے بہت خون بہایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اموی خاندان کے ۸۰ افراد کو بلا بھیجا تاکہ انعامات حاصل کریں اور کھانا کھائیں۔ جب وہ آگئے تو اُس نے حکم دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ پھر اُن کی نیم مردہ لاشوں پر قالین بچھا کر کھانا کھایا کھانا ختم ہوا تو سفاح نے کہا: ''میں نے آج تک اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا۔''

بنی امیہ اس بات کے مستحق تھے کہ انھیں قتل کیا جاتا لیکن انھیں دعوت پر بلا کر

کر قتل کر دینا اور اُن کی لاشوں پر بیٹھ کر کھانا کھانا ایسی مجرمانہ اور پست ذہنیت ہے جو بنی امیہ کے حصے میں بھی نہیں آئی تھی۔ بہت سے لوگوں نے بالخصوص شعراء نے بنی عباس کو بنی امیہ کا خون بہانے پر اکسایا۔ صرف امام علیؑ کی اولاد تھی جس نے عباسیوں کو بے دھڑک امویوں کا خون بہانے سے روکا اور اُن میں سے جو زندہ تھے ان کی حفاظت کے لئے عذر تراشے۔

اگرچہ بنی امیہ کے بیشتر جرائم کا نشانہ اولاد علیؑ بنی تھی لیکن انھوں نے انتقام کے انداز میں نہیں سوچا کیونکہ وہ اُن صالح بزرگوار کی نسل سے تھے جنھوں نے جنگ صفین میں عمرو بن عاص کی جان بخشی کردی تھی، جنگ جمل میں مروان کو معاف کر دیا تھا اور گھاٹ پر قبضہ کرلینے کے بعد معاویہ اور اُس کی فوج کو پانی استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی (حالانکہ پہلے جب معاویہ نے گھاٹ پر قبضہ کیا تھا تو اُس نے ان پر پانی بند کر دیا تھا) اور فرمایا: جب تم دشمن پر فتح پالو تو عفو کو اپنی فتح کا شکرانہ قرار دو۔ امام علیؑ کی اولاد کا طرز عمل کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اس گھرانے کے فرد تھے جو عدل اور تقویٰ کا گھرانہ تھا۔

ابن اثیر لکھتا ہے: بنی عباس کے ایک عامل داؤد بن عروہ نے بنی امیہ کو مکہ مدینہ سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ بن حسن بن حسن نے اُس سے کہا: اگر تم بنی امیہ کو قتل کردو گے تو اپنی طاقت کا مظاہرہ کس کے سامنے کرو گے۔ کیا اُن کے لئے یہ اذیت کافی نہیں کہ وہ دن رات تمھیں مسند اقتدار پر بیٹھا دیکھیں اور کڑھتے رہیں؟ تاہم داؤد بن عروہ نے اُن کی بات نہیں مانی اور اُن سب کو قتل کرا دیا۔ (تاریخ کامل ج ۱، ص ۳۴)

لوگ سوچ رہے تھے کہ سفاح اولاد علیؑ و شیعیان علیؑ سے ترجیحی سلوک کرے گا کیونکہ علویوں، شیعوں اور عباسیوں نے مل کر بنی امیہ کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ بنی عباس نے علویوں کا نام استعمال کیا۔ اُن کا ''سیاسی نعرہ'' یہی تھا کہ ہم اولاد علیؑ

کے حامی ہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ لوگ بنی عباس کے مقابلے میں اولادِ علیؑ کی زیادہ عزت کرتے ہیں اور اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔

شعراء اور بنی عباس

برا ہو نشہ اقتدار کا کہ حکومت ملتے ہی بنی عباس علویوں اور شیعوں سے دور ہوگئے۔ محمد احمد براق اپنی کتاب "ابوالعباس سفاح" کے صفحہ ۴۸ پر لکھتا ہے:

"انقلاب کی بنیاد دراصل اولادِ علیؑ نے رکھی تھی کیونکہ خراسان[۱] کے لوگوں کی اکثریت اہلِ بیتؑ سے محبت کرتی تھی۔[۲] انھیں بنی عباس سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

۱۔ خراسان پہلوی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی مشرق یا سورج کے طلوع ہونے کی سرزمین ہے۔ پہلے زمانے میں اسے خراسان بزرگ کہتے تھے۔ خراسان بزرگ کی حدود میں موجودہ ایران کے شہر نیشاپور، طوس اور مشہد کے علاوہ موجودہ افغانستان کے شہر ہرات، بلخ، کابل اور غزنی، موجودہ ترکمانستان کے شہر مرو اور سنجان، موجودہ ازبکستان کے شہر سمرقند اور بخارا موجودہ تاجکستان کے شہر خوجند اور پنج اکنت اور موجودہ "ایرانی، افغانی اور پاکستانی بلوچستان" شامل تھے۔ آج جہاں مشہد مقدس ہے یہاں دو چھوٹے چھوٹے قصبے ہوتے تھے۔ ایک سناباد جہاں امام رضاؑ مدفون ہیں اور دوسرا قصبہ نوغان تھا جو آج بھی محلّہ نوغان کے نام سے مشہور ہے اور شاہراہ مشہد کے آخری سرے پر واقع ہے۔

۲۔ بلوچی حسب نسب کی نظم جو کہ بلوچی تاریخ کا قدیم ترین ماخذ ہے اس میں جسٹس میر خدا بخش مری کہتے ہیں کہ "ہم حضرت علیؑ کے مرید ہیں۔ ہمارا دین و ایمان محفوظ و مضبوط ہے۔ ہم حلب سے آئے ہیں۔ یزیدیوں سے ہماری جنگیں رہی ہیں۔ ہم واقعۂ کربلا کے بعد بمپور، سیستان اور موجودہ بلوچستان میں پہنچے۔" (جسٹس میر خدا بخش مری، صفحہ ۹۳، مطبوعہ نساد ٹریڈرز، کوئٹہ)

آغا میر نصیر احمد زئی نسب نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ اشعار پندرہویں صدی کے بلوچی شعراء نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے حوالے سے بیان کئے ہیں۔ ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ علیؑ اور اولادِ علیؑ کے طرفدار تھے۔ (تاریخ بلوچ قوم اور بلوچستان، ص ۷۶ تا ۷۷)

خان آف قلات میر احمد یار خان لکھتے ہیں کہ "بلوچوں کا قدیم مسکن حلب، شام ہے۔ معرکۂ کربلا میں اہلِ بیتؑ کی حمایت کرنے کے سبب بلوچ اموی حاکم کے غیض و غضب کا نشانہ بنے۔" (میر احمد یار خان، مختصر تاریخ بلوچ، مطبوعہ ایوان قلات، کوئٹہ)

یہی وجہ تھی کہ سفاح اور بعد میں آنے والے خلفاء خراسان پر بڑی گہری نظر رکھتے تاکہ شیعہ وہاں اُن کے خلاف صف بندی نہ کرسکیں۔"

بنی عباس نے شعراء سے اپنی شان میں قصیدے لکھوائے اور انھیں گرانقدر انعامات سے نوازا چنانچہ شعراء نے اولادِ علیؑ پر نکتہ چینی کی اور انھیں خلافت کے لئے نااہل قرار دیتے ہوئے کہا کہ بنی فاطمہؑ رسولِ اکرمؐ کے مادری رشتے دار ہیں جبکہ بنی عباس آنحضرتؐ کے پدری رشتے دار ہیں۔

شاعروں کو خریدنے کے علاوہ بنی عباس نے اہلِ بیتؑ کا مذہب ترک کردیا اور اہلِ سنت کا مسلک اختیار کرلیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تشیع نہ پھیلے اور اُن کے بعد حکومت اولادِ علیؑ کو نہ ملے۔ اس طرح بنی عباس نے بنی امیہ کا مقصد اور مسلک آگے بڑھایا۔ وہ عقیدہ، سیاست اور اعمال میں اُن کے ہمنوا بن گئے۔ البتہ سفاح نے کسی شیعہ کو قتل نہیں کیا۔ اُس نے دیگر عباسی خلفاء کی طرح کسی شیعہ پر ظلم نہیں کیا کیونکہ اُس کی تمام تر توجہ بنوامیہ کو ختم کرنے اور انقلاب کو مستحکم کرنے پر مرکوز تھی۔ نیز انقلاب سے پہلے تک سفاح شیعوں کے ساتھ مل کر بنی امیہ کے خلاف جنگ لڑتا رہا تھا اور شیعوں نے ہی حکومت حاصل کرنے میں اُس کی مدد کی تھی۔ مزید یہ کہ سفاح کا دارالحکومت کوفہ تھا جس کے باشندے امام علیؑ کے پیرو تھے اور سفاح کے پاس اُن سے جنگ کرنے کے لئے کافی طاقت نہیں تھی۔

صورتحال کچھ بھی رہی ہو بنی امیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی دور میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو علومِ اہلِ بیتؑ کی تحقیق و ترویج کے مواقع ملے۔ یہ اُن اماموں کی محنتوں کا ثمر ہے کہ آج اسلامی کتب خانے کتبِ حدیث سے بھرے ہوئے ہیں اور فقہ، فلسفہ، تفسیر اور اخلاق وغیرہ پر کتابیں دستیاب ہیں۔

منصور عباسی

بنی عباس کے دوسرے خلیفہ کا نام عبداللہ، کنیت ابوجعفر اور لقب منصور تھا۔ وہ

محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس کا بیٹا تھا۔ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب رسول اللہؐ کے والد ماجد حضرت عبداللہ کے پدری بھائی تھے۔ منصور کی بیعت ۱۳۶ھ میں ہوئی اور وہ ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۸ھ میں فوت ہوا۔

مؤرخین لکھتے ہیں: "بظاہر منصور کا بھائی سفاح بنی عباس کا پہلا خلیفہ تھا لیکن درحقیقت سلطنت بنی عباس کا بانی منصور تھا کیونکہ سفاح نے فقط چار سال حکومت کی اور منصور نے ہی سلطنت کو عظمت و استحکام بخشا تھا۔ اُس کی طبیعت میں خیر و شر کا امتزاج تھا۔ وہ مردم شناس اور مزاج آشنا تھا۔ اُس نے لوگوں کے ساتھ رابطے بڑھائے اور علماء کی ایک کمیٹی بنائی تا کہ وہ پورے خلوص کے ساتھ سلطنت عباسیہ کی حفاظت اور بقا کے لئے اپنا اثر رسوخ استعمال کریں۔ منصور ہی نے بنی عباس اور اولادِ علیؑ کے درمیان جدائی ڈالی تھی ورنہ اس سے پہلے اُن کے درمیان جدائی نہیں تھی۔"

مؤرخین کی باقی باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن اُن کا یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ منصور خیر و شر دونوں سے حصہ پائے ہوئے تھا۔ وہ مجسم شر تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ لوگوں میں مذہبی رجحان زیادہ ہے تو وہ مذہب کے راستے سے وارد ہوا اور اُس نے علماء کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی جو لوگوں میں اسے متعارف کراتی اور اس کی زیارت کو بھی آتی تھی۔ منصور نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ظلم اور گناہ بھی کرتا رہا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُس میں اچھائی اور برائی کا امتزاج تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے سازش اور تقدس کو یکجا کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسے اچھائی اور برائی کا امتزاج کہا گیا ہے۔ لیکن اس بات کا ایک ثبوت بھی پیش نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نیکی کو محض نیکی ہونے کی بنا پر پسند کرتا تھا کیونکہ بظاہر جو اچھا کام بھی وہ کرتا تھا وہ درحقیقت نفاق اور ریا پر مبنی ہوتا تھا۔

سرکاری واعظ

ابن عبد ربہ اندلسی نے العقد الفرید (ج ۱، ص ۴۱) میں لکھا ہے کہ ایک دن

منصور کے پاس ایک سرکاری واعظ بیٹھا ہوا تھا کہ اُس نے سپاہیوں سے کہا کہ چند آدمیوں کو یہاں لاؤ اور اُن کے سر قلم کر دو۔ جب بہت سے بے گناہوں کے خون سے وہ ظالم ہولی کھیل چکا اور اُن کے خون سے اُس کے کپڑے بھی رنگین ہو گئے تو اُس نے واعظ سے کہا کہ "مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔" جب واعظ نے اسے اللہ کی یاد دلائی تو منصور نے اپنا سر یوں جھکا لیا جیسے اسے بہت دکھ پہنچا ہو۔ پھر اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کچھ مزید آدمیوں کے سر اڑا دو۔ جب دوبارہ بہت سا خون بہایا جا چکا تو وہ واعظ سے کہنے لگا کہ "مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔" واعظ کو نصیحت کرنے کے لئے کہنا دراصل دین اور قرآن کا مذاق اڑانا تھا کیونکہ قرآن ناحق خونریزی سے منع کرتا ہے جبکہ منصور نے اس کا ارتکاب کیا تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگ معاملات سے بالکل لاتعلق ہو گئے تھے، سیاہ و سفید کا فرق مٹ گیا تھا اور حالات اس قدر غیر یقینی تھے کہ موجودہ دور کے کچھ مصنفین نے لکھا کہ منصور دوہری شخصیت کا مالک تھا۔ اُن کے بقول چونکہ وہ مومن تھا اس لئے وعظ سنتا تھا لیکن اپنی حکومت کی حفاظت کے لئے اُسے خون بہانا پڑتا تھا۔ تاہم یہ ایک ناپاک فطرت ہے جو دو طرح ظاہر ہوتی ہے کبھی ظلم اور جرم کی شکل میں اور کبھی ریا، نفاق اور فریب کی صورت میں۔

جب منصور کو معلوم ہوا کہ اسے خدا ترس خلیفہ کہا جاتا ہے تو لوگ خوش ہوتے ہیں اور اُن کا مذہبی تقاریر سننے کا شوق بڑھتا ہے لہٰذا وہ واعظین کو اپنے پاس بلاتا، اُن کا وعظ سنتا اور انھیں انعام دیتا تا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ خلیفہ خدا سے غافل نہیں ہے۔ جب کبھی اُس کے سامنے قیامت کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ رونے لگتا ہے یہ واعظین منصور کے مقصد سے لاعلم نہیں تھے۔ اُن میں سے جو اللہ والے تھے وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ لوگ جنھوں نے مذہب کو کمائی کا ذریعہ بنا لیا تھا اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ منصور نے امام جعفر صادقؑ کو بھی خط لکھے اور انھیں اپنی محفل

میں شرکت کی دعوت دی لیکن امام وہاں جانے پر راضی نہ ہوئے۔ منصور نے اپنے ایک خط میں انھیں لکھا: ''دوسروں کی طرح آپ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ امام نے جواب دیا: ''میرے پاس مال دنیا میں سے کچھ نہیں کہ میں تم سے خوف کھاؤں اور تمہارے پاس آخرت میں ایسی کوئی چیز نہیں جو میں تم سے مانگوں۔''

ایک دن منصور نے سفیان ثوری کو دیکھا تو کہا: ''مجھے کوئی نصیحت کیجیے'' سفیان نے کہا: ''تم نے اس پر عمل نہیں کیا جو تم جانتے ہو اور اب تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں وہ چیز بتاؤں جو تم نہیں جانتے۔''

منصور نے کہا: تم میرے پاس کیوں نہیں آتے؟

سفیان نے کہا: میں حکم خدا کی تعمیل میں تمہارے پاس نہیں آتا۔ خدا فرماتا ہے: حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک خدا ان اعمال کو دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو اور جنھوں نے ظلم کئے ان کی طرف مائل نہ ہونا۔ پس تم کو بھی آگ کا عذاب آلے گا۔ (سورۂ ہود: آیت ۱۱۲۔۱۱۳)

منصور نے کہا: مجھے اپنی حاجت بتائیے۔

سفیان نے کہا: مجھے اپنی محفل میں شرکت کی دعوت نہ دو اور جب تک میں خود نہ مانگوں مجھے کوئی رقم نہ دو۔

منصور نے کہا: میں نے دامے درمے بہت سے علماء کا شکار کیا لیکن سفیان میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اُس نے مجھے تھکا دیا ہے۔

اس طرح منصور نے علماء سے تعلق خاطر کی وجہ بتا دی ہے کہ اُس نے مذہب کو شکار کا ہتھیار اور دولت کو علماء کو پکڑنے کا جال بنا لیا ہے۔

منصور اور غیبی ناصح

ایک رات جب منصور خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا اس نے ایک اجنبی کو دیکھا

جو کہہ رہا تھا: ''خدایا! ظلم اور فساد ظاہر ہو چکا ہے۔ حق اور اہل حق میں جدائی ڈال دی گئی ہے اور میں تیرے حضور اُس کی شکایت کرتا ہوں اور تجھ سے مدد مانگتا ہوں''

منصور نے اس اجنبی کو بلایا اور پوچھا: تم کیا کہہ رہے تھے؟

اجنبی نے کہا کہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

منصور نے اسے یقین دلایا کہ وہ امان میں ہے۔

اجنبی نے کہا: تم مسلمانوں کے حاکم ہو لیکن تم نے اپنے اور عوام کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ تم اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ لوگ تم سے ملیں اور اپنی شکایات تمہارے گوش گزار کریں۔ تمہارے وزیر مشیر ظالم ہیں اور تمہارے کارندے عیاش اور گنہگار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منصور خدا اور عوام کو دھوکا دیتا ہے لہٰذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسے دھوکا دیں۔ یوں ساری مملکت ظلم اور ناانصافی میں ڈوب گئی ہے۔ تاہم تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، عم رسولؐ کے بیٹے ہو اور مسلمانوں پر بہت مہربان ہو۔

منصور نے کہا: پروردگار! جو کچھ یہ شخص کہتا ہے مجھے اس کے مطابق چلنے کی توفیق دے۔ اسی دوران وہ ناصح غائب ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت خضرؑ تھے۔

درحقیقت یہ ایک جعلی قصہ ہے جسے مؤرخین اور علمائے اخلاق نے لکھا ہے اور مقررین اسے منبر سے بیان کرتے ہیں۔ کسی نے بھی اس واقعہ پر اعتراض نہیں کیا اور سب اسے درست سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ قصہ جعلی ہے۔ اگر یہ جعلی نہ ہوتا تو ناصح ایک اجنبی شخص نہ ہوتا۔ اور اگر وہ حضرت خضرؑ تھے تو وہ منصور کے لئے ہی کیوں تشریف لائے، دوسرے جابر حکمرانوں کو انھوں نے کیوں کوئی نصیحت نہ کی معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کے ذریعے منصور لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ اسے خلافت کی خلعت خدا نے پہنائی ہے۔ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے، رسول اکرمؐ کے چچا کا بیٹا ہے اور لوگوں پر مہربان ہے۔ اُس نے اپنا مقصد یہ کہہ کر حاصل کرلیا کہ اس کی

ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی ہے اور یوں ثابت کر دیا کہ خدا نے حضرت خضرؑ کے ذریعے اُس پر مہربانی فرمائی ہے۔

مسعودی لکھتا ہے کہ ایک دن منصور اپنے حجرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ دیوار پر کچھ اشعار لکھے ہوئے ہیں جن کا مطلب ہے

"اے ابو جعفر! تیری موت قریب ہے۔ تقدیر الٰہی پوری ہو کر رہے گی۔
اے ابو جعفر! نجومی اور فال گیر موت کو ٹال نہیں سکتے، بے وقوف مت بن۔"

منصور نے اپنے وزیر فضل بن ربیع سے کہا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ خیال رہے ہر کس و ناکس گھر میں داخل ہو کر دیواروں پر کچھ نہ لکھے۔"

فضل نے پوچھا: "کیا لکھا گیا ہے؟"

منصور نے کہا: "کیا تم یہ اشعار لکھے ہوئے نہیں دیکھ رہے؟"

فضل نے کہا: "واللہ! دیوار پر کچھ بھی نہیں لکھا۔"

یہ واقعہ استعماری ایجنٹوں کی سرگرمیوں سے مماثلت رکھتا ہے جو دکھاوے کے لئے استعمار کو برا کہتے ہیں مگر درپردہ انھیں کے مفاد میں کام کرتے ہیں۔

ہم چاہتے تھے کہ منصور کا جھوٹ ثابت کریں اور اُس کے فریب کا پردہ چاک کردیں۔ منصور کے اعتقادات بیان کرنے سے ہمارا مقصد اولادِ علیؑ اور شیعیان علیؑ کے بارے میں اُس کی پالیسی پر روشنی ڈالنا تھا۔

منصور اور اولادِ علیؑ

عبد اللہ ابن عباسؓ کو چھوڑ کر بنی عباس کا خاندان ایک غیر معروف خاندان تھا اگر اُن کی رسول اکرمؐ سے قرابت داری نہ ہوتی تو تاریخ میں اُن کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس کے برعکس امام علیؑ کا خاندان بنی ہاشم ہر دور میں علم اور دین سے وابستہ رہا تھا اور لوگوں کے دل اُن کی جانب مائل تھے۔ امام علیؑ سے لیکر امام مہدیؑ تک سب

کے سب بےنظیر عظمت اور شرافت کے مالک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عزت حاصل کرنے کے لئے عباسیوں نے امام علیؑ، اولادِ علیؑ اور رسول اکرمؐ سے اپنا تعلق جوڑا وہ اولادِ علیؑ کی مجالس میں کمال ادب سے حاضر ہوتے اور اُن سے علم حاصل کرتے تھے۔ محمد بن عبد اللہ بن حسن جب گھوڑے پر سوار ہوتے تو منصور اُن کی رکاب تھامتا اور جب وہ سوار ہو جاتے تو اُن کا لباس صاف کرتا تھا۔

جب بنی امیہ کو شکست ہونے لگی تو اولادِ علیؑ اور بنی عباس محمد بن عبد اللہ بن حسن سے بیعت ہو گئے۔ ابراہیم، سفاح اور منصور بھی اُن میں شامل تھے لیکن منصور محمد کی بیعت کے سلسلے میں زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا۔ امام جعفر صادقؑ کو بھی اس اجتماع میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی جب امام تشریف لائے تو سب نے کہا کہ آپ ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں۔ امام نے سفاح کی پشت تھپتھپا کر فرمایا: "یہ شخص خلیفہ بنے گا۔" پھر آپ نے منصور کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "اس کے بعد یہ خلیفہ ہوگا۔" پھر آپ نے عبد اللہ بن حسن سے فرمایا: تمہارے دو بیٹے محمد اور ابراہیم، منصور کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ یہ کہہ کر امام وہاں سے چلے آئے۔ (ابو الفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین ص ۲۰۶)

سفاح کے بعد جب منصور خلیفہ بنا تو محمد بن عبد اللہ روپوش ہو گئے۔ منصور نے اُن کے والد سے اُن کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ اُس نے محمد کے ہاتھ پر جو بیعت کر رکھی تھی اُس کی بنا پر انھیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اسے اس دردِ سر سے چھٹکارا مل جائے۔ لہٰذا اُس نے محمد اور اُن کے بھائی ابراہیم کو گرفتار کرنے کے لئے جاسوس بھیجے۔ بالآخر ان دونوں بھائیوں نے محسوس کیا کہ اُن کے پاس اپنے آپ کو منصور کے حوالے کر دینے یا اُس کے خلاف لڑنے کے سوا اور کوئی راستا نہیں تو محمد نے مدینہ میں اور ابراہیم نے بصرہ میں علم بغاوت بلند کیا۔ انھوں نے جنگ کی مگر انصار و مہاجرین کی اولاد نیز جعفر بن ابی طالبؑ اور امام حسینؑ کی اولاد کے بہت

سے افراد کے ساتھ مارے گئے زید بن علی بن الحسینؑ کے دو بیٹے حسین اور علی ان ہی محمد کے ساتھ جو نفس زکیہ کے لقب سے مشہور تھے قتل ہوئے۔

مسعودی لکھتا ہے کہ منصور نے مغز اور شکر سے ایک حلوہ بنوایا۔ یہ حلوہ اسے بہت مزیدار لگا۔ اُس نے کہا: "ابراہیم مجھے یہ حلوہ اور اس جیسی دوسری چیزیں کھانے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔" گویا اُس کے لئے یہ کوئی بات ہی نہیں تھی کہ زبان کے چسکے کے لئے اولادِ رسولؐ کو قتل کرادے۔

منصور کے مظالم

مُرُوجُ الذهب (ج ۳، ص ۳۱) میں اور النزاع والتخاصم (ص ۴۷) میں لکھا ہے کہ منصور نے اولادِ حسنؑ کو جمع کیا اور حکم دیا کہ ان کو طوق و سلاسل میں اسیر کردو۔ پھر جیسا کہ یزید نے اولادِ حسینؑ کے ساتھ کیا تھا انھیں بے کجاوہ اونٹوں پر بٹھا کر تاریک زندانوں میں بھیج دیا جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے قرآن مجید کو پانچ حصوں میں تقسیم کرلیا اور ہر نماز سے پہلے ایک حصے کی تلاوت کرتے تھے۔ انھیں جہاں قید رکھا گیا تھا وہاں کوئی بیت الخلاء نہ تھا لہٰذا وہ مجبور تھے کہ وہیں رفع حاجت کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعفن کی وجہ سے اُن کے بدن سوجنے لگے۔ یہ سوجن اُن کے پیروں سے شروع ہو کر دل تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ وہ شدید علالت اور بھوک پیاس کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مقریزی نے النزاع والتخاصم میں تاریخ کامل سے نقل کیا ہے کہ منصور نے محمد بن عبداللہ بن عثمان کو بلا بھیجا جو اولادِ حسنؑ کا مادری بھائی تھا۔ جب وہ آئے تو منصور کے حکم سے اُن کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے حتیٰ کہ اُن کی شرمگاہ دکھائی دینے لگی۔ اس حالت میں انھیں ۱۵۰ کوڑے مارے گئے۔ ایک کوڑا اُن کے منہ پر لگا تو انھوں نے کہا: خدا تمھیں غارت کرے! میرے منہ پر تو نہ مارو۔ منصور نے

حکم دیا کہ اُن کے سر پر مارو۔ چنانچہ اُن کے سر پر تیس ضربیں لگائی گئیں۔ ایک ضرب اُن کی آنکھ پر لگی تو آنکھ نکل کر چہرے پر آگری۔ بالآخر انھیں قتل کر دیا گیا۔

ابن اثیر لکھتا ہے کہ منصور نے محمد بن ابراہیم بن حسن کو بھی بلا بھیجا۔ محمد اتنے نازک اندام تھے کہ دیباج کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ وہ آئے تو منصور نے اُن سے کہا: اچھا! تو تم ہو زرد اطلس۔ بخدا! میں تمھیں اس طرح قتل کروں گا کہ پہلے کوئی نہ ہوا ہوگا۔ پھر اُس کے حکم سے دیباج کو زندہ ایک گڑھے میں دبایا گیا اور اُن پر ستون تعمیر کیا گیا۔

معاویہ لوگوں کو کچھ کہنے کی اجازت دیئے بغیر زندہ دفن کر دیتا تھا لیکن منصور انھیں گاڑ کر اُن پر ستون تعمیر کرتا تھا۔ یہ فرق تھا شام کے سلطان اور عراق کے سلطان میں اور یہی روش سلاطین بنوعباس کو سلاطین بنوامیہ سے ممیز کرتی ہے۔

ہم نے بنی امیہ کے دور میں یہ نہیں دیکھا کہ اُن کے کسی عامل نے لوگوں کو ایک تہہ خانے میں قید کر دیا ہو جہاں ایک ایک کر کے سب ناقابل برداشت تعفن کی وجہ سے مر گئے ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

"بخدا! بنی امیہ کے جرائم بنی عباس کے جرائم کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔"

النزاع والتخاصم (ص ۴۷) میں ہے: قاسم بن ابراہیم طباطبا مدینہ میں اپنی جاگیر الرس پر رہتے تھے۔ منصور نے انھیں بھی بلوایا تو وہ سندھ جانے کے ارادے سے بھاگ نکلے۔

بنی عباس کے بارے میں قاسم اپنے اشعار میں کہتے ہیں: "ہمارا خون بہانے سے منصور کی تسلی نہیں ہوئی، وہ اب بھی ہمارے تعاقب میں ہے۔"

"اُن کے بغض کی آگ اسی وقت بجھ سکتی ہے جب اولادِ فاطمہؑ میں سے کوئی روئے زمین پر باقی نہ بچے۔"

برہنہ پا در در کی خاک چھانتے چھانتے قاسم کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ

''امید ہے کہ ہڈیوں کو جوڑنے والے خدا کے لطف سے ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جائیں گی (دعائے جوشن کبیر میں خدا کو جَابِرَ الْعَظْمِ الْكَسِيْرِ کہا گیا ہے)۔ میں خدا سے مایوس نہیں ہوں۔ وہ ضرور اُن کی مدد کرے گا جو صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔''

النزاع والتخاصم (ص ۷۶) میں ہے: منصور نے ایک کمرہ اپنے بیٹے مہدی کی بیوی کی نگرانی میں دیا اور اسے قسم دی کہ وہ اس کی زندگی میں اس کمرے کو نہیں کھولے گی۔ منصور کے مرنے کے بعد جب مہدی نے کمرہ کھولا تو دیکھا کہ آل ابی طالبؑ کی لاشیں پڑی ہیں اور اُن کے ماں باپ کے نام کاغذ کے پرزوں پر لکھے اُن کے کانوں سے لٹک رہے ہیں۔ اُن میں کچھ بچے بھی تھے۔

مقریزی لکھتا ہے: ان جرائم کا عدل، دین محمدؐ اور پیشوایان دین کی روش سے کیا تعلق ہے؟ اس سفاکی کا رحمت للعالمین کے ساتھ قرابت داری سے کیا واسطہ ہے؟ خدا کی قسم! ان اعمال کا دین ومذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو وہ اعمال ہیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے: فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ اے منافقو! عجب نہیں کہ جب تم حاکم بن جاؤ تو زمین میں فساد مچاؤ اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو۔ یہی تو لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور اُن کے کانوں کو بہرا اور اُن کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ (سورۂ محمد: آیت: ۲۲-۲۳)

کیا ایک شخص کا یہی کردار ہونا چاہیے جو کہتا ہو کہ وہ خدا، آخرت اور قرآن پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کا خلیفہ اور رسول خداؐ کے چچا کا بیٹا ہے!!

امام جعفر صادقؑ اور منصور

منصور نے چھٹے امام کو ''صادق'' کا لقب دیا تھا کیونکہ آپ نے اُس کے

حکمران بننے کی پیشگوئی فرمائی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ عبداللہ بن حسن کے دونوں بیٹے محمد اور ابراہیم منصور کے ہاتھوں قتل ہوں گے۔ (امام علیؑ بن موسیٰؑ کو ولی عہدی کے لئے ''راضی'' ہونے پر مامون نے ''رضا'' کا لقب دیا تھا اور رسول اکرمؐ کو بھی مشرکین مکہ نے صادق اور امین کا لقب دیا تھا)۔

منصور کے زمانے میں امام جعفر صادقؑ نے اپنے شیعوں سے فرمایا تھا:

عَلَيْكُمْ بِالطَّاعَةِ وَالصَّمْتِ فَاِنَّكُمْ فِيْ سُلْطَانِ مَنْ مَكْرُهُمْ لَتَزُوْلُ مِنْهُ الْجِبَالُ

یعنی تمھیں چاہیے کہ اطاعت کرو اور خاموش رہو[۱] کیونکہ تم ایک ایسے بادشاہ کے زیر تسلط ہو جس کے مکر سے پہاڑ بھی گر جاتے ہیں۔

تاہم جب تک لوگ صادق آل محمدؑ کو امام مانتے تھے، منصور اور دیگر لوگوں سے افضل جانتے تھے تو امام کی خاموشی اور آپ کے شیعوں کی اطاعت سے منصور کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔

محمد اسقطوری بیان کرتا ہے کہ میں منصور کے پاس گیا تو وہ بڑی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ اتنے فکر مند کیوں نظر آتے ہیں؟

منصور نے کہا: میں نے اولاد فاطمہؑ میں سے ایک ہزار سے زائد افراد کو قتل کیا ہے لیکن ابھی تک اُن کے سرپرست کو قتل نہیں کر سکا۔

۱۔ امام نے اپنے پیروؤں کو خاموش رہنے کی جو ہدایت کی تھی اور کہا تھا کہ بنی امیہ کی طرح بنی عباس کے خلاف بغاوت نہ کریں اس ''خاموشی'' کے نتیجے میں امام جعفر صادقؑ کو شیعہ عقیدہ پھیلانے کا موقع مل گیا اور وہ سب حدیثیں منظر عام پر آ گئیں جن کا سلسلہ سند یوں ہے کہ اس حدیث کو میں روایت کر رہا ہوں اپنے پدر گرامی محمد بن علیؑ سے، اُن سے بیان کیا اُن کے پدر گرامی علی بن الحسینؑ نے، اُن سے اُن کے پدر گرامی حسین بن علیؑ نے، اُن سے اُن کے پدر گرامی علیؑ بن ابی طالبؑ نے اور اُن سے بیان کیا جناب رسول خداؐ نے، اُن سے حضرت جبرئیلؑ نے اور انھوں نے اسے بیان کیا تھا خدائے عزوجل سے۔ امام جعفر صادقؑ کی ان ہی کوششوں کی وجہ سے شیعہ مذہب ''مذہب جعفری'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔

میں نے کہا: وہ کون ہے؟

منصور نے کہا: میں جانتا ہوں کہ تم اسے اپنا امام سمجھتے ہو۔ تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ میرا بھی امام ہے، تمہارا بھی امام ہے بلکہ ساری دنیا کا امام ہے۔[1] تاہم اب میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔

اس مکالمہ سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں تشیع کو اتنا فروغ حاصل ہوا کہ وہ منصور کے دوستوں کو بھی متاثر کرچکا تھا۔ کہا گیا ہے کہ منصور کا وزیر ربیع بھی شیعہ تھا۔ ابن عبد ربہ اندلسی نے **العقد الفرید** (ج ۵، ص ۱۵۹ طبع ۱۹۵۳ء) میں لکھا ہے کہ "جب منصور مکہ جاتے ہوئے مدینہ میں رکا تو اُس نے ربیع کو حکم دیا کہ جعفر بن محمد (ع) کو میرے پاس لاؤ۔ اگر میں اسے قتل نہ کروں تو اللہ مجھے قتل کردے۔ ربیع امام کو بلانے میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا لیکن بالآخر انھیں بلالیا۔ جب امام دربار میں تشریف لائے تو آپ کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ منصور کے قریب پہنچنے پر آپ نے اسے سلام کیا۔ منصور نے کہا: اے دشمن خدا! خدا تجھے ہلاک کرے۔ تو میری سلطنت میں فساد پھیلا رہا ہے۔ اگر میں تجھے قتل نہ کروں تو خدا مجھے قتل کردے۔"

"امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ سلیمانؑ کو سلطنت ملی اور انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ایوبؑ نے بے حد تکلیف اٹھائی لیکن صبر کیا، یوسفؑ پر ظلم کیا گیا اور انھوں نے ظالم کو معاف کردیا۔ تم اُن کے جانشین ہو اور عین مناسب ہے کہ تم اُن کے نقش قدم پر چلو۔"

"یہ سن کر منصور نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا: تمام قبیلوں کے مقابلے میں تم ہمارے سب سے قریبی رشتے دار ہو۔ پھر وہ امام سے گلے ملا، انھیں اپنی مسند پر بٹھایا اور اُن سے باتیں کرنے لگا۔ پھر بولا: صادق کے لئے فوراً تحفہ اور

۱۔ ابی فراس، شرح شافیہ، ص ۱۷۱ (فضائل خاندان رسولؐ اور عیوب بنی عباس کے باب میں)۔

لباس لاؤ اور انھیں گرمجوشی سے رخصت کرو۔"

جب امام باہر تشریف لائے تو ربیع اُن کے پیچھے پیچھے آیا اور کہنے لگا:

"میں تین دن سے آپ کا دفاع کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی میں نے دیکھا کہ جب آپ تشریف لائے تو زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے اور اُس کے نتیجے میں وہ آپ کو گزند نہ پہنچا سکا۔ میں حاکم کا ملازم ہوں، مجھے اُس دعا کی ضرورت ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے وہ دعا تعلیم فرمادیں۔

امام نے جو دعا بتائی اُس کا ترجمہ یہ ہے:

پروردگار! اپنی آنکھ سے میری حفاظت فرما جو کبھی نہیں سوتی، اُس طاقت سے میری حفاظت فرما جو مصیبت کا ہدف نہیں بنتی تاکہ میں تباہ نہ ہوجاؤں کیونکہ میری تمام امیدیں تجھ ہی سے وابستہ ہیں۔ پروردگار! تو نے جو اَن گنت نعمتیں دی ہیں میں اُن کا شکر ادا نہیں کرسکا لیکن پھر بھی تو نے مجھے اُن سے محروم نہیں کیا۔ وہ بہت سی بلائیں جن میں تو نے مجھے گرفتار کیا اور میں صبر نہ کرسکا اُن سے مجھے رہائی عطا فرما۔ پروردگار! اپنی مدد اور دفاع کی طاقت کے ساتھ مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ اور میں اس کے شر سے تیرے دامن خیر میں پناہ مانگتا ہوں۔"

جناب معلّیٰ بن خنیس امام جعفر صادقؑ کے خاص الخاص شیعوں میں سے تھے۔ آپ امام کے منشی اور مالی معاملات کے نگران بھی تھے۔ منصور نے مدینہ کے عامل داؤد بن عروہ کو لکھا کہ معلّیٰ کو قتل کردے۔ داؤد نے معلّیٰ کو بلایا اور کہا کہ شیعوں کے نام لکھ کر دو ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔

معلّیٰ نے کہا: "مجھے موت سے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم! اگر ایک شیعہ کا نام بھی میرے پاؤں کے نیچے ہو تو میں اپنا کبھی پاؤں نہیں اٹھاؤں گا۔"

داؤد نے معلّیٰ کا سر کاٹ کر جسم سولی پر لٹکا دیا۔ امام صادقؑ کو معلّیٰ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ کو سخت صدمہ پہنچا اور آپ نے داؤد پر لعنت بھیجی۔ ابھی لعنت کے الفاظ پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ داؤد کے مرنے کی خبر لائی گئی۔ (بحار الانوار، ج ۱۱)

ابو فراس نے شرح شافیہ (ص ۵۵۹) میں لکھا ہے کہ منصور نے اپنے عامل کو لکھا کہ امام صادقؑ کا گھر جلا دے اور انھیں زہر دیدے۔ چنانچہ آپ کو زہر دیکر شہید کر دیا گیا۔ (**تاریخ الشیعہ**، ص ۴۶ بحوالہ **الصواعق المحرقہ** از ابن حجر مکی اور **نور الابصار و اسعاف الراغبین از شبلنجی**)

منصور نے خود تسلیم کیا ہے کہ اُس نے ایک ہزار سے زائد اولاد فاطمہؑ کا خون بہایا ہے۔ علاوہ ازیں جو شیعہ اُس کے ہاتھوں مارے گئے اُن کی تعداد پتا نہیں۔ منصور نارچہ کے نت نئے طریقے ایجاد کر کے محظوظ ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں پر چابک مارتا تاکہ وہ اندھے ہو جائیں۔ وہ گھروں کی چھتیں اُن کے مکینوں پر گرا دیتا تھا اور انھیں زندہ دیواروں میں چن دیتا تھا۔ وہ انھیں زہر دے دیتا تھا۔ اس کے باوجود عقل کے دشمن کہتے ہیں کہ منصور اللہ پر ایمان رکھتا تھا، روئے زمین پر اللہ کا خلیفہ تھا اور رسول اکرمؐ کا قرابت دار تھا۔

مسلمان سلاطین کی تاریخ کا دقیق و عمیق مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر منصور اور دیگر سلاطین نہ ہوتے تو اسلام اپنے اعلیٰ اخلاق اور تعلیمات کی بدولت مشرق و مغرب میں پھیل گیا ہوتا، لوگ تبلیغ کے بغیر اسلام قبول کر لیتے اور روئے زمین پر ایک بھی غیر مسلم نہ ہوتا۔

مہدی عباسی

منصور کے بعد اُس کے بیٹے مہدی[1] نے ۱۵۸ھ سے ۱۶۹ھ تک حکومت کی۔ اُس نے کرم گستری کے بہانے اپنی حکومت کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور کر دیں

۱۔ مہدی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں قرآن میں شراب حرام نہیں ہے۔ امام نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ میں شراب کو اِثم بتایا گیا ہے اور اِثم کو سورۂ اعراف کی آیت ۳۳ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ میں حرام کہا گیا ہے۔ (مؤلف)

اور ایسا کشت و خون کیا کہ امام علیؑ کی اولاد میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔ مہدی کے دور میں یہ دو افراد اپنی جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔

۱۔ علی بن عباس بن حسن بن حسن بن علی بن ابیطالبؑ۔ مہدی نے انھیں گرفتار کر کے قید کر دیا۔ بعد میں انھیں زہر دیدیا جس سے اُن کا بدن سوج گیا اور اعضاء ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

۲۔ عیسیٰ بن زید بن علی بن حسین بن علی بن ابیطالبؑ۔ ابو الفرج اصفہانی، **مقاتل الطالبین** میں لکھتا ہے کہ جہاں تک عقیدہ، علم اور تقویٰ کا تعلق ہے عیسیٰ اولاد علیؑ میں سب سے ممتاز تھے اور جہاں تک ناداری کا تعلق ہے وہ سب سے زیادہ بیکس تھے۔ جہاں تک عام معاملات کے ادراک اور عقیدے کا تعلق ہے وہ سب سے دانا تھے اور احادیث کی روایت اور تحقیق کے لحاظ سے وہ بنی ہاشم میں یگانہ روزگار تھے۔

وہ مہدی کے خوف سے بھاگ گئے اور کوفہ میں علی بن صالح کے گھر میں پناہ لی جو اہل بیتؑ کا شیعہ تھا۔ اس خیال سے کہ کسی پر بوجھ نہ بنیں انھوں نے کوئی کام کاج کرنا ضروری سمجھا۔ اہل کوفہ دریائے فرات کا پانی اونٹوں پر لاد کر شہر لاتے تھے۔ جناب عیسیٰ نے ایک اونٹ کے مالک سے معاہدہ کیا کہ وہ فرات سے پانی لایا کریں گے اور اسے بیچ کر جو رقم ملے گی اُس میں سے اُس کا خرچہ ادا کریں گے اور بقیہ رقم اپنے گزارے کے لئے رکھ لیں گے۔ جناب عیسیٰ کافی مدت اسی طرح محنت مزدوری کرتے رہے اور انھیں کسی نے نہیں پہچانا۔ انھوں نے ایک غریب خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی اور اُن کے سسرال والے بھی اس بات سے بے خبر رہے کہ یہ شخص کون ہے؟

جناب عیسیٰ کے ایک بھائی حسین تھے۔ اُن کے بیٹے کا نام یحیٰ تھا۔ ایک دن یحیٰ نے اپنے باپ سے کہا: بابا جان! میں اپنے چچا سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ میں

نے انھیں دیکھا تک نہیں۔ حسین نے کہا: بیٹا! میں ڈرتا ہوں کہ یہ بات کہیں تمہارے چچا کو مشکل میں نہ ڈال دے۔ بہرحال بیٹے نے بہت اصرار کیا تو حسین راضی ہوگئے اور بولے: بیٹا! کوفہ جاؤ اور محلہ بنی حی کا پتا لگاؤ۔ وہاں اس اس نام کی ایک گلی ہے اور اس اس نشانی والا ایک گھر ہے۔ اُس گھر کے نزدیک بیٹھ جاؤ۔ شام کے وقت تم ایک دراز قد بوڑھے آدمی کو آتا دیکھو گے جس کے ماتھے پر سجدے کا نشان نمایاں ہوگا۔ اُس نے اونی کپڑے پہنے ہوں گے اور ایک اونٹ پر پانی لاد کر لا رہا ہوگا۔ وہ ہر قدم پر اللہ کو یاد کرتا ہوگا اور اُس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے ہوں گے۔ جب وہ نزدیک آئے تو تم کھڑے ہو جانا، اسے سلام کرنا اور اپنا بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دینا۔ اس اپنے پن سے وہ آدمی خوف زدہ ہو جائے گا لہٰذا تم فوراً اپنا تعارف کرا دینا۔ یہی بزرگوار تمہارے چچا عیسیٰ ہیں۔ وہ تمھیں اپنے حالات سنائیں گے اور ہمارا حال احوال پوچھیں گے۔ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرنا بلکہ انھیں الوداع کہہ کر لوٹ آنا۔ شاید دوسری بار تم انھیں نہ دیکھ سکو گے۔ وہ جو ہدایات تمھیں دیں اُن پر عمل کرنا کیونکہ اگر تم دوبارہ انھیں ملنے کی کوشش کرو گے تو وہ تم سے خوفزدہ ہو جائیں گے اور اپنا ٹھکانہ بدل لیں گے۔ یحییٰ کا کہنا ہے کہ میں کوفہ گیا اور جو ہدایات میرے باپ نے دی تھیں اُن کے مطابق جب میں نے اپنا ہاتھ چچا کی طرف بڑھایا تو وہ اس طرح ڈر گئے جس طرح جنگلی جانور انسانوں سے ڈرتے ہیں اور بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ انھوں نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ وہ بڑے پیار اور شفقت سے مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کے بارے میں پوچھا اور میں نے انھیں تفصیل سے بتایا اور وہ روتے رہے۔

پھر انھوں نے کہا:

پیارے بھتیجے! میں اس اونٹ پر پانی لاد کر لاتا ہوں۔ خرچے کے پیسے اُس

کے مالک کو دیتا ہوں اور باقی رقم سے گزر بسر کرتا ہوں۔ جب میں پانی نہیں لا سکتا تو ایک گزرگاہ پر بیٹھ جاتا ہوں اور اُن سبزیوں کو کھاتا ہوں جو لوگ راستے پر گرا جاتے ہیں۔

اے میرے بھتیجے! میں نے جس عورت سے شادی کی ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ اللہ نے مجھے ایک بیٹی دی جو میری حیثیت سے ناواقف تھی۔ اُس کی ماں نے مجھ سے کہا: اپنی بیٹی کی شادی فلاں سقے کے بیٹے سے کر دو جو ہمارا پڑوسی ہے اور اُس نے لڑکی کا رشتہ مانگا ہے۔ اُس نے جواب کے لئے اصرار کیا لیکن میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ یہ لڑکی اولادِ رسولؐ ہے لہٰذا میں نے اس مشکل کے حل کے لئے اللہ سے دعا مانگی اور اُس نے لڑکی کو موت دیدی۔ اگرچہ لڑکی کی موت مجھ پر شاق گزری لیکن ایک لحاظ سے صدمے کا باعث نہیں تھی کیونکہ وہ دنیا سے چلی گئی مگر اسے رسول اکرمؐ سے اپنے رشتے کا علم نہ تھا۔

یحییٰ بیان کرتے ہیں کہ میرے چچا نے اللہ کا واسطہ دیکر مجھ سے درخواست کی کہ میں واپس چلا جاؤں اور پھر انھیں ملنے نہ آؤں۔ چنانچہ میں نے انھیں خدا حافظ کہا اور واپس آگیا۔

جناب عیسیٰ جیسوں کی زندگی سے جابر حکمرانوں کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اُن کی حکومت میں عالم اور صالح لوگ کسمپرسی میں دن گزارتے ہیں جبکہ کم ظرف لوگ آرام اور چین کی زندگی گزارتے ہیں۔

متقی عالم اور باایمان محدث جناب عیسیٰ بن زید بن امام زین العابدینؑ جو حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی اولاد تھے مسلمانوں کے ایک شہر میں اپنا تعارف بھی نہیں کرا سکتے تھے حالانکہ شہر کا حاکم مسلمانوں کا امیر تھا۔ انھوں نے اپنی حقیقت ظاہر نہ کی اور معمولی اجرت پر محنت مزدوری کرتے رہے۔

جناب عیسیٰ گھر سے دور جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور سختیاں سہہ رہے

تھے کیونکہ وہ ایک عالم اور صالح انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ حق کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ تاہم بدکار مرد، بدچلن عورتیں اور جرم و گناہ میں ڈوبے لوگ دولت سے کھیلتے تھے۔ انھیں زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ مسعودی لکھتا ہے کہ منصور نے عوام سے ٹیکس کی جو بھاری رقم جمع کی تھی مہدی نے اسے اپنے منظور نظر افراد میں بانٹ دیا۔

قاہرہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے ایک پروفیسر نے مجھ سے کہا:

شیعہ تو تقیہ کے قائل ہیں!!

میں نے کہا: پروفیسر صاحب! خدا کی لعنت ہو ان پر جنھوں نے شیعوں کو تقیہ کرنے پر مجبور کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے مصر چھوڑ دیا اور کہا:

''خدایا! مجھے ظالموں سے نجات دے۔'' اور ہمارے نبی کریمؐ نے فرمایا ہے: بِئْسَ الْقَوْمُ يَعِيْشُ الْمُؤْمِنُ بَيْنَهُمْ بِالتَّقِيَّةِ یعنی پھٹکار ہو اس قوم پر جس میں ایک سچا مومن اپنے فرائض تقیہ میں ادا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

جناب! آپ رائے اور عقیدہ کی آزادی کا شور تو بہت مچاتے ہیں لیکن جب ایک مظلوم کو دیکھتے ہیں جسے اس کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے اور وہ ایک جابر سلطان کے خوف کی وجہ سے خاموش ہے تو آپ اُس پر تقیہ کرنے کی بنا پر نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ظالم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ'' لوگ نہیں بدلے ظلم کے انداز بدل گئے ہیں۔''

ہادی عباسی

مہدی کی موت پر لوگوں نے اُس کے بیٹے موسیٰ کی بیعت کر لی جس نے ہادی کا لقب اختیار کیا۔

مسعودی مُرُوجُ الذھب میں لکھتا ہے کہ'' مہدی نے ۱۵ مہینے حکومت کی۔

وہ سنگ دل اور بد اخلاق شخص تھا۔'' ہادی کے زمانے میں مدینہ کا عامل عبدالعزیز حضرت عمر کی نسل سے تھا۔ وہ امام علیؑ کی اولاد کو اذیتیں دیتا تھا۔ اُس کے وقت میں وہ سب آج کی اصطلاح میں ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر تھے۔ اُس نے کہہ رکھا تھا: ہر روز پولیس کے دفتر میں حاضری دو۔ عبدالعزیز اولاد علیؑ پر شراب نوشی کا الزام لگاتا تھا، انھیں کوڑے مارتا تھا اور بازاروں میں پھراتا تھا۔

ایک دن عبدالعزیز نے حسین بن علی بن حسین کو بلایا اور نازیبا زبان استعمال کی۔ اُس نے انھیں قتل کرنے کی دھمکی دی اور اتنے ناشائستہ طریقے سے بات کی کہ حسین اُس کے خلاف بغاوت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

عبدالعزیز نے حسین کو اور امام علیؑ کی اولاد میں سے چند دوسرے افراد کو جو اُن کے ساتھ تھے فخ کے مقام پر جو مکہ سے چھ میل کی دوری پر واقع ہے قتل کر دیا تین دن تک اُن کی لاشیں کھلے میدان میں پڑی رہیں۔ درندے اور پرندے اُن کا گوشت کھاتے رہے۔ جو لوگ گرفتار کیے گئے انھیں بھی ایذائیں دیکر قتل کر دیا گیا۔
(مُرُوجُ الذھب ج ۳، ص ۳۳۶)

اگرچہ ہادی تھوڑے دن جیا لیکن اس قلیل مدت میں بھی اُس نے ایسے کام کیے کہ اُس کا نام اولاد علیؑ کے قاتلوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔

ابو الفرج اصفہانی مقاتل الطالبین میں لکھتا ہے:

حسین (شہید فخ) کی والدہ کا نام زینب بنت عبد اللہ بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالبؑ تھا منصور نے اُن کے باپ، بھائی اور چچا کو نیز اُن کے شوہر علی بن حسین کو قتل کر دیا تھا۔ منصور کے پوتے ہادی نے ان کے بیٹے حسین کو قتل کیا تھا۔ اظہار غم کے لئے زینب بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتی تھیں جو اُن کے بدن پر کسا رہتا تھا۔ اسی حال میں وہ انتقال کر گئیں۔

ہارون رشید عباسی[1]

اپنے بھائی ہادی کے مر جانے کے بعد ۱۷۰ھ میں ہارون رشید تخت نشین ہوا اور ۱۹۳ھ میں انتقال کر گیا۔ بنی عباس میں سے جو شہرت ہارون اور مامون کے

۱۔ جس طرح آج امریکا بہادر مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہے لیکن علمی اور تحقیقی میدانوں میں بھی کام کر رہا ہے اسی طرح بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں بھی علمی، ثقافتی اور تعمیراتی کام ہوتے رہے ہیں مگر موجودہ کتاب چونکہ شیعوں پر بنی امیہ اور بنی عباس کے مظالم کے موضوع پر لکھی گئی ہے اس لئے فاضل مصنف نے اس موضوع کو نہیں چھیڑا ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے ایران کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر علی اکبر ولایتی کی کتاب "اسلامی تہذیب و ثقافت" سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"زمانہ فتوحات کے عروج کے بعد جب اسلامی حکومت مستحکم ہوگئی اور مسلمان اسلام کے بنیادی علوم کی تدوین سے کسی حد تک فارغ ہو گئے تو بعض عباسی خلفاء کی سرپرستی کے باعث اسلامی معاشرہ آہستہ آہستہ ان علوم و فنون کی طرف متوجہ ہو گیا جو غیر مسلم تہذیبوں میں موجود تھے۔ اس توجہ کا سرچشمہ قرآن اور احادیث تھیں جو مومنین کو علوم و فنون سیکھنے کی طرف راغب کرتی تھیں۔

جس چیز نے سب سے زیادہ اس تحریک کے اسباب فراہم کئے وہ مسلمانوں کی فتوحات بالخصوص مسلمانوں کا ساسانی مملکت پر تسلط اور مشرقی روم کے کچھ علاقوں پر قبضہ تھا۔ ان میں سے ہر سرزمین کی اپنی ایک قدیم تہذیب تھی۔ چونکہ ایک ہزار سال قبل یہاں سکندر اعظم نے لشکر کشی کی تھی اس لئے ان میں بھی یونانیوں کا سا مزاج پیدا ہو گیا تھا۔

دوسری تہذیبوں کے ساتھ ساتھ یونانیوں کے ساتھ Cultural Exchange کا تجربہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس مبادلہ سے قلیل عرصے میں مسلم حکمرانوں اور دانشوروں کا اشتیاق اور کام اس قدر بڑھ گیا کہ بعد میں اس دور کا نام "تحریک ترجمہ" کا دور پڑ گیا۔ اگرچہ ترجمہ کا آغاز بنی امیہ کے دور میں ہوا تھا لیکن اس کے ثمرات بنی عباس کے دور میں حاصل ہوئے۔ بنی امیہ کے دور میں اکثر ترجمے فوجی، سیاسی، تجارتی اور محکمہ جاتی ضرورتوں سے متعلق تھے۔ یہ ترجمے حکمرانوں اور غیر عربوں کے درمیان رابطے کے پل کا کام دیتے تھے۔ ترجمے کی باقاعدہ تحریک جس نے بہت سے تاریخی، اجتماعی اور علمی آثار چھوڑے اولین عباسی خلفاء کے دور سے شروع ہوئی۔

یہ علمی تحریک دو سو سال سے زیادہ جاری رہی۔ بالخصوص منصور کے دور میں غیر مسلم اقوام کے علوم کے تراجم تحت اللفظ اور بامحاورہ ہر دو صورت میں کئے گئے۔ شروع شروع میں فارسی سے عربی زبان میں ترجمہ کا کام ہوا۔ ان کتابوں کے مترجمین نو مسلم زرتشتی تھے۔ چند ادبی کتابوں مثلاً کلیلہ و دمنہ

حصے میں آئی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ ہارون اپنی سلطنت، جلال و اقبال، ترویج علم و ادب اور فن و ثقافت کی ترقی کی بنا پر بہت مشہور ہوا۔ الف لیلہ

کا ترجمہ ایرانی مصنف عبداللہ بن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے کیا۔ بعد والے ادوار میں مسلمان مترجمین نے فن ترجمہ میں بہت مہارت حاصل کر لی۔ اس فن میں اپنے تجربے کی بنا پر انھوں نے سُریانی اور یونانی کتابوں کا بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

اس دور میں نسطوری حکیم حاذق حنین بن اسحاق جو یونانی، سُریانی، عربی اور پہلوی زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور شیخ المترجمین کہلاتے تھے پہلے مترجم تھے۔ انھوں نے ایک گروہ تشکیل دیا اور ترجمے کے کام کو منظم کیا۔ اس گروہ میں اُن کے فرزند اسحاق اور بھانجے حبیش بن اعسم بھی شامل تھے۔ حنین خود تراجم کو اصل کتابوں سے تطبیق دیتے اور اصلاح کرتے تھے۔

عباسی خلیفہ کی دلچسپی یا دیگر عوامل کی بنا پر تراجم کی تعداد اور موضوعات میں فرق پڑتا رہا۔ خاص طور سے ہارون رشید کے دور سے تحریک ترجمہ کا خلاصہ یوں ہے۔

(الف) ہارون رشید کا دور: اس دور میں تمام تر توجہ سائنس کی کتابوں کے ترجمہ پر مرکوز تھی۔ ہارون کے وزیر یحیٰی بن خالد برمکی نے لائق مترجمین کو اکٹھا کرنے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کیں۔ ہارون کے زمانے میں جو شہر مسلمانوں کے قبضے میں آتا اُس کا کتابخانہ مکمل طور پر بغداد منتقل کر دیا جاتا مثلاً فلسفہ اور ریاضی کی یونانی کتابوں، اقلیدس کی کتاب، بطلیوس کی کتاب مجسطی (یعنی عظیم کتاب) اور ہندوستان کی طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ اُسی دور میں ہوا۔

ب) مامون رشید کا دور: مامون کے زمانے میں قرآن کی مختلف تعبیروں کی بنا پر "علم کلام" کے مباحث عروج پر تھے۔ اس دور میں فلسفہ کی بہت سی کتابیں عربی سے ترجمہ ہو کر منظر عام پر آ گئیں۔

ج) مامون کے بعد کا دور: متوکل کے دور میں بھی ترجمے کا کام چلتا رہا مثلاً حنین بن اسحاق اسی طرح ترجمہ کرنے میں مشغول رہے لیکن معتصم نے جب بغداد کی بجائے سامرہ کو دارالخلافہ بنایا تو ترجمے کی کیفیت میں تبدیلی آئی۔ اس تبدیلی کی اہم ترین وجہ بیت الحکمۃ کی اہمیت کا کم ہونا تھا جو اُس وقت کا ایک اہم ترین علمی ادارہ تھا۔

د) تحریک ترجمہ کا اختتام: بغداد میں ترجمے کی تحریک دو سو سال تک بہت زیادہ کامیابی کے بعد روبہ زوال ہوگئی اور نئے عیسوی ہزارہ کے آغاز میں ختم ہوگئی۔ البتہ تحریک کے ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کی توجہ ترجمہ شدہ علوم کی طرف کم ہوگئی تھی یا مترجمین کم ہو گئے تھے بلکہ اس تحریک کے اختتام کی وجہ اُن زبانوں میں نئے موضوعات کا فقدان تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ تحریک اپنی اجتماعی مرکزیت کھو بیٹھی تھی۔ جدید مضامین کے پیش نہ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دیگر غیر دینی یونانی کتب ترجمے

کی داستانوں نے ہارون کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

ہارون کی شہرت سلطنت کے نظم و نسق کی بنا پر تھی۔ مسجدوں، مدرسوں،

کے لیے دستیاب نہ تھیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی یونانی کتابیں جو اس تحریک سے متعلق دانشوروں کے لیے کشش رکھتی ہوں موجود نہ تھیں کیونکہ بیشتر علوم و فنون میں طبع زاد کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں جو ترجمہ شدہ کتابوں سے بلند پایہ تھیں۔ تحریک ترجمہ کے بانی اور حامی اب ترجمے کے کام کی سرپرستی کرنے کی بجائے عربی میں تصنیفات پیش کر رہے تھے۔ اسلامی حکومت کے استحکام اور اسلامی معاشرے کے رشد و کمال کی وجہ سے تعلیمی ادارے بننے لگے۔ ان اداروں نے علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے کا پہلا تعلیمی ادارہ بیت الحکمۃ بغداد میں تعمیر ہوا جو حکومت کی سرپرستی میں سرکاری گرانٹ سے چلتا تھا۔ یہ ادارہ محققین اور مترجمین بالخصوص ایسے لائق مترجمین کے اجتماع کا مرکز تھا جو یونانی فلسفہ کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ بیت الحکمۃ جو مسلمانوں کا پہلا کتابخانہ تھا اُس کی بنیاد ہارون نے رکھی تھی مگر ترجمے کے کام کی شروعات منصور کے دور میں ہوئی تھی۔"

جب عباسیوں کے دور میں میں فلسفہ یونان کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا تو اسلامی عقائد کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ پھر ان عقائد کا مقابلہ کرنے کے لیے "علم کلام" منظر عام پر آیا جس سے اسلامی عقائد میں ابتدا والی سادگی نہ رہی۔ توحید علم کلام کا ایک مسئلہ بن کر رہ گئی نیز اہل سیاست کی دین میں دخل اندازی کی وجہ سے اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ کا نظریہ سامنے آیا۔ اگر بالفرض کسی صحابی سے کوئی غلطی ہوئی بھی تو وہ اجتہادی غلطی تھی۔ (العواصم من القواصم)

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام ۲۷ مئی ۱۹۳۲ء کے خط میں رقمطراز ہے (نہرو کے تمام خطوط "تاریخ عالم پر ایک نظر" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں)۔

"عباسی خلیفہ بڑے زبردست فرمانروا تھے۔ اُن کی سلطنت عام معیار کے مطابق ایک بڑی سلطنت تھی۔ وہ پرانا جذبۂ ایمان اور جوشِ عمل جو پہاڑوں کو فتح کر لیتا تھا اور سوکھے جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل جاتا تھا اب کہاں تھا؟ اب نہ وہ سادگی باقی رہ گئی تھی اور نہ جمہوریت تھی اور خلیفہ بھی ایران کے شہنشاہ سے جسے عربوں کے اسلاف نے شکست دی تھی یا قسطنطنیہ کے بادشاہ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ رسولؐ کے زمانے کے عربوں میں وہ عجیب و غریب طاقت اور زندگی تھی جس کا بادشاہوں کی فوجیں بھی مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ وہ اپنے زمانے کی دنیا میں سرفراز اور سربلند تھے۔ اور جس وقت وہ آندھی کی طرح اٹھتے اور طوفان کی طرح بڑھتے تھے تو بڑے بڑے بادشاہوں اور اُن کے لشکروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ عوام اُن بادشاہوں سے عاجز آ گئے تھے اور عرب، عوام کی بہبودی اور سماجی انقلاب کا پیام لے کر آئے تھے اس لئے سب اُن کا خیر مقدم کرتے تھے۔ لیکن اب یہ سب

ہسپتالوں، پلوں، سڑکوں اور نہروں کی تعمیر برامکہ کی لیاقت کا مظہر تھی۔ برامکہ نے سترہ سال تک سلطنت کا انتظام چلایا اور بالآخر یہی لیاقت ہارون کے ہاتھوں اُن

باتیں کہاں تھیں۔ اب تو ریگستان کے رہنے والے محلوں میں براج رہے تھے اور کھجوروں کے بجائے لذیذ ترین غذائیں کھاتے تھے۔ جب خود اُن کی چین سے گزرتی تھی تو سماجی انقلاب یا تبدیلیوں کی فکر کیوں کرتے؟ انھوں نے بھی شان و شوکت کے معاملے میں پرانی سلطنتوں سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔ اور اس سلسلے میں اُن کی بہت سی بری عادتیں بھی سیکھ لیں۔ اُن میں سے ایک بری عادت جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں عورتوں کو گھروں میں بند کر کے رکھنا ہے۔

اب دارالخلافہ دمشق کی بجائے عراق میں بغداد کو منتقل ہو گیا۔ دارالخلافہ کی یہ تبدیلی خود اپنی جگہ پر نہایت اہم تھی کیونکہ بغداد ایرانی بادشاہوں کی آرام گاہ تھا۔ اس کے علاوہ دمشق کے مقابلے میں وہ یورپ سے زیادہ دور تھا۔ گویا اب عباسیوں کی نظر یورپ کی بجائے ایشیاء کی طرف زیادہ تھی۔ ابھی تو قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی بہت سی کوششیں اور یورپین اقوام سے بہت سی لڑائیاں ہونا باقی تھیں لیکن یہ سب لڑائیاں عموماً مدافعتی ہوئیں۔ فتوحات کا زمانہ تو اب ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے عباسی خلیفہ یہ چاہتے تھے جو کچھ سلطنت باقی رہ گئی ہے اُس کو مضبوط اور مستحکم بنا لیں۔ اسپین اور افریقہ کو چھوڑ کر بھی یہ سلطنت بہت بڑی تھی۔

بغداد کا نام تو تمھیں خوب یاد ہوگا۔ وہی ہارون الرشید و شہرزاد کا بغداد جس کے حیرت انگیز قصے الف لیلہ میں لکھے ہیں؟ عباسی خلفاء کے زمانے میں جس شہر کو عروج ہوا یہ وہی الف لیلہ کا شہر تو تھا۔ یہ بہت بڑا شہر تھا۔ جو محلوں، سرکاری دفتروں، اسکولوں اور کالجوں، بڑی بڑی دوکانوں، باغوں اور چمنوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں کے تاجروں کی مشرق اور مغرب کے ساتھ نہایت وسیع پیمانے پر تجارت جاری تھی۔ بیشمار سرکاری حکام سلطنت کے دور دراز کے مقامات کی خبر رکھتے تھے۔ نظام حکومت اب زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا تھا اور بہت سے محکموں پر مشتمل تھا۔ ڈاک کا نہایت معقول انتظام تھا اور اس کے ذریعے سے سلطنت کا گوشہ گوشہ دارالخلافہ سے منسلک تھا۔ ہسپتالوں کی افراط تھی۔ ساری دنیا سے لوگ بغداد آیا کرتے تھے خاص کر عالموں، طالب علموں اور صناعوں کے لئے یہ خاص کشش رکھتا تھا کیونکہ یہ مشہور تھا کہ خلیفہ قابل لوگوں کی اور ماہرین فن کی بڑی قدر کرتا ہے۔

خلیفہ خود بڑی عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے چاروں طرف غلاموں کا مجمع رہتا تھا اور اُس کا حرم عورتوں سے پُر تھا۔ ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے سلطنت عباسیہ ۷۸۶ء سے ۸۰۹ء تک ہارون الرشید کے زمانے میں اوج کمال پر تھی۔ ہارون الرشید کے دربار میں چین کے شہنشاہ اور مغرب کے بادشاہ چارلی کے پاس سے سفیر آیا کرتے تھے۔ غرض بغداد اور عباسی سلطنت، فن حکومت

کی تباہی کا موجب بن گئی۔ اگرچہ عباسہ اور جعفر برمکی کے معاشقے اور اُن کی خفیہ ملاقاتوں کے نتیجے میں عباسہ کے حاملہ ہونے کی کہانی بھی مشہور ہے لیکن یہ محض

تجارت اور علم وفضل کی ترقی کے معاملے میں اسپین کو چھوڑ کر جو عربوں (بنی امیہ) ہی کے زیر حکومت تھا سارے یورپ سے بڑھی ہوئی تھی۔

عباسی دور سے خاص طور پر ہمیں اس لئے دلچسپی ہے کہ اُس نے سائنس کا ایک نیا شوق پیدا کردیا۔ تم جانتی ہو کہ جدید دنیا میں سائنس بہت بڑی چیز ہے۔ ہم اُس کے بہت زیادہ مرہون منت ہیں۔ سائنس محض بیٹھ کر مختلف چیزوں کے ظہور میں آنے کی دعا نہیں کیا کرتی۔ وہ اس کی جستجو کرتی ہے کہ یہ چیزیں کیوں اور کیسے ظہور میں آتی ہیں۔ وہ تجربوں پر تجربے کرتی ہے۔ بار بار کوشش کرتی ہے۔ کبھی ناکام رہتی ہے اور کبھی کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ تھوڑا تھوڑا کر کے انسانی علم میں اضافہ کرتی ہے۔ ہماری موجودہ دنیا قدیم دور یا دور وسطیٰ سے بالکل مختلف ہے اور یہ سب سائنس ہی کے طفیل ہے۔ سچ پوچھو تو جدید دنیا سائنس کی ساختہ و پرداختہ ہے۔

قدیم زمانے میں نہ تو مصر میں، نہ چین میں اور نہ ہندوستان میں سائنس کا رواج تھا۔ البتہ قدیم یونان میں اس کا تھوڑا بہت چرچا تھا۔ اس کے بعد روم میں اس کا نشان تک نہیں ملتا لیکن عربوں میں تحقیق وتفتیش کا یہ جذبہ موجود تھا۔ اس لئے انھیں موجودہ سائنس کا بانی کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ بعض مضامین میں مثلاً طب اور ریاضی میں انھوں نے ہندوستان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے پنڈت اور ریاضی داں کافی تعداد میں بغداد پہنچے تھے اور بہت سے عربی طالب علم شمالی ہند میں ٹیکسلا میں آئے تھے جو اب بھی بہت بڑی یونیورسٹی تھی اور طب کی تعلیم کے لئے خاص طور پر مشہور تھی۔ طبی اور دیگر مضامین کی سنسکرت کتابوں کا خاص طور پر عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ بہت سی چیزیں مثلاً کاغذ سازی عربوں نے چینیوں سے سیکھی لیکن دوسروں سے حاصل کئے ہوئے علم کی بنا پر انھوں نے خود بھی تحقیق و تفتیش کی اور بہت سی اہم چیزیں دریافت کرلیں مثلاً دوربین اور قطب نما سب سے پہلے ان ہی نے ایجاد کی۔ طب کے معاملے میں عربی حکماء اور جراح سارے یورپ میں مشہور تھے۔

اس میں شک نہیں کہ بغداد اُن تمام علمی تحریکوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دوسرا مرکز قرطبہ تھا جو مغرب میں عربی اسپین کا دار السلطنت تھا۔ ان کے علاوہ عربی دنیا میں اور بہت سی یونیورسٹیاں بھی تھیں جہاں علم کا چراغ روشن تھا مثلاً قاہرہ اور بصرہ اور کوفہ وغیرہ۔ لیکن ان تمام مشہور شہروں کی ناک بغداد تھا جس کے متعلق ایک عربی مؤرخ لکھتا ہے کہ ''وہ اسلام کا صدر مقام، عراق کا چشم و چراغ، سلطنت کی راجدھانی اور حسن و جمال، تہذیب وتمدن اور فنون لطیفہ کا مرکز تھا۔ اُس کی آبادی میں لاکھ سے زیادہ تھی یعنی ہمارے موجودہ کلکتہ یا بمبئی سے قریب قریب دوگنی تھی۔

ہارون کے جرم پر پردہ ڈالنے اور اُس کے مظالم کے لئے جواز پیدا کرنے کی غرض سے گھڑی گئی ہے۔ کئی مؤرخین نے لکھا ہے کہ ہارون اپنی بہن عباسہ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اُس نے اپنی بہن کی شادی جعفر برمکی سے کردی تھی اور یہ شرط رکھی تھی کہ وہ ''ملاپ'' سے پرہیز کریں گے اور فقط ہارون کی موجودگی میں ایک دوسرے سے ملا کریں گے تاہم عباسہ کی محبت نے دونوں میں ملاپ کرادیا جس کے نتیجے میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جب ہارون کو اس بات کا علم ہوا تو اُس نے برامکہ کو نابود کردیا۔

جس کسی نے یہ کہانی گھڑی ہے وہ یہ کہنا بھول گیا ہے کہ ہارون رشید احمق تھا وہ اس شادی کے نتائج کو نہیں سمجھتا تھا۔

کتاب شافیہ کا مصنف ابوفراس کتاب ثمرۃ الاوراق سے نقل کرتا ہے کہ

تمھیں یہ سن کر دلچسپی ہوگی کہ موزے پہننے کی ابتدا بغداد کے امراء نے کی تھی۔ ہماری ہندوستانی زبان میں موزہ کا لفظ عربی سے آیا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی کا لفظ شمیس عربی لفظ قمیص کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ قمیص اور موزے دونوں عرب سے قسطنطنیہ پہنچے اور وہاں سے سارے یورپ میں۔

عرب ہمیشہ سے بہت بڑے سیاح تھے۔ وہ برابر دور دور تک بحری سفر کرتے تھے اور افریقہ میں، ہندوستان کے ساحل پر، ملایشیا میں حتیٰ کہ چین میں بھی انھوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اُن کا ایک مشہور سیاح البیرونی گزرا ہے جو ہندوستان بھی آیا تھا اور ہیون سانگ کی طرح اُس نے بھی سفرنامہ لکھا ہے

عرب لوگ مؤرخ بھی تھے اور ہمیں اپنی کتابوں اور تاریخوں سے اُن کے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ سب بہت اچھے اچھے افسانے اور داستانیں لکھتے تھے۔ ﴿ابن سبا کا افسانہ بھی اسی دور کی تخلیق ہے﴾ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے عباسی خلفاء اور اُن کی سلطنت کا نام بھی نہ سنا ہوگا لیکن اُس پراسرار رومانی شہر الف لیلہ کے بغداد کو جانتے ہوں گے۔ تخیل کی دنیا اکثر واقعات کی دنیا کے مقابلے میں زیادہ حقیقی اور دیرپا ہوتی ہے۔

ہارون الرشید کے انتقال کے بعد ہی عربی سلطنت مصیبت میں پھنس گئی۔ ہر جگہ بدنظمی کا دور دورہ ہوگیا۔ بہت سے صوبے خود مختار ہوگئے اور صوبیدار مستقل بادشاہ بن بیٹھے۔ خلیفہ روز بروز کمزور ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک دن ایسا آیا جبکہ خلیفہ صرف شہر بغداد اور اُس کے آس پاس کے گاؤں کا حکمران رہ گیا ایک خلیفہ کو تو سپاہیوں نے محل سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا تھا اور اُسے قتل کر ڈالا تھا۔''

ہارون رشید پہلا خلیفہ تھا جو پولو، چوسر اور شطرنج کھیلا کرتا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ اولادِ علیؑ میں سے کوئی بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے۔ یہ بات بعد میں دی جانے والی مثالوں سے واضح ہو جائے گی۔

ساٹھ شہداء

عیون الاخبار الرضاؑ (ص ۱۰۹) میں ہے کہ حامد بن قحطبہ طائی طوسی بیان کرتا ہے کہ ایک رات ہارون نے مجھے طلب کیا اور ایک تلوار دے کر کہا:

"اس خادم کی ہدایات پر عمل کرو۔" خادم مجھے ایک ایسے مکان پر لے آیا جو بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس مکان میں ایک کنواں اور تین کمرے تھے۔ ہر کمرے میں بیس بیس آدمی قید تھے جن کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں وہ پہلا کمرہ کھول کر لمبے اور گندھے ہوئے بالوں والے بیس آدمیوں کو نکال لایا جن میں پیر و جواں سب شامل تھے۔ ہارون کا خادم بولا: "ان سب کو قتل کر دو۔ یہ علیؑ اور فاطمہؑ کی اولاد ہیں۔"

میں نے یکے بعد دیگرے انھیں قتل کر دیا اور خادم نے ان کی لاشیں کنویں میں پھینک دیں۔ (جیسے آج کل ایجنسیاں لوگوں کو غائب کر دیتی ہیں) پھر اس نے دوسرا کمرہ کھولا۔ اس میں بھی بیس سادات تھے اور ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا۔ پھر تیسرا کمرہ کھولا گیا۔ اس میں بھی بیس سادات تھے اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا۔ آخر میں صرف ایک بوڑھا رہ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا:

"اے بد بخت! خدا تجھے غارت کرے۔ قیامت کے دن تو ہمارے نانا کو کیا منہ دکھائے گا۔ میرے ہاتھ کانپے اور میں گھبرا گیا تاہم خادم نے مجھے غصے سے دیکھا اور دھمکایا لہٰذا میں نے اُس بوڑھے کو بھی قتل کر دیا اور خادم نے اُس کی لاش بھی کنویں میں پھینک دی۔

ستونوں کے درمیان

ابوالفرج اصفہانی مقاتل الطالبین میں ابراہیم بن ریاح سے نقل کرتا ہے کہ جب ہارون نے یحییٰ بن عبد اللہ بن حسن بن حسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ کو گرفتار کیا تو اُس کے جسم پر ایک ستون تعمیر کرایا جبکہ وہ ابھی زندہ تھا۔ یہ عمل اُس نے اپنے دادا منصور سے ورثے میں پایا تھا۔ جب منصور بغداد کی بنیاد رکھ رہا تھا تو وہ اولادِ علیؑ کو پکڑ پکڑ کر اینٹوں اور چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں زندہ چنوا دیتا تھا۔

ایک دن منصور عباسی نے سیاہ زلفوں والے ایک خوبصورت جوان کو پکڑا جو امام حسنؑ کی اولاد میں سے تھا اور راج کو حکم دیا کہ اسے دیوار میں چن دو۔ اُس نے راج پر ایک ناظر بھی مقرر کر دیا تاکہ وہ اُس کی حکم عدولی نہ کر سکے۔ جب راج نے جوان کو دیوار میں ڈالا تو اسے رحم آگیا اور اُس نے دیوار میں ایک سوراخ چھوڑ دیا جس میں سے ہوا گزر سکتی تھی اور جوان سے کہا کہ میں رات کے وقت تمھیں نکال لوں گا۔ رات کی تاریکی میں راج نے جوان کو دیوار میں سے نکال لیا اور کہا:

"اب تم کچھ ایسا کرو کہ میرا اور میرے مزدوروں کا خون نہ بہے۔ میں نے تم کو اس لئے بچایا ہے کہ قیامت میں مجھے تمہارے نانا کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑے تمھیں فوراً چھپ جانا چاہیے۔" جوان بولا کہ "میں ایسا ہی کروں گا۔ بس تم میری ماں کو خبر کر دو کہ میں زندہ ہوں مگر اُن سے مل نہیں سکتا۔"

راج کہتا ہے کہ میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر گیا، اس کی ماں سے ملا اور سارا قصہ کہہ سنایا۔ میں نے اسے اُس کے بیٹے کے بال بھی دیئے جو اُس نے مجھے نشانی کے طور پر دیئے تھے۔

یحییٰ اور ہارون رشید

جب ہارون رشید کے ہاتھوں اولادِ علیؑ کی تعذیب شدت اختیار کر گئی تو یحییٰ

بن عبداللہ بن حسن نے دیلم[1] میں اُس کے خلاف بغاوت کر دی۔

مؤرخین کے مطابق یحییٰ کافی مدت تک روپوش رہا اور پناہ کی تلاش میں شہر بہ شہر پھرا حتیٰ کہ وہ دیلم پہنچا۔ وہاں اُس نے اپنی اصلیت ظاہر کردی اور لوگوں میں ہر دلعزیز ہوگیا۔ مختلف شہروں کے لوگ آکر اُس کے پاس پناہ لینے لگے۔ ہارون نے پچاس ہزار کی فوج دیکر فضل بن یحییٰ کو یحییٰ بن عبداللہ سے مقابلہ کرنے بھیجا۔ فضل نے یحییٰ کو خط لکھا اور اسے صلح کرنے کا مشورہ دیا۔ جب یحییٰ نے دیکھا کہ اُس کے ساتھیوں نے اسے دھوکا دیا ہے اور بھاگ نکلے ہیں تو وہ صلح کرنے پر راضی ہوگیا تاہم اُس نے فضل کو لکھا کہ ”میں فقط اُس وقت صلح کروں گا جب ہارون اپنے ہاتھ سے میرے لئے امان نامہ لکھے اور عدالت کے قاضی و فقہاء اور بنی ہاشم کے اکابرین اس کی تصدیق کریں۔ ہارون نے یحییٰ کی خواہش کے مطابق امان نامہ لکھ دیا جس پر گواہوں نے دستخط کر دیئے۔ اُس نے اس دستاویز کی دو نقلیں بنوائیں، ایک خود رکھ لی اور دوسری یحییٰ کو بھیج دی۔

جب یحییٰ ہارون کے سامنے آیا تو وہ اس کے ساتھ عزت سے پیش آیا، اسے دو لاکھ دینار، خلعتیں اور مختلف تحائف دیئے مگر اس کے دل سے کدورت گئی نہ تھی۔ ایک دن اُس نے یحییٰ سے پوچھا: ہم میں سے رسول اکرمؐ کا زیادہ قریبی رشتے دار کون ہے؟ یحییٰ نے کہا: مجھے اس سوال کا جواب دینے سے معاف رکھو۔ ہارون نے کہا: نہیں! جواب دیئے بنا تمھاری جان نہیں چھوٹے گی۔ اس پر اُن کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

یحییٰ: بالفرض اگر رسول اکرمؐ زندہ ہو جائیں اور تم سے تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگیں تو کیا تم رشتہ دو گے؟

ہارون: اللہ کی قسم! ضرور دوں گا۔

۱۔ ایران کے صوبہ گیلان میں قزوین شہر کے مغرب میں ایک پہاڑی علاقہ۔

یحییٰ: بالفرض اگر رسول اکرمؐ زندہ ہو جائیں اور میری بیٹی سے شادی کرنا چاہیں تو کیا یہ جائز ہوگا کہ میں اپنی بیٹی کی شادی اُن سے کردوں؟

ہارون: نہیں! یہ جائز نہیں۔

یحییٰ: اسی میں تمہارے سوال کا جواب ہے (یعنی میں اولادِ رسولؐ ہوں اور تم نہیں ہو لہٰذا میں آنحضرتؐ کا زیادہ قریبی عزیز ہوں) ہارون کو اپنی شکست پر بہت غصہ آیا اور وہ محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر ج ۵، ص ۹۰۔ ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبین، ص ۴۶۵)

نام نہاد علماء

ہارون رشید نے یحییٰ کو دھوکا دینے اور امان نامہ کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ کیا لیکن چونکہ اُس کے پاس اس فیصلے پر عملدرآمد کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس لئے وہ اس صورتحال کو برداشت کرتا رہا۔ بالآخر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اُس نے وہب بن وہب ابوالبختری سے رجوع کیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ عالم برائے فروخت ہے ابوالبختری نے امان نامہ پھاڑ دیا اور فتویٰ دیا کہ دستاویز غیر مؤثر ہے، یحییٰ کا خون حلال ہے۔ اُس خدمت کے بدلے ہارون نے اسے بھاری انعام دیا اور قاضی بھی بنا دیا۔ (ایسے ہی نام نہاد علماء چادر زہراؑ ہو کہ گلیم بوذرؓ، خون حسینؑ ہو یا پوری قوم ہر چیز بیچ کھاتے ہیں) اس فتویٰ کی بنا پر ہارون نے یحییٰ کو ایک سو کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ یحییٰ نے اسے قرابت رسولؐ یاد دلائی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر اُس نے اسے جیل بھیج دیا۔ دوسرے دن پھر بلوایا اور ایک سو کوڑے لگوائے۔ پھر اسے قید کردیا اور روٹی پانی بند کردیا تا آنکہ وہ فوت ہوگیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اُس کے جسم پر ستون تعمیر کیا گیا جیسا کہ ابراہیم بن ریاح سے نقل ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ خفقان سے زندان میں فوت ہوگیا۔ بات کچھ بھی ہو یہ تو گلا گھونٹ کر مارنے والی بات ہے۔

ابو البختری جیسے لوگ ہارون سے پہلے بھی تھے، اس کے بعد بھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتا ہے کہ یزید بن عبدالملک کے لئے چالیس نام نہاد علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ خلفاء حساب کتاب اور عذاب سے بری ہیں (تاریخ کامل ج ۴، ص ۱۹۱ طبع ۱۳۵۷ھ)

میں ایسے کتنے ہی نام نہاد علماء کو جانتا ہوں جو ہارون اور یزید جیسے حکمرانوں کی کاسہ لیسی کرتے ہیں، ان کے فسق و فجور کی تائید کرتے ہیں اور دین دار اور دین کے مددگار علماء کے خلاف بیان داغتے رہتے ہیں۔

ہارون کی علمیت

ایک عورت نے ہارون کو خط میں لکھا کہ اَتَمَّ اللّٰهُ اَمْرَکَ وَفَرِحَکَ بِمَا آتَاکَ وَ زَادَکَ رِفْعَةً یعنی خدا تمہارا کام پورا کرے، اپنی عطاؤں سے تمہیں خوش رکھے اور تمہارا اقبال بلند کرے۔

ہارون نے اپنے درباریوں سے کہا: اس عورت نے دعا کے پردے میں مجھے بددعا دی ہے۔ جب یہ کہتی ہے کہ خدا تمہارا کام پورا کرے تو اس کا اشارہ اُس شعر کی طرف ہے جس میں شاعر کہتا ہے: ''جب یہ کہا جائے کہ تمہارا کام پورا ہوچکا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم اپنی بربادی کا انتظار کرو۔'' اور جب یہ کہتی ہے کہ خدا اپنی عطاؤں سے تمہیں خوش رکھے تو اس کا اشارہ اس آیت کی طرف ہے: حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ''جب اُن چیزوں سے جو اُن کو دی گئی تھیں خوب خوش ہوگئے تو ہم نے اُن کو ناگہاں پکڑ لیا۔'' اور جب یہ کہتی ہے کہ تمہارا اقبال بلند ہو تو اس کا اشارہ اس شعر کی طرف ہے:

مَا طَارَ طَیْرٌ وَ ارْتَفَعْ　　اِلَّا کَمَا طَارَ وَقَعْ

پرندہ جس تناسب سے اونچا اڑتا ہے اسی تناسب سے نیچے گرتا ہے۔

اولاد ابو طالبؑ

ابو الفرج اصفہانی مقاتل الطالبین میں لکھتا ہے کہ ہارون برابر اولاد علیؑ کے متعلق اپنے ملازموں سے پوچھ گچھ کرتا رہتا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ اولاد علیؑ میں سے ایک عبد اللہ بن حسن بن علی ہے جو فلاں جگہ رہتا ہے۔ ہارون نے اسے بلا بھیجا۔ عبد اللہ آئے اور بولے کہ میرا بنی ہاشم کے انقلابی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ میں شہر کے ویرانوں میں گھومتا ہوں اور شکار کے ذریعے پیٹ بھرتا ہوں۔ اللہ سے ڈرو اور میرا خون بہانے سے باز رہو۔ ہارون نے عبد اللہ کو قید کر دیا۔ بعدازاں اُس کے ایک وزیر نے انھیں شہید کردیا۔ اس نے محمد بن یحییٰ بن عبد اللہ بن حسن بن حسن کو بھی قید کر دیا اور وہ قید خانے میں ہی شہید ہوگئے۔

اُس نے حسین بن عبد اللہ بن اسماعیل بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب کو اتنے کوڑے لگوائے کہ انھوں نے دم توڑ دیا۔ اسحاق بن حسین بن زید بن حسن بھی ہارون کے زندان میں شہید ہوئے۔ عباس بن محمد بن عبد اللہ بن علی بن حسن ہارون کے سامنے آئے تو ہارون نے کہا: یا ابن فاعلة! عباس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا: ''فاعلہ تیری ماں ہوگی۔'' یہ سن کر ہارون کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے حکم دیا کہ اس کا سر پھاڑ دو چنانچہ اُن کے سر پر لوہے کی سلاخ ماری گئی اور وہ شہید ہوگئے۔

امام موسیٰ کاظمؑ اور ہارون رشید

قرآن نے رہبروں کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک قسم حق و ہدایت کے رہبروں اور دوسری قسم باطل اور گمراہی کے پیشواؤں کی ہے۔ ارشاد باری ہے: وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ''ہم نے اُن کو امام بنایا تھا۔ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے اُن کو نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکات دینے

کی وحی کی اور وہ ہماری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔" یہ صفات بالخصوص امام علیؑ اور اُن کی نسل پاک میں ہونے والے ائمہ طاہرینؑ کی صفات ہیں۔

ایک اور جگہ خدا فرماتا ہے: وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ یعنی ہم نے اُن کو امام بنایا تھا۔ وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن اُن کی مدد نہیں کی جائے گی۔ (سورۂ قصص: آیت ۴۱)

یہ صفات بالخصوص ہارون رشید، بنی امیہ، بنی عباس اور شیطنت میں اُن کے ہم فکر لوگوں کی صفات ہیں۔

یہ حقائق مدنظر رکھتے ہوئے امام موسیٰ کاظمؑ اور ہارون رشید کے درمیان مقابلہ ایک فطری اور حقیقی مقابلہ تھا۔ ایک امام لوگوں کو اللہ اور جنت کی طرف بلاتا تھا اور دوسرا امام انھیں شیطان اور دوزخ کی طرف بلاتا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دو متضاد مقاصد جمع ہو جائیں؟[1] اگرچہ بظاہر لاپروائی، مسکراہٹ اور خاموشی نظر آتی ہے لیکن وہ اُس راکھ کی طرح ہے جس کے نیچے چنگاری دبی ہوئی ہو۔ جب تک دل دشمنی اور نفرت سے بھرا ہوا ہو یہ آگ سلگتی رہتی ہے۔

ہماری اس بات کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل واقعہ دیکھئے۔

عیون اخبار الرضاؑ (ص ۹۳) میں ہے کہ مامون نے کہا: میں ہمیشہ اہل بیتؑ سے محبت کرتا رہا ہوں لیکن ہارون کا التفات حاصل کرنے کے لئے اُن سے دشمنی کا دکھاوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب ہارون مکہ گیا تو میں اُس کے ہمراہ تھا۔ جب ہم

۱۔ سورہ قل یا ایھا الکافرون کی شان نزول کے سلسلے میں آیا ہے کہ جب قریش (کے ولید بن مغیرہ عاص بن وائل، اسود بن مطلب اور امیہ بن خلف) نے سرکار رسالت پناہؐ سے یہ کہا کہ کیوں نہ ہم افہام وتفہیم سے کام لیتے ہوئے عبادت کے مسئلے میں اشتراک کرلیں۔ ایک سال آپ ہمارے خداؤں کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کریں تو آنحضرتؐ نے اُن کی یہ تجویز رد کردی۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

مدینہ پہنچے تو امام موسیٰ کاظمؑ ہارون سے ملنے تشریف لائے۔ ہارون اُن کا احترام بجا لایا، اُن سے معانقہ کیا اور اُن کے افراد خاندان کا حال احوال پوچھا۔ جب امام رخصت ہونے لگے تو ہارون رشید اٹھ کھڑا ہوا اور انھیں بڑے تپاک سے رخصت کیا۔ جب امام رخصت ہوگئے تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا: یہ کون شخص تھا جس کی آپ نے اتنی تعظیم کی؟ میرے باپ نے کہا: یہ علوم انبیاءؑ کے وارث موسیٰ بن جعفرؑ تھے۔ اگر تم سچا علم سیکھنا چاہتے ہو تو ان سے سیکھ سکتے ہو۔

ہارون نے امام سے معانقہ کیا، اُن کی تعظیم کی اور تسلیم کیا کہ وہ علوم انبیاءؑ کے وارث تھے تاہم یہ تصدیق اور امام کی یہ عزت ہارون کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھی کیونکہ امام لوگوں کو جنت کی دعوت دیتے تھے جبکہ ہارون انھیں جہنم کی طرف بلاتا تھا۔ جب ہارون نے دیکھا کہ لوگ امام سے محبت کرتے ہیں اور آپ پر ایمان رکھتے ہیں تو یہ جانتے ہوئے کہ آپ وارث علوم انبیاءؑ ہیں وہ اپنے بغض پر قابو نہ پاسکا اور اس نے متعدد رسول زادوں کو قتل کر دیا۔

اگر لوگ علم اور اہل علم سے محبت کرتے تھے اور حق اور اس کے حامیوں میں دلچسپی رکھتے تھے تو اس میں امام موسیٰ کاظمؑ کا کیا قصور تھا؟ کیا وہ جاہل بن جاتے اور کھلم کھلا ناجائز اعمال انجام دیتے تاکہ ہارون اُن سے اسی طرح خوش ہو جائے جس طرح وہ مخارق وغیرہ سے خوش تھا؟ اگر کسی شخص کا کوئی دشمن ہو جس کی تشفی اُس کے مرنے سے ہی ہوسکتی ہو تو کیا اسے دشمن کو خوش کرنے کے لئے خودکشی کر لینی چاہیے؟

امام کاظمؑ نے حکومت کے خلاف قیام نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کسی کو اپنی بیعت کرنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ انھوں نے کسی کو ہارون کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے نہیں اکسایا تھا۔ آپ کی واحد خطا یہ تھی کہ آپ نے پیغمبروں کا علم ورثے میں پایا تھا اور آپ حق وہدایت کے امام تھے۔

ہارون کے حکم پر امام کی نظر بندی

ہارون رشید نے اپنے سپاہی امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس بھیجے۔ اُس وقت آپ اپنے نانا کی قبر مبارک کے پاس نماز ادا کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے آپ کو گرفتار کر کے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور بصرہ بھیج دیا۔ اُس وقت بصرہ کا عامل عیسیٰ بن جعفر بن منصور تھا۔ اُس نے امام کو ایک سال قید رکھا اور پھر ہارون کو ایک خط لکھا کہ اگر تم موسیٰ بن جعفرؑ کو میری تحویل سے نہیں نکالو گے تو میں انھیں رہا کر دوں گا کیونکہ میں نے اُن کے خلاف ثبوت مہیا کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اُن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔

ہارون نے امام موسیٰ کاظمؑ کو بغداد بلا لیا اور فضل بن ربیع کے قید خانے میں، پھر یحییٰ کے اور پھر سندی بن شاہک کے قید خانے میں بھیج دیا۔ بالآخر سندی نے انھیں زہر دے کر شہید کر دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق انھیں ایک قالین میں لپیٹا گیا اور نوکر اُن پر بیٹھ گئے جس سے اُن کا دم گھٹ گیا اور وہ وفات پا گئے۔

بنی امیہ کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ ان تمام جرائم کی وجہ بغض اور فطری پستی ہے تاہم ہارون رشید کی شخصیت پر بحث کے دوران جو بات میرے ذہن میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ حکمران بن جانے کے بعد انسان کی فطرت اور اخلاق میں تبدیلی آجاتی ہے۔ جب وہ اپنی کرسی کو مضبوط سمجھنے لگتے ہیں تو ہر چیز کا اندازہ کرسی کی طاقت کے حوالے سے لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منصب اور طاقت کے مقابلے میں عقیدہ، علم اور ضمیر کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

اگر ہم حکومت کو ذہنیت میں تبدیلی کا سبب نہ سمجھیں تو ہم اُن کمزور لوگوں کے رویے کی کیا توجیہہ کریں گے جنھیں جب کوئی منصب مل جاتا ہے تو وہ سخت دل بن جاتے ہیں۔ منصب سے میری مراد فقط سرکاری عہدہ ہی نہیں بلکہ دینی عہدہ بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دینی سربراہ بھی ایک سرکاری سربراہ کی مانند ہوتا ہے

دونوں اپنے اپنے عہدے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان دونوں میں واحد فرق یہ ہے کہ دینی سربراہ اپنے عہدے کو مقدس سمجھتا ہے اور اس کی حفاظت کرنا اپنا دینی فرض سمجھتا ہے۔ وہ اس کی حفاظت کو دوسرے مقدسات کی حفاظت کی طرح ضروری جانتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی سربراہی میں دلچسپی زیادہ خطرناک اور زیادہ نقصان دہ ہے۔ صرف اہل بیت عصمتؑ اور خاندان عصمت کے پیرو جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اس خطرے سے محفوظ ہیں۔[1]

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ آیت اللہ محسن الحکیم اپنی کتاب مستمسک العروۃ میں اجتہاد و تقلید مسئلہ ۲۲ کے فٹ نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں:

''انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ایک مرجع تقلید کے لئے عدل برقرار رکھنا بڑا مشکل ہے کیونکہ ہر ایک کی عدالت میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آجاتی ہے۔ اور جب کسی ''اعلیٰ عہدیدار'' میں عدل کی قوت نہ رہے، وہ احتیاط کا دامن اور اپنا احتساب کرنا چھوڑ دے تو اُس کی عدالت جلد ہی کالعدم ہو جاتی ہے کیونکہ ''مرجعیت'' ایک خطرناک مقام ہے جو بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔''

امام رضاؑ اور ہارون

سید محسن امین اعیان الشیعہ (ج ۱، ص ۶۰) میں لکھتے ہیں: امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد ہارون نے اپنے کمانڈر ''جلودی'' کو مدینہ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ

۱۔ ہمارے اس عقیدے کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کسی بشر کو کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی بجائے میرے بندے ہو جاؤ اور خدا کی عبادت کرنا ضروری نہیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۷۹) اس سے اگلی آیت کہتی ہے ممکن ہے کہ طاقت کی بنا پر کوئی شخص خدا ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ اس لغزش سے اپنے آپ کو وہی لوگ بچا سکتے ہیں جو ایمان اور تقویٰ کی دولت سے مالا مال ہوں۔ (مؤلف)

آل ابی طالب کے گھروں پر حملہ کرے اور اُن کی ہر عورت کا ایک جوڑا چھوڑ کر باقی تمام لباس لوٹ لے۔ چنانچہ جلودی جب امام رضاؑ کے گھر پہنچا تو امام نے گھر کی تمام خواتین کو ایک کمرے میں جمع کر دیا اور خود گھر کی دلہیز پر بیٹھ گئے۔ جلودی نے کہا: "میں گھر میں ضرور داخل ہوں گا اور عورتوں کے کپڑے لے جاؤں گا۔" امام نے قسم کھائی کہ وہ عورتوں کے فالتو کپڑے اور زیور اس کو لا دیں گے بشرطیکہ وہ گھر کے باہر ہی کھڑا رہے۔ امام کی خوش اخلاقی کے نتیجے میں وہ آپ کی بات مان گیا۔ تب امام گھر میں گئے اور آپ نے کپڑے اور زیور وغیرہ لا کر جلودی کے حوالے کر دیئے۔ وہ انھیں ہارون کو پیش کرنے کے لئے لے گیا۔ جب مامون تخت نشین ہوا تو اُس نے جلودی پر غصے کا اظہار کیا اور اسے قتل کرنا چاہا۔ امام رضاؑ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے مامون سے سفارش کی کہ جلودی کی جان بخش دے تاہم جلودی کو امامؑ کے ساتھ اپنی بدسلوکی یاد تھی۔ وہ سمجھا کہ آپ مامون کو اُس کے خلاف اکسا رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے مامون سے کہا: "خدا کے واسطے میرے متعلق ان کی بات نہ مانیے۔" مامون نے کہا: "بخدا جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں میں وہ نہیں مانوں گا۔" چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ جلودی کی گردن اڑا دی جائے۔

ہارون نے اولادِ علیؑ اور دوستانِ علیؑ پر بہت ظلم کئے لیکن طوالت سے بچنے کے لئے ہم ان کا ذکر کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ہارون کے کردار کو سمجھنے کے لئے کافی ہے اور اُس کی فطرت اور پالیسیوں پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔

امین عباسی

ہارون نے ۲۳ سال سے زیادہ حکومت کی۔ وہ ۱۹۳ھ میں طوس میں فوت ہوا اُس نے امین کے لئے بیعت لی۔ امین کی خلافت کی مدت ۴ سال سے کچھ اوپر تھی

ابو الفرج اصفہانی مقاتل الطالبین لکھتا ہے: ابوطالبؑ کی اولاد سے امین کا رویہ اپنے پیشروؤں سے مختلف تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا۔ بعد میں اُس کے اور مامون کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور وہ مارا گیا۔ امین اور مامون کے دور میں اولادِ ابوطالبؑ کے بارے میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا۔

مامون رشید عباسی

مامون اپنے بھائی امین کو قتل کر کے تخت نشین ہوا۔ ہارون اور مامون کے زمانے میں شیعہ عقیدے نے مضبوطی سے جڑ پکڑ لی اور اُس کا اثر مامون کے دربار میں بھی ظاہر ہوا۔ مامون کا وزیر فضل بن سہل ذو الریاستین شیعہ تھا اور مامون کا سپہ سالار طاہر بن الحسین خزاعی بھی جس نے اُس کے لئے بغداد فتح کیا اور اُس کے بھائی امین کو قتل کیا شیعہ تھا۔ المختصر مامون کی حکومت میں بہت سے شیعہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ فضل اور طاہر سے خوفزدہ رہنے لگا۔ لہٰذا اُس نے فضل کو قتل کر دیا اور طاہر کو سپہ سالاری سے سبکدوش کر کے ہرات کا عامل بنا دیا۔ ابن اثیر نے تاریخ کامل میں ۲۰۵ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھا ہے کہ طاہر کا پورا قبیلہ شیعہ تھا۔ (تاریخ الشیعہ از علامہ شیخ محمد حسن مظفر)

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خودسر حکمرانوں نے شیعوں پر جو مظالم ڈھائے اور قاتلانہ حملے کئے وہ شیعہ عقیدے کے پھیلاؤ کا موجب بن گئے۔ انھوں نے جتنے زیادہ ظلم کئے اتنے زیادہ لوگ اہل بیتؑ کے گرد جمع ہو گئے اور ہر مقتول کے مقابلے میں ہزاروں افراد نے شیعہ مذہب قبول کر لیا۔ مندرجہ ذیل واقعے سے ہمارے قول کی وضاحت ہو جائے گی۔

جب سندی بن شاہک نے امام موسیٰ کاظمؑ کو زہر دیکر شہید کیا تو وہ ۸۰ علماء اور اکابرین کو امام کی میت کے پاس لایا اور کہنے لگا: تم لوگ دیکھ سکتے ہو کہ وہ

تکلیف میں نہ تھے اور طبعی موت مرے ہیں۔ اس نے خواص کو اس لئے بلایا تا کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ امام کے جسم اطہر پر زخم، خراش یا تشدد کا کوئی نشان نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ انھیں قتل کیا گیا ہے۔

ہارون نے ایسا اس لئے کیا کہ لوگوں کو شک تھا کہ امام کو زہر دے کر شہید کیا گیا ہے اور یہ شک اُس کے خلاف بغاوت کے لئے کافی تھا۔ بعدازاں امام کا جنازہ بغداد کے پل پر رکھ دیا گیا۔ چونکہ بیشتر شیعہ اس علاقے میں رہتے تھے اس لئے انھوں نے پکار کر کہا: "موسیٰ بن جعفرؑ انتقال فرما گئے ہیں۔ آؤ اُن کا آخری دیدار کر لو۔" شیعہ یہ سن کر مشتعل ہو گئے اور اس سے پہلے کہ فساد پھوٹ پڑتا ہارون کے چچا سلیمان بن جعفر نے جنازہ پولیس سے اپنی تحویل میں لے لیا اور ایک بڑے ہجوم کے ہمراہ اسے ننگے پاؤں لے کر چلا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ امام سے محبت کی بنا پر یا اُن کے ساتھ اپنی رشتے داری کی وجہ سے وہ اُن کے جنازے کی مشایعت کر رہا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں اُس کے بھتیجے ہارون کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے۔ اسی لئے وہ لوگوں کے جذبات ٹھنڈے کرنا چاہتا تھا۔

جب مامون کو پتا چلا کہ اُس کی سلطنت میں شیعوں کی بہت بڑی تعداد کا رجحان امام رضاؑ کی جانب ہے اور وہ اُس کے باپ ہارون سے ناخوش ہیں بلکہ سابقہ عباسی حکمرانوں سے نفرت کرتے ہیں تو اُس نے شیعوں کے دل جیتنے کے لئے منافقانہ طور پر شیعہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اُس نے امام علیؑ کی خلافت کا دفاع کرنا شروع کر دیا، اُن کی حقانیت کا اثبات کیا اور یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ابوبکرؓ اور عمرؓ سے افضل ہیں۔ دراصل اُس نے یہ سب کچھ اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لئے کیا۔ تعجب کی بات ہے کہ بہت سے شیعہ بھی مامون کے منصوبے کو نہ سمجھ سکے اور انھوں نے اُس کے بارے میں اچھی رائے قائم کر لی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہارون

اور مامون نے ایک ہی مقصد کی خاطر کوشش کی اور وہ مقصد اپنی سلطنت کو مضبوط بنانا تھا۔ اُن کے طریقے مختلف تھے لیکن مقصد ایک ہی تھا۔ ہارون نے امام کاظمؑ کو زہر دیا اور مامون نے امام رضاؑ کو زہر دیا۔ اُن میں واحد فرق یہ تھا کہ ہارون کی غلطیوں سے مامون سیکھ گیا کہ اولادِ علیؑ کی کھلم کھلا مخالفت کرنا سیاسی خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔

امام رضاؑ اور مامون

امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام اپنے زمانے کے سب سے بہترین انسان تھے۔ وہ خدا اور خلقِ خدا کی نظروں میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب وہ نیشاپور[1] سے گزرے تو ہزاروں لوگ اُن کے استقبال کے لئے

---

[1] یہ واقعہ نیشاپور میں پیش آیا تھا جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ عوام کو خصوصاً ایران کے عوام کو ائمہ اطہارؑ سے کتنی گہری محبت اور عقیدت تھی۔ عباسی خلافت کے اہلکاروں کی تمام تر سرگرمیوں کے باوجود کتنی عجیب بات ہے کہ مامون نے اپنی سیاست چمکانے کے لئے جس کی تفصیل کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے امام رضاؑ کو نہایت احترام کے ساتھ مدینہ سے نکالا لیکن خفیہ طور پر اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ امام کو ایسے شہروں سے نہ گزارا جائے جہاں اُن کے شیعہ آباد ہیں لہٰذا آپ کو اُن راستوں سے گزارا گیا جہاں شیعہ آباد نہیں تھے اور جہاں کے لوگ آپ کو پہچانتے نہیں تھے۔

ذرا امام رضاؑ کے لئے مامون کے ظاہری احترام کو بھی دیکھیے اور اُس کی سیاسی چال کو بھی جس پر پس پردہ کام ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ امام رضاؑ کو خاص طور پر قم نہیں لایا گیا جو شیعوں کا مرکز تھا۔ علاوہ ازیں بغداد جو دارالخلافہ تھا اور کسی ایک گروہ کا نہیں بلکہ تمام گروہوں کا مرکز تھا۔ امام رضاؑ کو وہاں لیکر آنا ممکن تھا لیکن صرف اس وجہ سے کہ وہاں امام کی آمد سے مامون کے خلاف فضا بن سکتی تھی نہیں لایا گیا۔ اسی طرح آپ کو کوفہ بھی نہیں لایا گیا بلکہ غیر معروف راستوں سے نیشاپور لے جایا گیا۔ ہارون کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ خراسان کے اس دور افتادہ شہر میں اس طرح کے جذبات دیکھنے میں آئیں گے اور لوگ امام رضا علیہ السلام کا پرتپاک استقبال کرنے کے لئے گھروں سے نکل آئیں گے۔

جب امام کی سواری نیشاپور پہنچی تو لوگوں کا ایک سیلاب آپ کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا۔ مرد و زن اور چھوٹے بڑے سبھوں نے آپ کا نہایت ہی عظیم الشان استقبال کیا۔

راستوں میں جمع تھے۔ علماء نے امام کی سواری کی مہار تھام رکھی تھی۔ وہ علم امام سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور اُن کی زبان مبارک سے اُن کے آباؤ اجداد کی حدیث سننے کے خواہشمند تھے۔

امام رضاؑ کی نماز عید اور مامون

مامون نے امام رضاؑ سے درخواست کی کہ عید کی نماز آپ پڑھائیں لیکن امام نے اُن شرائط کے مطابق جو ولی عہدی کے وقت طے ہوئی تھیں نماز پڑھانے سے معذرت کر لی۔ مامون کا اصرار بہت بڑھا تو امام نے اُس کی درخواست قبول کر لی اور فرمایا کہ میں اسی طرح نماز پڑھانے جاؤں گا جس طرح رسول خداؐ جایا کرتے

شہر کے علماء بھی آپ کے والہانہ استقبال کے لئے آئے۔ اور وہ شخص جو اس شہر کے لوگوں میں سب سے بڑا عالم تھا اُس نے درخواست کی کہ یہ اعزاز مجھے بخشا جائے کہ امام رضاؑ کے اونٹ کی مہار میرے ہاتھ میں ہو یعنی امام کی ساربانی کا اعزاز نیشاپور کے سب سے بڑے عالم نے حاصل کیا...

لوگوں نے عرض کی کہ مولا! ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس آپ کی کوئی یادگار باقی رہ جائے اس لئے آپ ہمارے درمیان سے گزرتے ہوئے ہمیں کوئی تحفہ دیتے جائیں اور وہ یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ آپ کوئی حدیث بیان فرمائیں جسے ہم لکھ کر محفوظ کر لیں۔ یہ جو مشہور ہے کہ بارہ ہزار طلائی قلمدان باہر نکلے تھے اس لئے اس حدیث کو سلسلۃ الذہب کہا گیا ہے یہ بات بے اساس ہے۔ اس حدیث کو سلسلۃ الذہب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے تمام راوی ائمہ طاہرینؑ ہیں۔ نیشاپور احادیث کے قدر دانوں کا مرکز تھا اس لئے امام سے خواہش کی گئی کہ آپ کوئی حدیث بیان فرمائیں۔

لکھا ہے کہ امام رضاؑ نے جب محمل سے روئے انور باہر نکالا اور دیکھنے والوں کی نظر آپ پر پڑی تو وہ بول اٹھے لَـهٗ شُبْهَانِ كَشُبْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ. آپ کی شکل و شباہت تو رسول خداؐ جیسی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے درمیان جوش و خروش بڑھ گیا۔ اس کے بعد امام نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا: میں نے اپنے پدر بزرگوار سے سنا اور انھوں نے اپنے پدر بزرگوار سے یہاں تک کہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا سلسلہ رسول خداؐ سے ہو کر لوح و قلم اور خدائے عزوجل تک پہنچا کہ خدائے عزوجل فرماتا ہے: كَلِمَةُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِيْ فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِيْ اَمِنَ مِنْ عَذَابِيْ "کلمہ توحید میرا حصار ہے پس جو اس حصار میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔"

(استاد شہید مطہری، جنگل مطہر، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان)

تھے۔ مامون نے امام کی بات مان لی۔ لوگ انتظار میں تھے کہ امام رضاؑ بھی اُن ہی آداب و رسوم کے ساتھ جو خلفاء اور امراء کا خاصہ تھا تشریف لائیں گے لیکن جب انھوں امام کو برہنہ پا بیت الشرف سے برآمد ہوتے اور تکبیر پڑھتے ہوئے عیدگاہ کی طرف رواں دواں دیکھا تو حیران رہ گئے۔ امراء و روسائے سلطنت یکبارگی اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے انھوں نے بھی اپنے جوتے اتار دیئے اور روتے ہوئے اور تکبیر کہتے ہوئے امام کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ امام ہر قدم پر تین مرتبہ تکبیر کہہ رہے تھے۔

لکھا ہے کہ فضل بن سہل نے مامون سے کہا: اِنْ بَلَغَ الرِّضَا الْمُصَلّٰى عَلٰى هٰذَا السَّبِيْلِ افْتَتَنَ بِهِ النَّاسُ وَالرَّأْىُ اَنْ تَسْاَلَهٗ اَنْ يَّرْجِعَ اگر رضاؑ اس حال میں نماز پڑھانے کے لئے پہنچ گئے تو لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھیں گے لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ آپ انھیں واپس بلا لیں۔ مامون نے آدمی دوڑایا کہ امام سے درخواست کرے کہ واپس تشریف لے آئیں۔ امام نے اپنے جوتے منگوائے، انھیں پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر واپس تشریف لے گئے۔

مامون نے امام کی عزت گھٹانے اور لوگوں کو یہ باور کرانے کا فیصلہ کیا کہ اگر امام دنیاوی شان و شوکت میں دلچسپی نہیں لیتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انھیں حاصل ہی نہیں ہوتی۔ اگر انھیں بھی حکومت مل جائے تو وہ بخوشی قبول کر لیں گے۔ چنانچہ اُس نے امام رضاؑ سے کہا: "فرزند رسولؐ! میں چاہتا ہوں کہ خلافت سے دستبردار ہو جاؤں اور سلطنت آپ کے سپرد کر دوں۔" اس پر اُن کے درمیان جو مکالمہ ہوا اُس کا خلاصہ ہم کتاب عیون اخبار الرضاؑ سے نقل کر رہے ہیں۔

امام رضاؑ: اِنْ كَانَتْ هٰذِهِ الْخِلَافَةُ لَكَ وَاللّٰهُ جَعَلَهَا لَكَ فَلَا يَجُوْزُ اَنْ تَخْلَعَ لِبَاسًا اَلْبَسَكَ اللّٰهُ وَتَجْعَلَهٗ لِغَيْرِكَ وَاِنْ كَانَتِ الْخِلَافَةُ لَيْسَتْ لَكَ فَلَا يَجُوْزُ لَكَ اَنْ تَجْعَلَ لِيْ مَا لَيْسَ لَكَ اگر خلافت تمہارا حق ہے اور

خدا نے اسے تمہارے لئے قرار دیا ہے تو یہ جائز نہیں کہ خدا نے تمھیں جو لباس پہنایا ہے اسے اتار دو اور دوسروں کے اختیار میں دیدو اور اگر یہ تمہارا حق نہیں ہے تو اس صورت میں یہ جائز نہیں ہے کہ تم اسے کسی کو بخش دو۔

مامون: آپ کو بہر حال خلافت قبول کرنی ہوگی۔

امام رضاؑ: مجھے فخر ہے کہ میں خدا کا ایک بندہ ہوں۔ میں زہد کے ذریعے برائیوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ میں محرمات سے دامن بچا کر اور تواضع اختیار کر کے خدا کے قرب کا امیدوار ہوں۔

مامون: اگر آپ حکومت قبول نہیں کرتے تو میرے ولی عہد بن جائیں۔

امام رضاؑ: خدا جانتا ہے کہ میں اسے قبول کرنے سے خوش نہیں ہوں۔

مامون: کیا آپ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ زاہد ہیں؟

امام رضاؑ: بخدا! میں نے پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور میں نے دنیا کو دنیا کی خاطر نہیں چھوڑا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا مقصد کیا ہے۔

مامون: کیا ہے؟

امام رضاؑ: تم لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ مجھے دنیا سے رغبت اس لئے نہیں کہ دنیا میری پہنچ میں نہیں تھی۔ جونہی مجھے موقع ملا میں نے ولی عہدی قبول کر لی۔ مامون کو طیش آگیا اور اُس نے کہا: اللہ کی قسم! اگر آپ ولی عہدی قبول نہیں کریں گے تو میں آپ کو قتل کر دوں گا۔ امام رضاؑ نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو میں راضی ہوں کیونکہ خدا نے مجھے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ میں اس شرط پر ولی عہدی قبول کرتا ہوں کہ امور حکومت میں دخل نہیں دوں گا کسی کو مقرر یا معزول نہیں کروں گا، قضاوت نہیں کروں گا، فیصلہ سازی میں حصہ نہیں لوں گا اور حکومت کے موجودہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا بلکہ دور رہ کر مشورے دوں گا۔ مامون نے کہا کہ مجھے آپ کی شرطیں منظور ہیں۔

مامون لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ ولی عہدی کے نتیجے میں امام رضاؑ بھی دنیا میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن امام نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس سے آپ کی عزت میں اضافہ ہوا۔ جب مامون اپنی فریب کارانہ چالیں چلتے چلتے تھک گیا اور اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اُس نے آپ کو زہر دیکر شہید کر دیا۔

مامون نے امام رضاؑ کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جیسا اس کے باپ ہارون نے امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ اور منصور نے امام جعفر صادقؑ کے ساتھ کیا تھا۔ اُس نے اسی طرح فریب سے کام لیا جیسے معاویہ بن ابی سفیان نے امام حسنؑ کے معاملے میں لیا تھا۔

جابر حکمرانوں نے اپنی حکومت بچانے کے لئے دوستانِ خدا کا خون بہانے سے دریغ نہیں کیا لیکن یہ قربانی راہِ حق پر گامزن مردانِ حریت کے لئے معمول کی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مردانِ حریت سے محبت کرتے ہیں اور استبدادی حکمرانوں سے نفرت کرتے ہیں اور دینی نکتہ نگاہ سے انھیں تسلیم نہیں کرتے۔

معتصم عباسی

۲۱۰ھ میں مامون کی موت کے بعد معتصم کی بیعت کی گئی۔ معتصم نے ۸ سال سے کچھ اوپر حکومت کی۔ اُس کا جانشین واثق ہوا جس نے پانچ سال حکومت کی۔

ابو الفرج اصفہانی **مقاتل الطالبین** میں لکھتا ہے: معتصم کے دور میں محمد بن قاسم بن عمر بن علی بن ابی طالبؑ نے بغاوت کی۔ اُس نے شکست کھائی اور قید کر دیا گیا لیکن بعد میں قید خانے سے فرار ہوگیا۔ عبد اللہ بن حسین بن عبد اللہ بن اسماعیل بن عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب نے ''کالے کپڑے'' نہیں پہنے (کیونکہ بنی عباس کالے کپڑے پہنتے تھے)۔ معتصم نے اسے نظر بند رکھا حتیٰ کہ اُس کی موت واقع ہوگئی۔

معتصم نے امام محمد تقیؑ کو قید کر دیا لیکن بعد میں رہا کر دیا اور مامون کی بیٹی ام الفضل سے جو امام تقیؑ کی بیوی تھی کہا کہ وہ امام کو زہر دیدے۔ اُس نے معتصم کے کہنے پر امام کو زہر دے دیا۔

سید محسن امین عیون اخبار الرضا میں لکھتے ہیں: ''واثق نے اولادِ علیؑ کی عزت افزائی کی، اُن کے ساتھ حسن سلوک کیا اور انھیں مال بھی دیا۔

متوکل عباسی

واثق کے مرنے کے بعد اُس کا بھائی متوکل خلیفہ ہوا۔ اس نے ۱۴ سال حکومت کی۔ متوکل عیاشی، بدچلنی اور شراب نوشی کی وجہ سے بدنام ہوگیا۔ مسعودی لکھتا ہے: '' متوکل پہلا عباسی خلیفہ تھا جس نے راگ رنگ اور کھیل تماشے کی محفلوں میں شرکت کی۔''

جسٹس سید امیر علی نے اپنی کتاب A Short History of Saracens (مختصر تاریخ عرب) میں لکھا ہے کہ متوکل کے دور میں عرب امپائر کی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ تمام سرکاری محکموں میں برائیاں پھیل گئی تھیں اور احکامات جاری کئے گئے کہ ان برائیوں کی تقلید کی جائے اور انھیں انجام دیا جائے۔ متوکل کے زمانے میں آزاد فکران (فریڈم لورز) کو اُن کے حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس لاپروائی کے نتیجے میں ترک حکومت پر چھا گئے اور وہی ریاست کو کنٹرول کرنے لگے۔

مقاتل الطالبین میں ہے کہ متوکل نے آل ابی طالبؑ پر شدید حملے کئے اور انھیں بے حد ایذائیں پہنچائیں۔ وہ اُن کے خلاف بغض و عناد رکھتا تھا۔ اُس نے اُن پر جھوٹے الزامات لگائے کیونکہ وہ ان پر شک کرتا تھا۔

متوکل نے عمر بن فرج رخجی کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا عامل مقرر کیا۔

اس بدمزاج عامل نے لوگوں کو آل ابی طالبؑ سے ملنے جلنے اور اُن کی مدد کرنے سے روک دیا۔ جو کوئی اُن کی ذرا سی بھی مدد کرتا اسے سزا دی جاتی اور بھاری جرمانہ کیا جاتا۔ آل ابی طالبؑ کی اقتصادی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ ایک قمیص باری باری پہن کر سیدانیاں نماز پڑھتی تھیں۔ جب قمیص پھٹ جاتی تو اُس میں پیوند لگائے جاتے تھے۔

متوکل کی خواہش تھی کہ خاندان ابوطالبؑ کی عورتیں گھروں میں رہیں اور ایک پیوند لگا پیراہن پہن کر باری باری نماز پڑھیں جبکہ دربار سے وابستہ بدچلن عورتیں اپنے طلائی زیورات اور ریشمی ملبوسات کی نمائش کرتی پھریں۔

ایک دفعہ ہارون رشید نے بھی جلودی کو بھیجا تھا تاکہ سید انیوں کے کپڑے لے آئے اور صرف ایک جوڑا چھوڑ دے لیکن متوکل نے اُن پر اتنی سختی کی کہ وہ لباس کے بغیر رہنے پر مجبور ہوگئیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قریشی سرداروں کی اولاد کے طور اطوار بدل گئے اور اشراف عرب کے ساتھ یہ سلوک ہونے لگا۔ متوکل کے زمانے میں اولاد ابوطالبؑ ایک دوسرے سے بچھڑ گئی اور منتشر ہوگئی۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ متوکل کو عربوں کا نیرو[1] کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اس کے دور میں آل ابی طالبؑ کے بہت سے افراد روپوش ہو گئے اور احمد بن عیسیٰ الحسینی اور عبد اللہ بن موسیٰ الحسینی جیسے افراد روپوشی کی حالت میں ہی وفات پاگئے جبکہ محمد بن صالح اور محمد بن جعفر وغیرہ نے بغاوت کردی۔

متوکل صرف زندوں پر ہی ظلم نہیں کرتا تھا بلکہ آسودۂ خاک افراد کی قبروں کی

---

[1] نیرو ۵۴ء میں روم کا شہنشاہ بنا۔ اُس کا نام سفاکی اور عیاشی کے لئے ضرب المثل ہے۔ وہ شاعر اور فنون لطیفہ کا شوقین تھا۔ وہ اسٹیج پر اداکاری اور گلوکاری بھی کرتا تھا۔ ۶۴ء میں اُس نے روم کو آگ لگوا دی اور الزام عیسائیوں پر دھر دیا۔ اُس نے اُن عیسائیوں کو جلا دیا یا عوامی کھیلوں میں شیروں کے سامنے ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ جب روم جل رہا تھا تو وہ بانسری بجا رہا تھا۔ ۶۸ء میں فوجی بغاوت کے بعد سینیٹ نے نیرو کو سزائے موت دی تو اُس نے خودکشی کرلی۔

بھی بے حرمتی کرتا تھا۔ اُس نے امام حسینؑ کی قبر مبارک اور اُس کے اردگرد کے مکانات منہدم کردیے اور لوگوں کو قبر حسینؑ کی زیارت کرنے سے روک دیا۔ اس نے اعلان کروا دیا کہ جو شخص قبر حسینؑ کی زیارت کو جاتے ہوئے پکڑا جائے گا اسے قید کردیا جائے گا۔[1]

ایک شاعر متوکل کے بارے میں کہتا ہے:

خدا کی قسم! اگر بنی امیہ نے اپنے نبی کے نواسے کو بیدردی سے قتل کیا تو بنی عباس نے بھی ویسا ہی کیا۔ انھوں نے اُس کی قبر مسمار کردی۔ انھیں افسوس تھا کہ انھوں نے قتل حسینؑ میں کیوں شرکت نہ کی۔ جب موت کے بعد اُن کی ہڈیاں سرمہ بن گئیں تو وہ اُن کی تلاش میں نکلے۔

ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ (ج ۱، ص ۳۶۳) میں لکھا ہے کہ متوکل کے علی بن جہم سے اچھے مراسم تھے کیونکہ وہ بھی امام علیؑ کے خلاف کینہ رکھتا تھا۔ اُسے مردہ لوگوں کی برائیاں کرنے کی بیماری تھی۔ ابو العیناء نے اسے امام علیؑ کی بدگوئی کرتے سنا تو کہا: کیا تم علیؑ کو اس لئے برا کہتے ہو کہ انھوں نے فاعل مفعول دونوں کو قتل کردیا تھا اور تم بھی مفعول ہو۔

ابن سکیت کی ثابت قدمی

ابن سکیت اپنے زمانے کے ممتاز عالم اور ادیب شمار ہوتے تھے۔ متوکل نے اُن کو اپنے بیٹے معتز کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک دن متوکل نے ابن سکیت سے کہا:

۱۔ صدام نے بھی حضرت امام حسینؑ کی زیارت پر پابندیاں لگائی تھیں۔ صدام تو مٹ گیا لیکن دنیا نے ۲۸ رفروری ۲۰۰۸ء کو امام حسینؑ کے چہلم کے موقع پر دیکھا کہ ستر لاکھ سے زائد زائرین کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر یہی کہہ رہا تھا: "یا زہراؑ! ہم آپ کے حسینؑ بھولے نہیں ہیں۔" جو حکومت دلوں پر کی جاتی ہے اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ اِنَّ لِلْحُسَيْنِ مَحَبَّةً مَكْنُونَةً فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ بے شک امام حسین علیہ السلام کی محبت مومنین کے دلوں میں پنہاں ہے۔

تم معتز اور معید کو بہتر سمجھتے ہو یا حسنؑ حسینؑ کو۔

ابن سکیت نے اسے بڑی حقارت سے دیکھا اور بولے:

وَاللّٰهِ! اِنَّ قَنْبَرًا خَادِمُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِي طَالِبٍ خَيْرٌ مِّنْكَ وَمِنْ اِبْنَيْكَ

واللہ! علی بن ابی طالبؑ کے خادم قنبر تجھ سے اور تیرے بیٹوں سے بہتر تھے۔

متوکل نے ترک غلاموں کو حکم دیا کہ ابن سکیت کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ جب اُن کی زبان اس انداز سے کھینچی گئی تو وہ دم توڑ گئے اور اُس انجام کو پہنچے جس کا انھیں ڈر تھا کیونکہ اپنے اشعار میں وہ کہتے ہیں:

يُصَابُ الْفَتٰى مِنْ عَثْرَةٍ بِلِسَانِهٖ وَلَيْسَ يُصَابُ الْمَرْءُ مِنْ عَثْرَةِ الرِّجْلِ
فَعَثْرَتُهٗ فِي الْقَوْلِ تُذْهِبُ رَأْسَهٗ وَعَثْرَتُهٗ فِي الرِّجْلِ تَبْرَأُ عَلٰى مَهْلٍ

ایک مرد لغزش زبان کی وجہ سے مارا جاتا ہے لیکن زمین پر گر کر وہ مر نہیں جاتا زبان کی لغزش سے سر چلا جاتا ہے اگر یہی لغزش پاؤں میں ہو تو پاؤں چند دن بعد اچھا ہو جاتا ہے۔

متوکل نے دربار میں ایک مسخرہ پال رکھا تھا جس کا نام عبادہ تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ایک تکیہ باندھ کر متوکل کے سامنے ناچتا تھا اور گویے گاتے تھے: اَقْبَلَ الْبَطِيْنُ خَلِيْفَةُ الْمُسْلِمِيْنَ آگیا، بڑے پیٹ والا خلیفہ مسلمین آگیا۔ اس طرح وہ امام علیؑ کا مذاق اڑاتے تھے۔ متوکل اس منظر سے محظوظ ہوتا، شراب پیتا اور قہقہہ لگاتا تھا ایک دن یہی تماشا متوکل کے بیٹے منتصر کے سامنے ہوا تو اُس نے اپنے باپ سے کہا: وہ شخص جس کا یہ جوکر مذاق اڑا رہا ہے اور لوگوں کو ہنسا رہا ہے تمہارا عم زاد اور تمہارے خاندان کا ایک ممتاز فرد تھا۔ تمھیں تو اُس پر ناز کرنا چاہیے۔ اگر تم اس کا مذاق اڑانا ہی چاہتے ہو تو خلوت میں اڑاؤ۔ یہ کام ان کتوں پر مت چھوڑو۔

یہ سن کر متوکل نے گویوں سے کہا یہ شعر گاؤ۔ (نقل کفر، کفر نباشد)

غَارَ الْفَتٰى لِابْنِ عَمِّهٖ رَأْسُ الْفَتٰى فِي حِرِ اُمِّهٖ

(ہماری مجال نہیں کہ ہم اس دریدہ دہن کے اس گستاخانہ شعر کا ترجمہ کریں)

منتصر کو پتا چلا کہ متوکل حرمت سیدہؑ کی ہتک بھی کرتا ہے تو اُس نے اس بارے میں ایک عالم سے فتویٰ مانگا۔ عالم نے کہا: اُس کا قتل واجب ہے لیکن جو شخص اپنے باپ کو قتل کرے اُس کی زندگی کم ہو جاتی ہے۔

منتصر نے کہا: اگر میں اسے خدا کے لئے قتل کر دوں تو مجھے اپنی زندگی کے کم ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ پس اُس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اس کے بعد سات مہینے زندہ رہا۔

اللہ نے قرآن مجید میں اہل بیتؑ کی محبت واجب قرار دی ہے اور اسے اجر رسالت سے تعبیر فرمایا ہے لیکن حکمرانوں نے جو "دین کے نام پر" حکومت کرتے تھے اور اپنے آپ کو رسول اللہؐ کا قریبی رشتے دار کہتے تھے آل رسولؐ کا خون بہایا اور جی کھول کے ستایا۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی رسالت کے منکر ہیں وہ اسلام کو اتنے مہنگے نہیں پڑے جتنے متوکل جیسے تارک آئین رسولؐ مہنگے پڑے۔ وہ آئین اسلام کے خلاف کافروں کی طرح لڑتے تھے۔ بنی عباس کے بارے میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ اُن کی گفتار، رفتار اور کردار کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے کافی شہادت ہیں۔

ابن رومیؔ

شیعوں کا ایک اصول یہ ہے کہ دنیا کبھی نیکو کاروں اور الٰہی رہبروں سے خالی نہیں رہ سکتی جو لوگوں کو نیکیوں کی ترغیب دیں اور برائیوں سے روکیں۔ شیعہ نظریات ہمیشہ محراب و منبر سے اور کتاب و قلم کے ذریعے بیان ہوتے آئے ہیں اور شیعہ ظالم و جابر حکومتوں کے جرائم کو دلیلوں اور ثبوتوں کے ساتھ بے نقاب کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ راہ حق میں مشکلات کے باوجود صبر و استقامت کا دامن نہیں چھوڑتے اور باطل قوتوں کا بڑی دلاوری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ شیعہ یہ

بھی مانتے ہیں کہ ہر زمانے میں حق کے کچھ پیرو ہونے چاہئیں جو فقیہ اور شاعر وغیرہ کی حیثیت میں باطل قوتوں سے ٹکرلیں۔

بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانے میں کچھ ایسے مخلص مومنین تھے جو باطل کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوئے۔ انھوں نے حق کا دفاع کیا، اُس کی حمایت کی اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا۔ اس صف میں کئی علماء، فقہاء اور شعراء شامل تھے۔ تاریخ میں ایسے کچھ شعراء کے نام ملتے ہیں لیکن اکثر شعراء گمنام ہیں کیونکہ انھوں نے حکمرانوں کے ڈر سے یا پھر وظائف کی بندش کے خوف سے اپنے تشیع کا اظہار نہیں کیا۔ تاریخ نے جن ناموں پر سے پردہ اٹھا دیا ہے اُن میں سے ایک ابن رومیؔ ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدے میں جس کا نام قصیدۂ جیمیہ ہے یحیٰی بن عمر بن حسین بن زید کے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اے بنی عباس! تم اپنی فطری پستی کے سبب جرم پر جرم کرتے رہو اور اپنی کنجوسی کے سبب بیت المال میں دولت ذخیرہ کرتے رہو۔ اُس دن کا انتظار کرو جب حق حقدار کو مل جائے اور تم بھی اولاد ابوطالبؑ کی طرح مصیبت کے دن دیکھو۔ ممکن ہے پردۂ غیب کے پیچھے موجود انقلابی رہبر آجائے اور اندھیری رات چھٹنے پر ایک روشن دن طلوع ہو۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ اولاد ابوطالبؑ نان شبینہ کو محتاج ہیں اور تمہارے ساتھیوں کی توندیں باہر نکل آئی ہیں تم پر اتنی چربی چڑھ گئی ہے کہ جب تم خراماں خراماں چلتے ہو تو تمہارے کولہے مٹکتے ہیں۔ کڑاکے کے فاقوں سے اولاد علیؑ کی ہڈیاں نکل آئی ہیں مگر تمہارے بچوں کی ہڈیاں دیہات کی آب و ہوا میں مضبوط ہو رہی ہیں اور اُن کے بازو اور ٹانگیں موٹی ہو رہی ہیں۔"

پروفیسر محمود عقاد اپنی کتاب "ابن رومیؔ" میں رقمطراز ہے کہ شاعر نے یہ اشعار کسی لالچ کے بغیر کہے ہیں۔ یہ اشعار کہہ کر درحقیقت اس نے اپنی زندگی کو خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔

ابوفراس حمدانی

ابو فراس نے ایک مرثیہ لکھا جس میں اس نے اولادِ علیؑ کے فضائل اور بنی عباس کے جرائم بیان کیے۔ اُس نے اپنے اشعار میں کہا ہے کہ

"حق شکستہ اور دین پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ آلِ رسول کو رسول اللہؐ سے ملنے والی میراث (خلافت) کی بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ اے لوگو! کیا اللہ ظالموں کے شر کے مقابلے میں لوگوں کی مدد نہیں کرتا؟ کیا دین کے پاس کوئی انتقام لینے والا نہیں ہے؟ اولادِ علیؑ اپنے ہی وطن میں رعیت بنی ہوئی ہے اور امورِ سلطنت عورتوں اور چھوکروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ تمہارے تازیانوں سے رسول اللہؐ کا دل دکھتا ہے۔ پھر تم حرمِ رسولؐ کا احترام کیوں نہیں کرتے؟ ابوسفیان کی اولاد نے بڑے بڑے جرم کیے لیکن تمہارے مقابلے میں اُن کے جرائم ہیچ ہیں۔ تم نے دین کے ساتھ کھلی غداری کی اور بے دریغ آلِ رسولؐ کا خون بہایا۔ اگر سچ پوچھو تو ہارون امام کاظمؑ کی مانند نہیں اور مامون امام علی رضاؑ کی مانند نہیں۔ بنی عباس کو ایک خط میں لکھو کہ وہ حکومت کے بارے میں گفتگو نہ کریں کیونکہ حکومت تو عجم (برامکہ) کے ہاتھوں میں ہے۔ افتخار علماء کو زیبا ہے جو علم کے موتی بکھیرنے والے اور مشکل گتھیوں کو سلجھانے والے ہیں۔ تم بیجا افتخار نہ کرو۔ وہ خدا کے سوا کسی کی خاطر غضبناک نہیں ہوتے۔ وہ فیصلہ دیتے وقت خدا کے حق کو جوتے کی نوک پر نہیں رکھتے۔ اولادِ علیؑ کے گھروں سے مسلسل قرآن کی تلاوت سنائی دیتی ہے لیکن تمہارے گھروں میں گیت سنگیت گونجتا ہے۔ ان گھروں میں کوئی شراب کشید نہیں کی جاتی اور وہ گناہ کا مسکن نہیں ہیں۔ ان کے گھروں میں لونڈے نہیں ہیں جن کے ساتھ وہ عیاشی کریں اور اُن کے پاس کوئی بندر نہیں ہے جس کے لئے خدمتگار رکھیں۔ رکن، خانہ کعبہ، استار، زمزم، صفا، مسجد خیف اور حرم اُن کے ٹھہرنے کی جگہیں ہیں۔ اُن پر اس وقت تک اللہ کی رحمتیں نازل ہوں جب تک درختوں کے

پتے آپس میں ٹکراتے رہیں کیونکہ وہ قوم کی پناہ گاہ ہیں۔"

ابو فراس کے یہ اشعار اہل بیتؑ کی عظمت کو ظاہر کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ خلافت کے حقدار ہیں اور ان کا حق غصب کیا گیا تھا۔

ان اشعار میں بنی عباس کے "دین کے نام پر حکومت" کرنے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ وہ دین کے بدترین دشمن تھے۔ اُن کے اونچے اونچے محلات میں مے نوشی، عیاشی، زنا اور غنا عام تھے۔ اگرچہ اولادِ علیؑ کو ایذاؤں اور ابتلاؤں کا سامنا تھا لیکن اُن کے گھروں میں قرآن پڑھا جاتا تھا، اللہ کا ذکر ہوتا تھا اور اُس کی عبادت کی جاتی تھی۔

جو حکومتیں دین کے نام پر اپنی شناخت چاہتی ہیں جب تک وہ منصور، ہارون مامون اور متوکل کے نقش قدم پر چلیں گی وہ ضلالت کی حکومتیں کہلائیں گی۔ اسی لئے شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ایک عادل "دینی حکومت" اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب اُس کا سربراہ "امام معصوم" ہو یا حکومت ایک "عادل عالم دین" کے ہاتھ میں ہو جو خدا و رسولؐ کی خوشنودی کا طلبگار ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو حکومت دینی اور الٰہی نہیں بلکہ موجودہ حکومتوں کی طرح سے ایک دنیاوی حکومت ہے۔

تمام ایذائیں جو اہل بیتؑ اور شیعوں کو دی گئیں اُن حکمرانوں نے دیں جو "دین کے نام" پر حکومت کرتے تھے لیکن دین سے کوسوں دور تھے۔ وہ اپنی نالائقیوں کا بدلہ صاحب علم و فضل اور باکمال لوگوں سے لینا چاہتے تھے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ اُن کا کردار دین کے عین مطابق ہے اور اس کی توثیق کے لئے وہ نام نہاد علماء کی تلاش میں رہتے تھے۔

النزاع والتخاصم (ص ۷۳) میں ہے: بنی عباس کے سر میں غرور سمایا ہوا تھا اور وہ خود پسند ہو گئے تھے۔ انھوں نے "افکارِ نجم" کو ادب گردانا اور اُسے احکامِ رسولؐ پر ترجیح دی۔ انھوں نے اپنی سنگدلی اور ظلم کے نئے باب رقم کیے۔

بنی عباس کی ''دینی حکومت'' میں بادشاہ دین کے احکام کو پاؤں تلے روندتے تھے اور مشرکوں کی پیروی کرتے تھے۔

دعبل خزاعی

تاریخ جن شعراء سے واقف ہے اُن میں دعبل خزاعی سب سے زیادہ دلیر اور دبنگ تھے۔ انھوں نے باطل کی مخالفت اور حق کے دفاع کی خاطر بہت زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔ انھوں نے جن لوگوں کی مذمت کی اُن میں ہارون، مامون، معتصم، واثق، سپہ سالاروں، وزیروں اور خلفاء کے بیٹوں کے نام شامل ہیں۔ انھوں نے کسی ڈرخوف کے بغیر اُن پر تنقید کی۔ جب معتصم نے فوج کی کمان ترکوں کو سونپ دی اور لوگوں کا مال اور اُن کی جان اور ناموس اُن کے رحم وکرم پر چھوڑ دی تو دعبل نے کہا:

''سلطنت لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر چھوکروں اور نوکروں کے ہاتھوں میں آگئی ہے اور یہ بڑی مصیبت کی بات ہے۔''

جب معتصم مرا اور واثق اُس کا جانشین بنا تو دعبل نے کہا:

ایک خلیفہ مرگیا ہے جس کا کسی نے افسوس نہیں کیا اور دوسرا اُس کی جگہ آیا ہے جس سے کوئی خوش نہیں کیونکہ جو آیا ہے وہ ظلم اور گمراہی کا سردار ہے اور اپنے پیشرو کی طرح نفاق اور فساد کا سرغنہ ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا جہنم میں داخل ہونے پر ہر امت دوسری امت پر لعنت کرے گی حتیٰ کہ سب اس میں جمع ہو جائیں گے۔

دعبل نے اپنے اشعار میں بنی عباس کے آمرانہ ہتھکنڈوں یعنی لوگوں کو قتل کرنے، قید کرنے، لوٹنے اور جلاوطن کرنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''جب میں بنی عباس کے جرائم کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں اور میرا دل غصے سے پھٹ پڑتا ہے۔ وہ قوم کی توہین کرتے، دھمکیاں دیتے، قتل کرتے، لوٹ مار کرتے، گھروں کو آگ لگاتے، لوگوں کو حبس بیجا میں رکھتے، قید کرتے، ایذائیں دیتے اور جلاوطن کرتے ہیں۔ اگر تمہارا طوس جانا ہو تو قبر امام کی پاک مٹی کو چوم لینا اور اللہ کے ولی سے جو دل چاہے مانگ لینا۔ طوس میں دو قبریں ایک جگہ ہیں۔ ایک اُس کی جو بہترین خلائق ہیں اور دوسری اُس کی جو بدترین خلائق ہے اور یہ بات عبرت آموز ہے۔ کیا وہ نجس اُس پاک سے کوئی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ کیا اُس پاک کا دامن اُس نجس کی نجاست سے متاثر ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ نہ ہارون کے قرب سے امام رضاؑ کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ہارون کو اُن کے قرب سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔''

دعبل بنی امیہ کو ان کے جرائم کے لئے معذور سمجھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''جونہی بنی امیہ نے عنان حکومت سنبھالی انھوں نے کھل کر اپنی دشمنی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ وہ علیؑ اور اولاد علیؑ کے خلاف ہیں لیکن بنی امیہ کے خلاف لڑتے ہوئے بنی عباس نے اپنے عم زادوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنالیا تھا اور ان کا نعرہ تھا کہ وہ آل رسولؐ کے حق کی بازیابی کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن جونہی حکومت اُن کے ہاتھ آئی وہ آمر بن گئے۔''

دعبل کہتے ہے: ''اگر یہ طے ہوتا کہ زمانہ ہنسے تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے کہ وہ اسے ہنسنے کی طاقت نہ دے کیونکہ آل محمدؐ کو ظلم وجور کا نشانہ بنایا گیا ہے آل رسولؐ کو شہر بدر کر دیا گیا ہے جیسے کہ انھوں نے کوئی ناقابل معافی گناہ کیا ہو۔''

دعبل کا قصیدۂ تائیہ (ایک معاصر ادیب نے اسے ذائعہ یعنی مشہور یا نائحہ یعنی المیہ بھی کہا ہے) بنی عباس کے جرائم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ قصیدہ تائیہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس مرثیے میں بنی امیہ کی خونریزی کے ابواب رقم ہیں۔

ہمیں شاعروں، انقلابیوں یا مرثیہ نگاروں میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس نے جابر حکمرانوں کے خلاف دشمنی اور نفرت کا اظہار اس انداز میں کیا ہو جس انداز میں دعبل نے کیا ہے۔ چھوٹے بڑوں نے دعبل کے اشعار یاد کرلئے اور عوام و خواص نے انھیں محفوظ کرلیا۔ ان شعروں کی اتنی دھوم تھی کہ راہزنوں کو بھی وہ ازبر تھے۔ جب دعبل نے **قصیدۂ تائیہ** امام علی رضاؑ کے حضور پڑھا تو امام نے خوش ہوکر اسے درہم و دینار سے بھری ایک تھیلی انعام دی۔ دعبل نے کہا: مولا! میں تو بس آپ کا ایک کرتا چاہتا ہوں جو میرے کفن کے کام آئے۔ امام نے اسے ریشم اور اون کا بنا ہوا ایک کرتا عنایت فرمایا۔ مرو سے بغداد جاتے ہوئے راہزنوں نے آپ کے قافلے کو لوٹا تو خز کا وہ کرتا بھی لوٹ لیا۔ جب وہ لوٹ کا مال آپس میں بانٹنے لگے تو ایک ڈاکو نے یہ شعر پڑھا:

اری فیئھم فی غیرھم متقسما   وایدیھم من فیئھم صفرات

"اُن کی میراث غیروں میں بانٹ دی گئی اور اُن کے ہاتھ اپنی میراث سے خالی ہیں۔"

دعبل نے ڈاکو سے پوچھا: یہ شعر کس کا ہے؟ اُس نے کہا: یہ شاعر اہل بیتؑ دعبل کا شعر ہے۔ دعبل نے کہا: میں دعبل ہوں۔ ڈاکو خوفزدہ ہوگیا اور کہنے لگا: کیا تم دعبل ہو؟ دعبل نے کہا: ہاں! میں ہی دعبل ہوں۔ اس پر ڈاکوؤں نے لوٹا ہوا سارا سامان واپس کردیا۔

جب قم کے لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے دعبل کو اُس کی خریداری کی پیشکش کی لیکن دعبل نے اسے بیچنے سے انکار کردیا لیکن لوگوں نے مجبور کرکے کرتا اُن سے لے لیا اور اسے ایک ہزار دینار دے دیئے۔ جب اسے کرتے کی واپسی کی کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے لوگوں سے درخواست کی کہ اُس کا ایک ٹکڑا اسے دیدیں چنانچہ لوگ اس بات پر راضی ہوگئے۔

امام رضاؑ رو پڑے

جب امام رضاؑ نے دعبل کے اشعار سنے تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں عورتیں اور بچے بھی رو پڑے۔ اب تک شیعہ یہ اشعار منبروں سے پڑھتے ہیں اور روتے ہیں۔ اس مرثیہ میں دعبل نے اُن انسانی حقوق کی بات کی ہے جن کا دفاع کرنا چاہیے۔ ان اشعار میں اُن مقاصد کا بھی ذکر ہے جن کے حصول کے لئے جان کی بازی تک لگا دینی چاہیے۔ ان اشعار کو ۱۱۰۰ سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن پھر بھی موجودہ شعراء کے مقابلے میں جن کی شاعری سے کتب خانے بھرے پڑے ہیں یہ اشعار کہیں زیادہ شہرت اور قیمت رکھتے ہیں۔ اُن کی شہرت کا راز یہ ہے کہ دعبل نے ان اشعار میں مصیبت زدہ اور ستم دیدہ لوگوں کی ترجمانی کی ہے ان اشعار میں اُن مظلوموں کی بات کی گئی ہے جو ہر زمانے میں دکھ سہتے ہیں۔

جس دن یہ اشعار شائع ہوئے تھے اسی دن سے بنی عباس کا زوال شروع ہوگیا تھا۔

بحار الانوار کے مطابق دعبل کے ۸۰ اشعار امام رضاؑ کی شان میں ہیں اور کچھ اشعار بنی امیہ اور بنی عباس کے متعلق ہیں۔ اُن میں سے چند اشعار میں کہا گیا ہے:

"بنی عباس پر تہہ دل سے لعنت بھیجو کیونکہ اُن کی وجہ سے دین کے معاملات اتھل پتھل ہوگئے۔ ایک سچے امام کے بغیر حکومت حرام ہے۔ شوریٰ کے بغیر فیصلے کرنا جائز نہیں۔ اُن پست فطرت جابروں کی وجہ سے اسلام پر مصیبتیں نازل ہوئیں انھوں نے دین اور قانون کی دھجیاں اڑا دیں اور مومنوں پر ظلم ڈھائے۔ انھوں نے ہماری نظروں میں دنیا کو تنگ کردیا اور افق کو تاریک اور بے رونق کردیا۔ انھوں نے میٹھے پانی کو نادار قوم کے حلق میں حنظل کی طرح تلخ کردیا۔ اس طرز عمل اور اس دھوکے کا سرچشمہ ابوبکرؓ کی بیعت تھی۔ اُس نے ظلم کی بنیاد مضبوط کی اور اس وقت دین کا ڈھانچہ زمین بوس ہوگیا۔ اگر وہ دھوکا اور فریب نہ کیا گیا ہوتا تو دنیا کو عزت کے سوا کچھ نہ ملتا۔ نظم و نسق خاندان رسولؐ کے ہاتھوں میں ہوتا تو ہر جگہ

عدل و احسان ہوتا۔ میں آلِ محمدؐ سے محبت کرتا ہوں۔ اُن کے لئے میری محبت کی کوئی حد نہیں۔ اگرچہ دشمن مجھے تیروں کا ہدف بنا دے میں اس خاندان سے اپنا دلی تعلق نہیں توڑوں گا، وہ میری زندگی، مرکزِ امید اور کعبۂ آرزو ہیں۔ میں اپنا سر اُن کی گلی کی خاک پر رکھ دوں گا اور اپنا سر اُن کی چوکھٹ سے کبھی نہیں اٹھاؤں گا کیونکہ وہ احسان اور تقویٰ کا گھر اور عشق، امید اور آرزو کا مقام ہے۔ وہاں سے ایمان اور اخلاق کا سورج اپنی کرنیں پھیلاتا ہے۔ وہاں سے عدل و احسان کی ایسی معطر ہوا چلتی ہے جو گلشن روح کو شاداب کر دیتی ہے۔ اے پروردگار! میری آتش شوق کو مزید بڑھا دے اور میرے دل کو اُن کے عشق سے لبریز کر دے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عزت و شوکت کی بجائے انھیں ذلیل لوگوں سے دھوکے کے سوا کچھ نہ ملا۔ انھوں نے ظالمانہ طور پر اُن کا حق چھین لیا اور چوروں کی طرح اُن کا مال لوٹ لیا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ تہی خالی ہاتھ ہوں۔ آلِ حق کے حقوق ختم کر دیئے گئے اور اُن پر بے حساب ظلم کیا گیا۔ جب تک سورج ابھرتا اور چاند چمکتا ہے میرا کام اس غم کی وجہ سے رونا اور آہیں بھرنا ہے۔"

بنی عباس کی حکومت کی مخالفت کرنے میں دعبلؔ کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں تھے۔ انھوں نے یہ اشعار مال و دولت یا منصب کے لئے نہیں بلکہ اپنے مذہب اور عقیدے کی خاطر کہے تھے۔ انھوں نے آلِ رسولؐ کے حق کے لئے صلیب اٹھا لی تھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ میں پچاس سال سے اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں یعنی دعبلؔ مسلسل پچاس سال تک ایسے شعر کہتے رہے جو کسی وقت بھی انھیں تختہ دار تک پہنچا سکتے تھے۔

آخر ایک بدبخت نے گھات لگا کر نماز مغربین کے بعد دعبلؔ پر زہر آلود چھری سے حملہ کیا جس سے دعبلؔ جاں بحق ہو گئے۔ دعبلؔ اور کمیتؔ جنھوں نے آلِ محمدؐ کی حمایت میں ایک جیسی تحریک چلائی ایک جیسی موت سے ہمکنار ہوئے۔

دونوں کی قسمت میں کاتبِ تقدیر نے ایک ہی طرح سے شہادت لکھی تھی۔

سعدیؔ گر عاشقی کنی و جوانی
عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

شیعہ ادب

مناسب ہوگا کہ ہم یہ باب سعید گیلانی کی کتاب **آثار التشیع فی الادب العربی** (ص ۲۲، طبع قاہرہ، مرتبہ **لجنۃ النشر للجامعین**) کے اس اقتباس پر ختم کریں:

"شیعہ ادب اپنی بہار پر اُس وقت پہنچا جب علویوں کو مصائب سے واسطہ پڑا۔ علیؑ کی شہادت کے بعد اولادِ علیؑ کو ذلیل کیا گیا اور ٹکڑیوں میں گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ اُن پر مظالم کیے گئے، وہ حقوق سے محروم کیے گئے اور قتل کیے گئے۔ وہ خوف کے عالم میں زندگی گزارتے رہے کیونکہ اُن کی اور اُن کے حامیوں کی زندگیاں محفوظ نہ تھیں۔ علیؑ کے حامی ہر شہر میں قتل کیے گئے۔ انھیں کڑی سزائیں دی گئیں اور اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ جو بھی علیؑ کا نام لیتا اسے قید کر دیا جاتا، اُس کا مال لوٹ لیا جاتا اور گھر مسمار کر دیا جاتا..."

"محبانِ اہلِ بیتؑ کو زندہ دفن کرنا، دار پر لٹکانا، اُن کی لاشیں جلا دینا، تاریک زندانوں میں قید کرنا عام تھا یہاں تک کہ وہ بھوکے پیاسے دم توڑ دیتے تھے۔"

"پیروانِ علیؑ کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا اور اُس وقت تک نہیں اتارا جاتا تھا جب تک اُن کی لاشیں سڑ نہیں جاتی تھیں۔ پھر انھیں جلا دیا جاتا تھا اور اُن کی راکھ ہوا میں بکھیر دی جاتی تھی اور لوگوں کو اپنے بچوں کے نام علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ رکھنے کی ممانعت تھی۔"

"بنی عباس کے دلوں میں اولادِ علیؑ کے لئے بنی امیہ سے زیادہ بغض تھا اس

لئے اُن کے ہاتھوں قتل ہونے اور جلائے جانے کے واقعات بھی زیادہ تھے۔ انھوں نے اولادِ علیؑ پر بنی امیہ سے زیادہ سختی کی۔"

"منصور نے حکم دیا کہ امام علیؑ کے فرزندوں کو زنجیریں پہنا کر مدینہ سے اُس کے سامنے لایا جائے۔ جب وہ اُس کے پاس پہنچے تو اُس نے حکم دیا کہ انھیں ایک تاریک تہہ خانے میں قید کر دیا جائے۔ اگر اُن میں سے کوئی مر جاتا تو اُس کی لاش وہاں سے ہٹائی نہیں جاتی تھی۔ بالآخر منصور نے حکم دیا کہ قید خانے کی عمارت اُن کے سروں پر گرا دی جائے۔ اس بارے میں ایک شیعہ شاعر کہتا ہے: بخدا! بنی عباس نے اولادِ علیؑ پر جتنے مظالم کئے ہیں بنی امیہ کے مظالم ان کا عشرِ عشیر بھی نہ تھے۔"

ابو فراس کہتا ہے: "اگرچہ حرب کی اولاد نے سنگین جرائم کئے تھے لیکن اُن کے جرائم بنی عباس کے مقابلے میں کم تھے۔"

شریف رضی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "اگرچہ گروہ اوّل (بنی امیہ) نے بہت زیادہ جرائم کئے تھے لیکن وہ گروہ دوّم (بنی عباس) سے زیادہ نہیں تھے۔"

"ہارون رشید نے اولادِ علیؑ پر ظلم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی لیکن جب بنی عباس کی خلافت کمزور ہونے لگی اور حکومت کا انتظام و انصرام ترکوں، دیلمیوں اور بنی حمدان کے ہاتھوں میں آ گیا تو اُن کی غضبناکی میں کمی آ گئی۔"

ان تمام جرائم نے نظم اور نثر میں شیعی ادب پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔

شیعیت کیونکر زندہ ہے؟

۱۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس قدر مظالم کے باوجود شیعہ زندہ کیسے رہے جبکہ یہ کارروائیاں قرن اول ہی میں شروع ہو گئی تھیں اور اب تک جاری ہیں۔ خون کا دریا عبور کر کے بھی شیعہ زندہ رہے اور آج پوری دنیا میں کروڑوں شیعہ موجود ہیں حالانکہ عام طور پر جو سختیاں

انھیں جھیلنی پڑی ہیں اُن کے پیشِ نظر اُن کا نام و نشان مٹ جانا چاہیے تھا!!؟

۲۔ ان سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے شیعوں کے پاس ایمان کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔ اپنی سینکڑوں سالہ جدوجہد میں انھوں نے کوئی حکومت قائم نہیں کی اور کسی نے اُن کا دفاع نہیں کیا۔

۳۔ شیعوں نے جب کبھی بغاوت کی انھیں شکست ہوئی اور بھاگنا پڑا۔

المختصر جب شیعوں کی تاریخ اس قدر خونچکاں اور ناکام انقلابات سے بھری پڑی ہے پھر شیعیت کا جادو سر چڑھ کر کیوں بول رہا ہے؟

تمام مصائب و شدائد کے باوجود شیعہ نہ صرف زندہ رہے بلکہ اُن کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے کیونکہ شیعوں کی بقا کا راز عشقِ اہلِ بیتؑ اور تعلیماتِ اہلِ بیتؑ کی عظمت میں پنہاں ہے۔ اگر اُن کی تعلیمات اس قدر عظیم نہ ہوتیں تو شیعیت ساختہ پرداختہ مذاہب کی طرح صرف کتابوں میں نظر آتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیماتِ اہلِ بیتؑ حقائقِ اسلام کی تفسیر، قرآن کے احکام اور رسولِ اسلامؐ کے مقاصد پر مشتمل ہیں۔ دراصل وہ خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے قواعد اور اصولوں کا مجموعہ ہیں۔

اہلِ بیتؑ کے نزدیک "حق" وہ سچائی ہے جو لوگوں کے "دل و دماغ" میں "آزاد" ہے۔ عقائد، آراء اور پسند ناپسند کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اقوال کی کثرت یا قلت، نئے نئے لفظ اور نئی نئی اصطلاحات حقیقت کو گہنا نہیں سکتے۔ اگر سب لوگ یا لوگوں کی اکثریت اس بات پر ایکا کر لیں کہ فلاں موضوع باطل ہے جبکہ وہ حق ہو یا فلاں موضوع حق ہے جبکہ وہ باطل ہو تب بھی "حقیقت" تبدیل نہیں ہوگی۔

المختصر اہلِ بیتؑ کی نگاہوں میں حق "کثرتِ افراد" یا "کثرتِ اقوال" پر انحصار نہیں کرتا بلکہ افراد حق کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے

امام نے کہا ہے اور قرآن نے بھی صراحت فرمائی ہے:

لَقَدْ جِئْنَاكُمْ بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرتے ہیں (سورۂ زخرف:۷۸)

بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ بلکہ وہ (محمدؐ) تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں لیکن تمہاری اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے۔ (سورۂ مومنون:۷۰)

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ یعنی علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب لوگ ایک طرف ہوں اور علیؑ دوسری طرف تو سب علیؑ کے مقابلے میں غلطی پر ہوں گے کیونکہ علیؑ کی بات رسول اللہؐ کی بات ہے اور رسول اللہؐ کا قول ہوا و ہوس سے پاک ہے۔ اس بنا پر قول رسولؐ سب کے لئے دلیل ہے اور کوئی اس کے برخلاف استدلال نہیں کر سکتا۔

نیز تجربے نے ثابت کیا ہے کہ ''حق'' بجائے خود ایک مستقل چیز ہے۔ یہ لوگوں کے خیالوں اور باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ''مجلس قانون ساز'' کثرت رائے یا اتفاق رائے سے ایک قانون منظور کرتی ہے لیکن جب اس قانون کو نافذ کرنے کے بعد اس میں خامی کا پتا چلتا ہے تو اس قانون میں ترمیم یا تنسیخ کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ ''حق'' کو قرآن اور سنت سے لینا چاہیے۔ لوگوں کی رائے یا کثرت رائے کے زیر اثر حق سے مستغنی نہیں ہوا جا سکتا کیونکہ رائے ذاتی اغراض سے آلودہ ہوتی ہے۔ رائے سے حق کو نہیں پہچانا جا سکتا کیونکہ رائے مطابق

۱۔ ترمذی، حاکم، ابن حجر، ابن ابی الحدید اور کنز العمال (بحوالہ دلائل الصدق، ج ۲، ص ۳۰۳ ایڈیشن ۱۹۵۳ء) نیز تاریخ بغداد، خطیب بغدادی ج ۱۳، ص ۳۲۱ مطبوعہ السعادۃ، مصر۔ تاریخ دمشق، ابن عساکر ج ۳، ص ۱۱۹ مطبوعہ بیروت۔ الامامہ والسیاسۃ، ابن قتیبہ دینوری ج ۱، ص ۷۳ مطبوعہ مصطفیٰ محمد، مصر۔ ارجح المطالب، عبید اللہ حنفی ص ۵۹۸ مطبوعہ لاہور۔

واقعہ ہو تو حق کی تطبیق کرتی ہے اور خلاف واقعہ ہو تو خطا کرتی ہے۔ رائے کے اظہار میں خواہشات، اغراض اور تربیت جیسے ''عناصر'' کارفرما ہوتے ہیں۔ بعض لوگ فلاسفہ اور متکلمین کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنی رائے بناتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے زعم میں جو رائے ظاہر کرتے ہیں وہ نادان ہوتے ہیں اور ان کی بات علمی طور پر مستند نہیں ہوتی۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ''جماعت'' کا مطلب اہل حق کا جمع ہونا ہے اگرچہ وہ کم ہی ہوں۔ اس سے باطل گروہ کا جمع ہونا مراد نہیں ہے اگرچہ وہ اکثریت ہی میں ہو۔ اس لئے شیعہ حق کی شناخت کے لئے وحی پر اعتماد کرتے ہیں، اکثریت کے قول پر نہیں جیسا کہ ہم سورۂ مبارکہ زخرف کی آیت ۷۸ میں بتا چکے ہیں۔

ثانیاً حکومت کا اکثریت کو نوازنا اور اقلیت کو نظر انداز کرنا اقلیت کے حقوق غصب کرنا ہے۔ اقلیت چونکہ حکومتی طاقت سے محروم ہوتی ہے اس لئے اُس کے نظریات نافذ نہیں ہوتے اور سرکاری طور پر صحیح تسلیم نہیں کئے جاتے۔ اس بنا پر شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہر موضوع پر قانون بنایا ہے اور اس قانون کو سمجھنے کے لئے دو عظیم ماٴخذ ہماری دسترس میں ہیں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے رسول اکرمؐ کے اہل بیتؑ۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے یہی ولائے اہل بیتؑ اور تشیع کی بقاء کا راز ہے۔ بالفاظ دیگر یہ راز قرآن اور حدیث کی بقا میں پنہاں ہے کیونکہ شیعہ عقیدے کا پہلا اور آخری مصدر قرآن اور حدیث ہی ہے۔

مشرکین کی مخالفت کے نتیجے میں رسول اکرمؐ کو ایسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں جو پہلے کسی پیغمبر کو برداشت نہیں کرنی پڑی تھیں اور شیعوں کو جابر حکمرانوں نے وہ اذیتیں سہنی پڑیں جو ہر ''حق دار'' سہنی پڑتی ہیں۔

بنابریں قرآن مجید اپنی اصالت اور آنحضرتؐ کی حقانیت کی بنا پر باقی ہے اور

تشیع جو اس اصل کی فرع ہے اہل بیت رسولؐ کے لئے باقی ہے اس لئے تشیع اسلام اور قرآن کے ساتھ ساتھ باقی رہے گا۔

جس طرح کچھ ممتاز مہاجرین اور انصار نے اپنی زندگیاں حضرت رسالت پناہؐ کی رسالت کے دفاع کے لئے وقف کر رکھی تھیں اسی طرح مکتب تشیع کے فارغ التحصیل علماء مثلاً شیخ مفید، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، علامہ کراجکی، علامہ مجلسی وغیرہ نے بھی تشیع کے دفاع کی خاطر اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر شیعہ مذہب کے دفاع میں مفصل کتابیں لکھیں اور شیعوں کے خلاف لگائی جانے والی تہمتوں کو کتاب وسنت سے غلط ثابت کیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ علم، آگہی اور معلومات کے اس دور میں بھی جب ہر صاحب نظر سچ اور جھوٹ کو پرکھ سکتا ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ابتدائے اسلام میں لگائی گئی تہمتیں حرف بحرف دہراتے ہیں اور وہی گھسی پٹی باتیں کرتے ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اُن کے اکابرین نے کی تھیں۔ یوں وہ شیعوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدے کے دفاع میں بلا کم وکاست وہی باتیں دہرائیں جو علی بن حسین سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، محمد بن محمد بن نعمان "شیخ مفید"، علامہ مجلسی اور شمس الدین محمد بن مکی "شہید اول" نے اُن تہمتوں کے جواب میں لکھی تھیں۔

یہ کافی ہوگا کہ ہم آجکل کے نام نہاد "ملاؤں" کی کتابوں اور مقالوں سے ایک دو اقتباسات نقل کریں۔ ان میں سے ایک رسالہ آخر الساعة سے اور دوسرا کتاب آثار التشیع فی الادب العربی سے لیا گیا ہے۔ آثار التشیع تھوڑا عرصہ پہلے میں نے ایک لائبریری میں دیکھی تھی جب میں اپنی اس کتاب الشیعہ و الحاکمون کے لئے notes بنا رہا تھا۔

رسالہ آخر الساعة

آخر الساعة جلد ۱۵ ۱۹۶۱ء میں تابعی نے بنت الشاطی کے اس قول کو رد کیا

ہے جو مصر کے الاھرام میں چھپا تھا کہ سورۃ الدہر اور آیت وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ جیسا کہ تفسیر زمخشری اور تفسیر نیشاپوری میں ہے حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔

تابعی نے جواباً آخر الساعة میں لکھا کہ "یہ قول درست نہیں ہے۔ زمخشری اور نیشاپوری کی تفاسیر خیالی ہیں۔ یہ قول اُن کتابوں سے لیا گیا ہے جو خرافات سے بھری ہوئی ہیں۔"

سورۂ دہر کا امام علیؑ اور اُن کے خاندان سے منسوب کرنا زمخشری اور نیشاپوری پر ہی موقوف نہیں ہے۔ بیضاوی بغوی، ثعلبی اور ابو سعادات نے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے۔ سیوطی نے بھی در منثور میں لکھا ہے کہ یہ سورۂ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی شان میں نازل ہوا ہے۔ فخر رازی نے لکھا ہے کہ واحدی نے جس کا تعلق اشاعرہ سے ہے اپنی کتاب البسیط میں کہا ہے کہ سورۂ مبارکہ دہر امام علیؑ کی شان میں نازل ہوا ہے۔

کیا یہ کہنا چاہیے کہ ان تمام مفسرین نے جھوٹ بولا ہے اور سورۂ مبارکہ دہر اُس علیؑ کی شان میں جنھوں نے خدا اور اس کے رسولؐ کی خاطر جنگیں لڑیں نازل نہیں ہوا بلکہ اس کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ یہ سورۂ معاویہ، اُس کی ماں ہند اور اُس کے باپ ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوا ہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف بدر احد اور احزاب کی جنگیں لڑیں؟ کیا تابعی اتنا بھی نہیں جانتا کہ چاند پر تھوکا نہیں جاسکتا۔

کتاب الاثر التشیع فی الادب العربی

مصر کے سعید گیلانی نے مذکورہ بالا کتاب میں لکھا ہے کہ شیعوں نے یہ اشعار جھوٹ موٹ یزید سے منسوب کئے ہیں۔

لَعِبَتْ ھَاشِمُ بِالْمُلْکِ فَلَا خَبَرٌ جَآءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلَ
لَسْتُ مِنْ خَنْدَفٍ اِنْ لَّمْ اَنْتَقِمْ مِنْ بَنِیْ اَحْمَدَ مَا کَانَ فَعَلَ

”بنی ہاشم نے سلطنت کے لئے ایک کھیل کھیلا تھا ورنہ نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ کوئی وحی اتری تھی۔ میں خندف کی اولاد نہیں اگر میں آل محمدؐ سے اُس کام (مقتولین بدر) کا انتقام نہ لوں جو انھوں نے کیا تھا۔“

جی ہاں! یہ اشعار جھوٹے ہیں، الحاقی ہیں اور شیعوں نے ان کو یزید سے منسوب کردیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی جھوٹ ہے کہ فرزند رسولؐ کو شہید کیا گیا۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ رسول زادیوں کو بے کجاوہ اونٹوں پر کوفہ کے بازار اور شام کے دربار میں لے جایا گیا۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ سردار جوانان جنت کے ہونٹوں پر چھڑی ماری گئی۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ مکہ کی جنگ میں خانۂ کعبہ پر منجنیقوں سے حملہ کیا گیا۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ یزید کے سپاہیوں کو اہل مدینہ کے ساتھ من مانی کرنے کی اجازت دی گئی اور جنگ حرہ کا واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا۔

تابعی، گیلانی اور اُن جیسے دوسرے لوگوں نے جو کچھ کہا ہے ہمارے خیال میں اس کی وجہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی ہے یا پھر مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا اور بھائی کو بھائی سے لڑانا ہے۔[1]

۱۔ ملا اور ملوکیت گٹھ جوڑ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ملاؤں نے ہمیشہ آمروں کی مرضی کے فتوے دیئے جس سے اسلام اور مسلمانوں کا ہی نقصان ہوا۔ حکمران آل محمدؐ کے افکار کو روکنے کے لیے ہمیشہ ملاؤں سے فتوے لیا کرتے تھے۔ ابوبکر ابن عربی کی کتاب العواصم من القواصم اسی مقصد سے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں حکمرانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو صحابہ کی کج رویوں پر بحث کرنے سے منع کریں اور اگر کوئی صحابہ پر تنقید کرے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ آل بویہ نے اشاعرہ کی حوصلہ شکنی کی تھی لیکن ان کے بعد سلجوقیوں نے ان کی سرپرستی کی کیونکہ اس طرح وہ مصر کے فاطمیوں کی حکومت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ جب عباسیوں اور فاطمیوں کے درمیان عقائد کی جنگ چھڑی تھی تو ملاؤں نے ہی بنی عباس کی مدد کی تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے بھی اشاعرہ کی سرپرستی کی تھی۔

بنی عباس کے بعد

متوکل کے بعد سلطنت عباسیہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور عالم اسلام میں دوسری سلطنتیں بن گئیں جن میں آل بویہ، حمدانی اور فاطمی سرفہرست تھے۔ اس عرصہ میں شیعوں کو ذرا سا سکون نصیب ہوا تھا لیکن سلجوقیوں کے بعد ایک مرتبہ پھر ان پر ویسی ہی آفتیں ٹوٹ پڑیں جیسی بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں ٹوٹی تھیں بالخصوص ایوبی سلاطین کے زمانے میں وہ ظلم کی چکی میں پس کر رہ گئے۔ یوسف بن ایوب (۱۱۶۹ء۔ ۱۱۹۳ء جو تیسری صلیبی جنگ میں بیت المقدس کی فتح کے حوالے سے اور سلطان صلاح الدین کے نام سے زیادہ مشہور ہے) بڑا خونخوار اور بے رحم تھا۔

ابوعبداللہ شیعی

مشہور عالم ابوعبداللہ شیعی کا نام حسن بن احمد بن زکریا تھا۔ وہ صنعاء (یمن) کا رہنے والا تھا۔ افریقا جانے کے ارادے سے جب وہ مکہ پہنچا تو اس نے یہاں افریقیوں کو فضائل اہل بیتؑ بیان کرتے سنا چنانچہ اس نے بھی اُن کے سامنے فضائل اہل بیتؑ کے موضوع پر تقریر کر کے ان کے دل جیت لئے۔ چونکہ شیعہ عقیدہ پہلے ہی افریقا میں نفوذ کر چکا تھا اس لئے اُن لوگوں نے اُس سے افریقا چلنے کی درخواست کی۔ ابوعبداللہ شیعی نے اُن کی درخواست قبول کرلی۔ مقریزی کے مطابق افریقی شیعوں نے ابوعبداللہ شیعی کو خوش آمدید کہا اور اس کی بڑی عزت

کی۔ یہ ۲۸۸ھ کی بات ہے۔ جب اُن کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوگیا تو ابوعبداللہ شیعی نے لوگوں سے کہا کہ وہ سلطان ابراہیم بن اغلب کے خلاف جنگ کریں اور اس کو خلافت سے معزول کردیں۔ افریقیوں نے اُس کی بات مان لی اور ابراہیم کو خلافت سے ہٹا دیا۔ یوں عبداللہ شیعی کی کوششوں سے عبید اللہ مہدی پہلا فاطمی خلیفہ بنا۔[۱]

دولت فاطمیہ مصر سے شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے خلفاء کی تعداد چودہ تھی وہ ۲۹۶ھ سے ۵۶۷ھ تک حکمران رہے۔

فاطمی خلافت میں شیعہ عقیدہ افریقا میں اتنا پھیلا کہ ایک فلسطینی نے کہا:

اگر میرے پاس دس تیر ہوں تو میں ۹ افریقا پر چلاؤں گا کیونکہ وہاں بہت شیعہ ہیں اور ایک یورپ پر چلاؤں گا۔

امام علیؑ کے زمانے میں شیعہ مصر میں موجود تھے اور بتدریج اُن کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ انھوں نے فلسطین اور اردن میں بھی قدم جما لیے۔ اس کے نتیجے میں طبریہ، آدھا نابلس، بیت المقدس اور عمان کا ایک بڑا حصہ شیعہ تھا جیسا کہ Adam Mitz نے **الحضارة الاسلامیة** ج۱، باب ۵ میں لکھا ہے۔

خطط مقریزی (ج ۲، باب، ابوعبداللہ شیعی) اور **اعیان الشیعہ** میں ہے کہ افریقا میں شیعہ عقیدہ معز بن بادیس صنہاجی کے زمانے تک باقی رہا تاہم معز

۱۔ ابوعبداللہ شیعی کے بار احسان سے مہدی کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اسی کی نگاہ التفات نے اُسے فرش سے عرش پر پہنچایا تھا لیکن اُس نے ابوعبداللہ کو قتل کردیا۔ جذبۂ اقتدار انسان کو اخلاقیات کے حدود کا پابند نہیں رہنے دیتا جیسا کہ علامہ مغنیہ نے "عرض مولف" میں فرمایا ہے: "جب لوگ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں تو جلد ہی بدل جاتے ہیں اور اُن کا دامن اوصاف حمیدہ سے خالی ہوجاتا ہے۔" انسانوں کے پروردگار نے سچ فرمایا ہے کہ جب انسان بے دست و پا ہوتا ہے تو نیک اور پارسا ہوتا ہے لیکن جونہی طاقت حاصل کرلیتا ہے خدا کو بھول جاتا ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔

نے چن چن کر شیعوں کو قتل کردیا یا جلا دیا۔ نتیجتاً شیعہ منتشر ہوگئے۔ (عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس میں تو وہ تمام لوگ کسی نہ کسی طرح موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے جو یا تو خاندان رسالتؐ سے تعلق رکھتے تھے یا محبان اہل بیت تھے لیکن یہ سلسلہ کبھی رکا نہیں)۔

علامہ شیخ محمد حسین مظفر تاریخ شیعہ (ص ۲۶۹) میں لکھتے ہیں:

بیسویں صدی میں افریقہ میں شیعوں کی کثیر تعداد[۱] سے پتا چل جاتا ہے کہ

۱۔ لیبیا کے صدر معمر قذافی نے کیم مارچ ۲۰۰۷ء کو نائجر میں قبائلی عمائدین سے جو خطاب کیا تھا وہ www.en.wikiquote.org/wiki پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے خطاب کا خلاصہ یہ ہے کہ
"ایران کی اسلامی حکومت مسلم دنیا کی پہلی شیعہ حکومت نہیں ہے۔ ایران سے پہلے شمالی افریقا میں فاطمیوں کی شیعہ حکومت قائم تھی جس کا دارالخلافہ "قاہرہ" تھا۔ یہ جو کہا جارہا ہے کہ ایرانی شیعہ ہوتے ہیں اور عرب سنی ہوتے ہیں یہ استعمار کا پُرفریب پروپیگنڈا اور سنیوں کو شیعوں سے لڑانے کی سازش ہے۔ شمالی افریقا عرب اور شیعہ ہے۔ پورے شمالی افریقا میں شیعہ کلچر پایا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ عاشورا محرم مناتے ہیں۔ مصر سے لے کر بحراوقیانوس تک آپ کہیں چلے جائیے آپ کو کسی شخص کا نام معاویہ نہیں ملے گا۔ اُن کے نام علی، فاطمہ، خدیجہ، حسن اور حسین ہوتے ہیں۔
اولاد علیؑ و فاطمہؑ کو جب خلافت ملی تو انھوں نے اپنی خلافت کا نام "ماں فاطمہ زہراؑ" سے منسوب کیا۔ انھوں نے ہی الازہر قائم کی تھی۔ الازہر کا لفظ بھی زہرا سے ماخوذ ہے۔ سلطنت فاطمیہ دسویں صدی میں قائم ہوئی تھی اور ۲۶۰ سال تک اس کے سائے تلے شمالی افریقا میں تمام قبائلی، گروہی اور سیاسی اختلافات ختم ہوگئے تھے۔
ہم بھی جدید فاطمی حکومت کے داعی ہیں جو ہر قسم کے فرقہ وارانہ جھگڑوں سے پاک ہو۔ ہمیں اس سے دلچسپی نہیں کہ جعفر صادقؑ نے موسیٰ کاظمؑ کو امام بنایا تھا یا اسماعیل کو۔ یہ اُن بزرگوں سے متعلق معاملہ ہے۔ خدا اُن سب پر رحمت کرے۔ ہم اس جھگڑے میں بھی نہیں پڑتے کہ خلافت کا حقدار کون تھا؟ علیؑ یا معاویہ۔ اگر علیؑ کے طرفدار ہونے کا مطلب تشیع ہے تو یہ سچ ہے کہ ہم سب شیعہ ہیں۔ خلافت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دنیاوی حکومت سے عبارت ہے۔ اگر رسول اکرمؐ کے بعد صحابہ نے فیصلہ کیا کہ اُن کا خلیفہ کون ہوگا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اکرمؐ "حکمران" نہیں تھے۔ وہ "رسول" تھے۔"
(قذافی کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سیاست دین سے جدا ہے۔ یعنی دین اجتماعی امور اور انسانوں کے دنیاوی مسائل سے الگ ہے اور اس کے پاس ان معاملات کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں ہے)

تمام تر مظالم کے باوجود یہاں شیعیت کی روح باقی رہی ہے۔ ممکن ہے کہ معز کی شیعہ کش پالیسی بعد ایک دفعہ پھر شیعہ افریقا پہنچے ہوں۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو لاکھوں ایرانی شیعہ اس وقت افریقا میں رہتے ہیں۔ اُن کے اتنی بڑی تعداد میں وہاں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی نجف کے علماء زنجبار جاتے ہیں اور وہ بھی ہر سال بہت بڑی تعداد میں زیارت کے لئے کربلا آتے ہیں۔ وہ اکثر موسم حج میں بھی دیکھے جاتے ہیں۔

جامع الازہر

جامع الازہر کی تاسیس سے شیعوں کا ایک وسیع پروگرام عمل میں آیا۔ فاطمی سپہ سالار جوہر صقلی نے ۳۵۹ھ میں اس کی بنا رکھی۔ اس کے قیام کے وقت اس میں فاطمی فقہ، شیعہ دینیات اور فلسفہ پڑھائے جاتے تھے۔ مصر میں قضا، فتویٰ اور تعلیم کے محکمے مذہب اہل بیتؑ کے مطابق ہوتے تھے۔ پہلی کتاب جو الازہر[1] میں پڑھائی جاتی وہ **الاقتصاد فی فقہ آل الرسول** تھی۔ اس کے بعد فقہ میں **دعائم الاسلام** پڑھائی جاتی تھی جس میں حلال وحرام، قضایا اور احکام اہل بیتؑ

ا۔ سید رئیس احمد جعفری ندوی کی کتاب تاریخ دولت فاطمیہ کے صفحہ ۳۷۴ پر ترقیم ہے کہ
"امام عزیز نے اس مسجد کو جامع بنا دیا اور اس کے پڑوس میں فقیہوں کے لئے دار الجماعت تعمیر کروایا جس میں وہ نماز ظہر کے بعد جمع ہوتے اور عصر تک علمی مذاکرات کیا کرتے تھے۔ امام عزیز کے حکم سے وزیر سیدنا یعقوب بن کلس نے فقیہوں کے لئے وظیفہ اور آذوقہ بھی مقرر کیا تھا۔ اس میں علمی مشاغل کو فروغ دینے کے لئے دور دور مقامات سے علماء و فقہاء مدعو کئے گئے تھے اور ان کی معقول تنخواہیں مقرر تھیں۔ فقہ اور وعظ و نصیحت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن سے استفادہ کرنے کے لئے دور دور سے طلباء کی کثیر تعداد آیا کرتی تھی۔ مختلف علوم کے لئے طلبہ حلقہ بنا کر فرش پر استاد کے اردگرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ داعی الدعاۃ عورتوں کو بھی تاویل پڑھایا کرتے تھے اور ان کا علیحدہ حلقہ ہوتا تھا۔ اسی مسجد میں قاضی عبدالعزیز بن محمد بن نعمان اپنے دادا سیدنا قاضی نعمان کی کتاب "اختلاف اصول المذاہب" کا درس دیا کرتے تھے۔"

ہوتے تھے۔[1] **(الازہر فی الف عام، عبد المنعم خفاجی)**

ا۔ حضرت علامہ محمد جواد مغنیہ نے اس کتاب میں لفظ شیعہ کو وسیع تر معنوں میں برتا ہے اور مختلف شیعہ شاخوں میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے۔ قارئین کی خدمت میں ہم علامہ سید محمد حسین طباطبائی کی کتاب "شیعہ در اسلام" سے یہ وضاحت پیش کر رہے ہیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

"اہل تشیع کی مختلف شاخوں مثلاً اثنا عشری، اسماعیلی اور زیدی میں بڑا فرق ہے۔ اہل تشیع کی اکثریت شیعہ اثنا عشری ہے اور اسی سے دوسری شاخیں پھوٹی ہیں۔ اہل تشیع کے مطابق اسلامی خلافت — روحانی قیادت جس کا لازمی جزو ہے — امام علیؑ اور ان کی نسل پاک میں ہونے والے معصوم اماموں کا حق ہے۔ اُن کے عقیدے کے مطابق رسول اکرمؐ نے بالصراحت فرمایا تھا کہ اماموں کی تعداد "بارہ" ہے۔ نیز شیعہ اثنا عشری عقیدہ ہے کہ شرعی احکام سے متعلق "ظواہر قرآن" جو انسان کی پوری روحانی زندگی پر محیط ہیں درست، ہر دور میں قابل عمل اور قیام قیامت تک ناقابل تنسیخ ہیں۔ نیز یہ کہ ان احکام شریعت کا علم ائمہ اہل بیتؑ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔

لیکن زیدی شیعہ یہ بات نہیں مانتے کہ امامت فقط اہل بیت رسولؐ کا حق ہے۔ وہ اماموں کی تعداد بھی بارہ تک محدود نہیں مانتے اور فقہ اہل بیتؑ پر بھی عمل نہیں کرتے۔

اسماعیلی شیعہ بھی اماموں کی تعداد بارہ نہیں مانتے۔ اُن کے ہاں امامت سات کے ہندسے کے گرد گھومتی ہے۔ نیز باطنی اسماعیلی قرآن کی باطنیت اور شرعی احکام میں تغیر و تبدل کے بھی قائل ہیں۔"
(اردو ترجمہ پاسداران اسلام، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی)

ڈاکٹر فرہاد دفتری نے اپنی کتاب **اسماعیلی تاریخ و عقائد** (اردو ترجمہ) میں لکھا ہے کہ
"حالیہ زمانے تک عام طور پر غیر اسماعیلی حلقوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسماعیلیوں کا بھی اپنا ایک خاص فقہی مسلک رہا ہے۔ اسماعیلی فقہ قاضی نعمان (۲۹۰ھ۔۳۶۳ھ) کی کتاب **دعائم الاسلام** پر مشتمل ہے۔ دعائم الاسلام کی پہلی جلد میں عبادات سے بحث کی گئی ہے مثلاً ایمان اور مذہبی فرائض جو اسماعیلی نظریے کے مطابق اسلام کے سات ارکان پر مشتمل ہیں مثلاً ولایت، طہارت، صلات، زکات، روزہ، حج و جہاد اور دوسری جلد میں معاملات مثلاً ماکولات، مشروبات، ملبوسات، وصیت، میراث، شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ کا بیان ہے۔"

فاطمی خلیفہ مستنصر کے بعد اس کے دو بیٹوں مستعلی اور نزار کے مابین امامت کے لئے جنگ ہوئی جس میں مستعلی فتح یاب ہوا اور نزار گرفتاری کے بعد قید خانے میں انتقال کر گیا۔ المختصر اسماعیلی شیعہ نزاری اور مستعلوی فرقوں میں بٹ گئے۔ جدید اسماعیلی یعنی نزاری اور مستعلوی آج کل آغاخانی اور بوہری کے نام سے مشہور ہیں۔

صلاح الدین ایوبی

صلاح الدین ایوبی کرد تھا۔ اُس کا باپ نجم الدین اور چچا اسد الدین (شیر کوہ) آذربائیجان میں پلے بڑھے اور پھر بغداد منتقل ہو گئے۔ بغداد سے وہ حلب چلے گئے حلب میں شیر کوہ نور الدین محمود بن زنگی سے مل گیا۔ جب نور الدین زنگی تخت نشین ہوا تو اُس نے شیر کوہ اور اُس کے بھائی یوسف کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا۔ جب یورپ قاہرہ کے خلاف لڑ رہا تھا تو فاطمی خلیفہ عاضد نے نور الدین زنگی سے مدد کی درخواست کی کیونکہ حلب اور دمشق میں اُس کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ نور الدین زنگی نے آخری فاطمی خلیفہ عاضد کی مدد کے لئے شیر کوہ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج بھیجی جس میں صلاح الدین بھی شامل تھا۔ فتح پانے کے بعد شیر کوہ عاضد کا وزیر بن گیا لیکن زندگی نے اسے مہلت نہ دی اور وہ دو مہینے بعد ہی مر گیا۔ اُس کی جگہ اُس کا بھتیجا صلاح الدین وزیر بنا۔

عاضد کا احسان مند ہونے کے بجائے صلاح الدین نے سازشیں کر کے اسے تخت سے محروم کر دیا۔ اُس نے عاضد کی تمام املاک حتیٰ کہ اُس کا گھوڑا بھی ضبط کر لیا۔ مقریزی نے لکھا ہے کہ صلاح الدین نے کچھ مدت بعد عاضد کو قید کر دیا اور شام سے اپنے بہن بھائیوں اور کنبہ قبیلے کو مصر بلا لیا اور فاطمی خلیفہ کے درباریوں کے ضبط شدہ اموال اور مکانات اُن میں تقسیم کر دیے۔

صلاح الدین نے شیعہ قاضیوں کو معزول کر کے شافعی قاضی مقرر کر دیے۔ اُس نے اذان میں سے حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ کا جملہ بھی نکال دیا اور لوگوں کو مالکی اور شافعی مذہب کی طرف دعوت دی۔ یوں شیعہ عقیدہ معطل ہو گیا اور رفتہ رفتہ مصر کے لوگ اسے بھول گئے۔

صلاح الدین نے لوگوں کو سنی اور اشعری عقیدہ قبول کرنے پر مجبور کیا اور جن لوگوں نے انکار کیا انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُس نے حکم دیا کہ فقط اُس شخص کی گواہی قبول کی جائے جو مذاہب اربعہ کا معتقد ہو اور جو ان مذاہب سے تعلق نہ

رکھتا ہو اسے تقریر یا تدریس کا حق نہیں۔

خفاجی اپنی کتاب الازہر فی الف عام جلد اول، صفحہ ۵۸ پر لکھتا ہے:

"ایوبیوں نے شیعی آثار کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔"

"صلاح الدین نے بری طرح سے فاطمی خاندان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور انھیں پریشانی و سرگردانی سے دوچار کر دیا۔ اُس نے فاطمی عمال برطرف کر دیئے تو اُس کی قوم راتوں رات اُن کے گھروں میں گھس گئی اور گھر گھر میں واویلا مچ گیا۔

اولادِ علیؑ کے جو افراد مصر میں بچ گئے صلاح الدین نے انھیں قید کر دیا اور مردوں کو عورتوں سے جدا کر دیا تاکہ امام علیؑ کی نسل منقطع ہو جائے۔

بنی امیہ اور حجاج عاشورا کے دن عید مناتے تھے لیکن بعد میں یہ رسم بد ختم ہو گئی تھی۔ صلاح الدین نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ صلاح الدین کا شر قتل اور عورتوں اور بچوں کو جلاوطن کرنے تک ہی محدود نہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر علم و دانش اور اسلام کی عظمت کے آثار کو تباہ کرنے کی ٹھانی۔

فاطمی خلفاء نے عظیم الشان کتب خانے قائم کرنے کی طرف خاص توجہ دی تھی۔ اُن کے ایک محل میں بھی وسیع کتب خانہ قائم تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس عجائب روزگار کتب خانے میں فقہ، حدیث، لغت، تاریخ، ادب، طب، کیمیا، فلکیات وغیرہ پر تقریباً دو لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی دنیا میں اُس وقت اتنا بڑا اور کوئی کتب خانہ نہیں تھا۔ دار الحکمۃ میں ایک اور کتب خانہ تھا جس نے اسکندریہ کے مشہور کتب خانے کی جگہ لے لی تھی اور الازہر میں ایک بھی جامع کا اپنا ایک خاص کتب خانہ تھا۔ صلاح الدین نے یہ تمام کتب خانے تباہ کر دیے۔[1]

---

[1] صلاح الدین کے بارے میں یہ معلومات الخطط ج ۲ و ۳۔ الازہر فی الف عام، جزء ۱۔ تاریخ کامل ج ۹۔ اعیان الشیعہ ج ۱ اور تاریخ الشیعہ سے لی گئی ہے۔ اعیان الشیعہ اور تاریخ الشیعہ کے مصنفین نے کئی کتابوں پر انحصار کیا ہے۔ (مولف)

صلاح الدین ایوبی شیعوں کی نظر میں

صلاح الدین نے استعمار کے خلاف صلیبی جنگیں لڑنے میں جو دلیری دکھائی ہے ہم اُس کے منکر نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے اُس کی مذمت کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ صلاح الدین نے یورپ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ ساڑھے تین سال تک فریقین ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے اور یافا، عکا، صور، طرابلس اور انطاکیہ[1] پر مشتمل فلسطینی علاقہ عیسائیوں کے زیر نگیں رہے گا لیکن اس معاہدے کے باوجود اُس نے عیسائیوں کے خلاف جنگ کی۔ تاہم ہمیں اُس کے اُن جرائم پر اعتراض ہے جو اُس نے عورتوں اور بچوں کے ساتھ کیے۔ ممکن ہے کہ ہم اُس کے اُن مظالم اور جرائم کے لئے وجہ جواز تلاش کرسکیں جو اُس نے فاطمیوں کے خلاف کیے تھے حالانکہ وہ اُس کے ولیٔ نعمت تھے لیکن ہم کتب خانوں کو جلانے اور علمی آثار کو تباہ کرنے کی کیا توجیہہ کرسکتے ہیں جو ایک سماج کا مشترکہ ورثہ ہوتے ہیں۔

صلاح الدین نے شیعوں کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی وجہ تعصب کے سوا اور کچھ نہیں تھی کیونکہ شافعیوں، مالکیوں، حنفیوں، حنبلیوں اور شیعوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سبھی قرآن وسنت پر ایمان رکھتے ہیں۔ علمائے اہل سنت مثلاً شیخ ابو زہرہ شیخ محمود شلتوت (جنھوں نے بطور شیخ الازہر وہ مشہور فتویٰ دیا تھا کہ مذاہب اربعہ کی طرح فقہ جعفری بھی اسلامی مذہب ہے اور اس پر عمل کرنا صحیح ہے) شیخ مدنی اور شیخ باقوری نے بھی یہی کہا ہے۔ امام غزالی اور دیگر متقدمین ومتاخرین سنی علماء نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

اگر صلاح الدین شافعی تھا تو کیا امام شافعی نے اہل قبلہ کو کافر کہا ہے اور شیعوں کا خون حلال قرار دیا ہے؟!!

اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ صلاح الدین دلیر اور جنگجو تھا لیکن اُس کی رگ

۱۔ مقریزی الخطط ج ۳، ص ۱۷۰۔

رگ میں تعصب بھرا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص لڑتا ہے ضروری نہیں کہ وہ برائیوں کے خلاف ہی برسرپیکار ہو۔ یہ بات صحیح نہیں کہ اگر ایک شخص دشمن سے لڑتا ہے تو اُس کے دوسرے کاموں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے اور اُس کے خاندانی اور تعلیمی پس منظر پر تنقید نہیں کرنی چاہیے۔ کیا دور جاہلیت میں عنترہ جیسے شیر دل اپنے ناموس اور اپنے مال کا دفاع نہیں کرتے تھے؟ وہ بھی تو اپنی قوم کی حمایت میں دشمن سے لڑتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ حق سے بھی بیر رکھتے تھے۔

ایسے بھی لوگ ہیں جو بیکار کی باتیں کرتے ہیں جیسے صاحب عقد الفرید (ج ۲، ص ۲۲۴) نے لکھا ہے:

جاحظ بیان کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ کشتی میں ایک موٹے پیٹ والا بدتمیز شخص سفر کر رہا تھا۔ وہ جب بھی لفظ شیعہ سنتا تو غصہ کے مارے لال بھبھوکا ہوجاتا۔ جب میں نے اُس سے اس قدر غصہ ہونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا کہ مجھے تو شیعہ کی ''ش'' سے ہی نفرت ہے کیونکہ شیعہ کا پہلا حرف ش ہے اور بہت سے برے لفظوں کا پہلا حرف بھی ''ش'' ہے مثلاً شیطان، شر، شوم (منحوس) شقا (بدبختی) شتم (گالی) شنار (بدترین عیب) شین (مذمت) شوک (کانٹا) شکویٰ (درد) اور شح (کنجوسی)۔ یہ بکواس سننے کے بعد جاحظ نے اس سے کہا:

''پھر تو ضروری ہے کہ شیعہ مذہب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔''

حیرت ہے کہ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد خود جاحظ نے بھی تعصب کا مظاہرہ کیا۔ اگر ہمارے بیشتر علماء ایسے ہی ہوں تو وہ دنیا کو ہذیان سے بھر دیں گے کیونکہ یہ لوگ کھانے اور باتیں بنانے میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔ اس طرح تو شیعہ بھی ''س'' سے شروع ہونے والے الفاظ مثلاً سرطان، سل، سرم (دبر کا درد) سلح (گوبر) سلس (پاگل) سعال (درد سینہ) سب (گالی) سفلس (آتشک) سفہ (بے وقوفی) سفک (خونریزی) سلب (غارت گری) سوء (بدی) سم (زہر)

سقوط (گرنا) خف (پستی) وغیرہ سے استدلال کرکے سنی مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑ سکتے ہیں۔[1]

۱۔ ڈاکٹر عامر لیاقت حسین کے مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے جو ۲۱؍ مارچ ۲۰۰۹ء کے اخبار جنگ کراچی میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں موصوف لکھتے ہیں:

اے محمدؐ کے میم! مومن میں بھی تو ہے، مسلم میں بھی ہے تو، ایمان میں بھی تو، اسلام میں بھی تو — مسجد میں تجھے دیکھا، مینار میں بھی دیکھا، منبر میں تجھے پایا، محراب میں بھی دیکھا — مشرق میں بھی موجود ہے، مغرب میں بھی ہے میم، نماز میں پاتا ہوں اور امام میں بھی میم — میلاد کی محفل میں سلام تک ہے میم، کلیم کے سفر میں کلام تک ہے میم، آدم علیہ السلام کی ابتدا سے خاتم علیہ السلام کی انتہا تک میم ملتا ہے، اس میم نے قسمت بھی دی، حکمت بھی ہم کو دی اور سرکار کی غلامی کی امانت بھی ہم کو دی، اس میم نے معراج کا رتبہ بڑھا دیا، میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عرش معلی دکھا دیا اور اسی میم نے اولاد کو ماں سے ملا دیا، ممتا کا اسی میم نے مطلب بتا دیا، زمانے میں ڈھونڈ جاا سے، محیط میں ہے غم، معصومیت میں تم اور معصیت میں کم، مالک کا میم، مٹی سے مخلوق بنائے اور موت میں یہ جائے تو میت اٹھا لائے، امن کا میم ملتا ہے مسکان میں اگر، مکیں کا میم ملتا ہے مکان میں مگر، موذن سے نکلا میم اقامت میں مل گیا، سلامت سے نکلا میم قیامت میں مل گیا، معبود ہے موجود، دونوں میں یہی میم، شمس وقمر کے اردگرد گھومتا ہے میم، حمایت کے میم نے کئی حامی بنا دیے اور جا کے نام میں کئی نامی بنا دیے، مدبر ومفکر، مبشر و مبلغ اسی میم کے محتاج ہیں اور محلوں میں حاکم اسی میم سے کرتے راج ہیں لیکن افسوس کہ میم کے صدقے مزے لوٹنے والے آج اسی محمد (ص) سے لاتعلق ہیں...

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ دینی امور میں سین یا شین سے اور جیم یا میم سے کچھ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جناب کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا ہے کہ مسلم میں بھی میم ہے اور مجرم میں بھی میم۔ موحد میں بھی میم ہے تو ملحد ومشرک میں بھی میم ہے۔ مسجد میں اگر میم ہے تو مندر میں بھی میم ہے۔ مبارک اور مسعود میں میم ہے تو مردود، ملعون اور منحوس میں بھی میم ہے۔ ظالم میں بھی میم ہے اور مظلوم میں بھی میم ہے۔ مومن اور منافق دونوں میں میم ہے۔ عمرؓ، عثمانؓ، معاویہ، عمرو بن عاص، عمرو عبدود، مروان، ہامان، متوکل، مامون، شمر، ابن ملجم سب ہی لفظوں میں میم ہے۔ شاتم رسولؐ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے ناموں میں بھی میم آتا ہے لیکن اللہ، رسول، قرآن، کعبہ، علیؑ، زہراؑ، حسنؑ، حسینؑ، جنت اور دوزخ کسی میں بھی میم نہیں آتا۔ جان لیجئے کہ لفاظی سے ذہنوں کو تسخیر نہیں کیا جاسکتا اور حق کا بول بالا نہیں ہوسکتا۔

دولت عالیہ عثمانیہ

سولہویں صدی میں بیشتر عرب ممالک عثمانی سلطنت کے زیر تسلط آگئے۔ سلطان سلیم نے جو نواں عثمانی سلطان تھا شام، حجاز اور مصر فتح کئے اور پھر سلطان سلیمان قانونی نے باقی عرب شہر بھی فتح کر لئے۔ اُس زمانے میں تین بڑی اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں:

۱۔ عثمانی سلطنت جس کا دارالحکومت استنبول تھا۔

۲۔ صفوی سلطنت جس کا دارالحکومت تبریز تھا۔

۳۔ مملوک سلطنت جس کا دارالحکومت قاہرہ تھا۔

شاہ اسماعیل صفوی شیعہ تھا اور سلطان سلیم عثمانی سنی تھا۔ اُس نے کچھ نام نہاد علماء سے فتویٰ حاصل کیا کہ شیعہ دائرہ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہیں۔ اس فتویٰ کی بنا پر اُس نے شیعوں کا خاتمہ کر دیا۔ (**خضری، البلاد العربیہ والدولة العثمانیہ**، ص ۴۰۰، طبع ۱۹۶۰ء)

اعیان الشیعہ جزء اول میں ہے کہ سلطان سلیم نے اناضول میں چالیس ہزار یا ستر ہزار شیعوں کو خون میں نہلا دیا۔

ابن صباغ مالکی نے **فصول المہمہ** میں لکھا ہے:

جب ''شیخ نوح حنفی'' نے فتویٰ دیا کہ شیعہ کافر اور واجب القتل ہیں تو حلب میں ہزاروں شیعہ تہہ تیغ کر دیئے گئے اور جو بچ گئے وہ ہجرت کر گئے۔ نتیجتاً حلب میں ایک بھی شیعہ نہ رہا حالانکہ حمدانیوں کی حکومت کی ابتدا سے شیعہ عقیدہ حلب میں جڑ پکڑ گیا تھا۔ اُس وقت حلب میں ابی زہرہ، آل ابی جرادہ اور دیگر نامور فقہاء رہتے تھے جن کے نام کتاب **امل الامل** میں موجود ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں عظیم شیعہ عالم جناب محمد بن مکی کو قتل کر دیا گیا جو شہید اول کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ اُن کی تصنیف کردہ کتابیں اب بھی

نجف، قم اور دیگر شہروں کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔[1] (جبل عامل کے نزدیک) عکا کے عامل جزار نے حجاج کے مظالم کی یاد تازہ کردی۔ جبل عامل کے شہروں کے سردار شیخ ناصیف نصار کو قتل کرنے کے بعد اُس نے کئی ایک علماء اور سرداروں کو بھی گرفتار کرلیا اور مروا ڈالا جن میں عالم بزرگوار سید ہبۃ الدین موسیٰ، سید محمد آل شکر، شیخ محمد عسیلی، شیخ علی خاتون اور دوسرے فقہاء اور اطباء شامل تھے۔

اعیان الشیعہ (ج ۱، ص ۴) میں ہے کہ شیخ خاتون طب قدیم کے فاضل اطباء میں سے اور جبل عامل کے مرجع ناصیف نصار وائلی کے ہمعصر تھے۔ "احمد پاشا"

۱۔ شہید اول کو ۷۸۶ھ میں جراکسہ کے پہلے بادشاہ برقوق کے عہد میں قتل کیا گیا۔ برہان الدین مالکی اور عباد بن جماعہ شافعی نے تہمت لگائی تھی کہ شہید اول محرمات دین مثلاً شراب نوشی کو حلال جانتے ہیں لہٰذا انھیں قتل کردیا جائے۔ چنانچہ ایک سال تک دمشق کے قلعے میں قید رکھنے کے بعد اُن کا سر تلوار سے قلم کردیا گیا، پھر انھیں تختہ دار پر کھینچا گیا، پھر سنگسار کیا گیا اور پھر جلا دیا گیا۔ (مؤلف)

شہید اول کی مشہور ترین کتاب لمعہ ہے۔ شہید ثانی جناب زین الدین بن نور الدین نے اس کتاب کی شرح لکھی ہے جو آج بھی تمام شیعہ مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔

صاحب لؤلؤ کے مطابق دولت عالیہ عثمانیہ میں عین مسجد الحرام کے سامنے سے شہید ثانی کو گرفتار کرکے چالیس دن تک مکہ کے ایک گھر میں قید رکھا گیا۔ پھر قسطنطنیہ لے جاکر قتل کردیا گیا۔ اُن کی لاش تین دن تک پڑی رہی، پھر اٹھا کر دریا میں پھینک دی گئی۔

جناب قاضی نور اللہ شوشتری جنھیں شہید ثالث کہا جاتا ہے مغل بادشاہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں چیف جسٹس تھے۔ شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) اور دیگر شدت پسند علماء نے آپ کے قتل کا فتویٰ دیا تھا۔ آپ کی متعدد تصنیفات میں سے مجالس المومنین اور احقاق الحق عالمگیر شہرت کی حامل ہیں۔ احقاق الحق لکھنے پر تقریباً چالیس علماء نے فتویٰ دیا کہ قاضی نور اللہ کو ایک سو کوڑے مارے جائیں، گرم سیسہ پلایا جائے، زبان گدی سے کھینچ لی جائے اور پھر سر قلم کردیا جائے۔ جب آپ کو کوڑے لگائے گئے تو آپ پندرھویں کوڑے پر ہی شہید ہوگئے لہٰذا باقی کوڑے آپ کی لاش پر مارے گئے۔ پھر گدی میں سوراخ کرکے آپ کی زبان کھینچی گئی اور سیسہ گرم کرکے آپ کے سر پر ڈالا گیا جس سے آپ کا سر جل گیا اور مغز باہر نکل گیا۔ پھر آپ کی لاش آگرہ شہر کے باہر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی گئی۔

نے شیخ خاتون کو جبل عامل کے دوسرے علماء اور معززین کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ اُس نے شیخ خاتون کو عکا میں قید رکھا اور بالآخر قتل کردیا اور لوہا پگھلا کر اُن کے سر پر انڈیل دیا گیا۔

جزار نے جبل عامل کے کتب خانے لوٹ لئے۔ آل خاتون کے کتب خانے میں پانچ ہزار کتابیں تھیں جن سے ایک ہفتے تک عکا کے حمام گرم کئے جاتے رہے۔ جزار کے ظلم سے جو بچ گیا وہ بھاگ گیا۔ جزار کے دور میں جبل عامل کے بہت سے علماء بھاگ گئے۔ اُن میں سے ایک شاعر شیخ ابراہیم یحییٰ تھے جنھوں نے دمشق میں پناہ لی۔ وہ ہمیشہ اس واقعہ سے ناخوش رہتے تھے اور جزار کے مظالم بیان کرتے تھے۔ چونکہ انھوں نے تمام واقعات بچشم خود دیکھے تھے اس لئے انھوں نے اپنے اشعار میں لوگوں پر ہونے والے مظالم کی صحیح صحیح عکاسی کی ہے۔ اُن کے مرثیے پڑھ کر انسان کا خون کھول اٹھتا ہے۔ اُن کا ایک مرثیہ جو طویل ہے یوں شروع ہوتا ہے:

جو وقت گزرتا ہے وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات لئے ہوتا ہے۔ جب ایک بہادر آدمی کو زک اٹھانا پڑتی ہے تو اُس کے لئے صبر کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ہم پر یہ کس قدر گراں ہے کہ ہمارے شہر میں فرعون کی سی عیاشیاں ہو رہی ہیں انھیں انصاف سے کوئی تعلق نہیں اور ظلم کرنے کے لئے اُن کے پاس بہت بڑی فوج موجود ہے۔ گردش زمانہ نے ہمارے معاملات میں دخل دیا اور خلاف توقع زندگی کی تمام چاشنی ختم کردی۔ جہاں دیکھو خون میں لتھڑی لاشیں لئے بے پناہ گرین اور زنجیروں میں جکڑے قیدی نظر آتے ہیں۔ افسوس! ہم بہت سے ایسے دل فگار علماء کو دیکھتے ہیں جن کے دل حوادث روزگار نے زخمی کردیئے ہیں اور اُن کے یہ زخم مندمل ہونے والے نہیں۔ یہ علماء قید کئے گئے ہیں اور ستائے گئے ہیں۔ یہ بات نہایت سنگین ہے کہ عالم کی عزت نہ کی جائے۔ افسوس! بہت سے ایسے معززین

تھے کہ جب صبح ہوئی تو ظالموں نے اُن کی گردنوں میں زنجیریں پہنا دی تھیں۔

ایسے ہی کسی پرآشوب موقع پر شبلی نعمانی نے کہا تھا:

عالمان دین کو پہنائی جا رہی ہیں زنجیریں
یہ زیور سید سجادؑ عالی کی وراثت ہے

اس ظلم کو دیکھ کر فرزانے دیوانے ہوگئے۔ لوگ ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اُن کا ہر زخم اب بھی لہو دیتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ ظلم کے سوداگر گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں اور جو بھی صبح طلوع ہوگی وہ بے نور ہوگی تو میں نے وہ جگہ چھوڑ دی جہاں میں پریشان تھا کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ انسان اُس جگہ خوش رہ سکے جہاں اُس کا ہمسایہ اسے سانپ کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتا ہو۔ حاکمیت صرف خدائے ذوالجلال کے لئے ہے لیکن یہ ایک مجرم کے ہاتھ لگ گئی ہے جسے حلال اور حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ ایک مجرم اور زانی کہتا ہے کہ میں دین دار ہوں لیکن افسوس اللہ کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اللہ جو مجرموں کی گھات میں ہے اُن کو خوب پہچانتا ہے۔

یہ اشعار جزار کے مظالم کا تاریخی ثبوت ہیں اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان میں وہ چیزیں بیان کی گئی ہیں جنھیں سن کر انسان کانپ جاتا ہے۔

عثمانیوں کی زیادتیاں عرب شہروں اور شیعوں تک ہی محدود نہ تھیں۔ انھوں نے شیعوں کو چھوٹے بڑے تمام سرکاری اداروں سے نکال دیا تھا اور مخصوص مذہبی مراسم ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ شام میں اور جہاں شیعوں کی آبادی کم تھی وہاں انھیں مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ مظالم چار سو سال (۱۵۱۶ء تا ۱۹۱۸ء) تک جاری رہے۔

سعودی حکومت اور شیعہ

اب ہم بیسویں صدی میں ہیں۔ یہ سلطانیٔ جمہور کی صدی ہے۔ اب حجاج اور جزار برسراقتدار نہیں ہیں۔ اب ہم میڈیا پر اپنی بات کہہ سکتے ہیں، انسان دوست لوگوں کی تعریف اور انسان دشمن لوگوں کی مذمت کرسکتے ہیں اور اپنا عقیدہ رکھنے میں آزاد ہیں۔ اب ہم ٹیلی کمیونی کیشن اور انفارمیشن کی اُس دنیا میں جی رہے ہیں جس میں انسان خلاؤں میں سیر کر رہا ہے اور چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ سائنسدان لوگوں کی زندگیاں آسان بنانے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ انھیں خوراک، لباس، رہائش اور سفر کے معاملے میں سہولتیں مہیا ہوسکیں تاہم سعودی حکومت اب بھی یہ چاہتی ہے کہ زندگی کا پہیہ آگے نہ بڑھے، انسانی تمدن آگے نہ بڑھے اور عقل وشعور ترقی نہ کرے بلکہ لوگ صحرا کے ماحول میں زندگی گزاریں۔

سعودی پہلے صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتے تھے، اونٹوں پر سفر کرتے تھے، اُن کا دودھ پیتے تھے، اُن کی پشم سے بنے کپڑے اور جوتے پہنتے تھے۔ وہ اپنے خیموں میں فرش پر بیٹھتے تھے اور مشکل زندگی گزارتے تھے سعودی صرف اپنی کزن اور قبیلے کی دوسری لڑکیوں سے شادیاں کرتے تھے۔ اب اُن کی زندگی بہر حال بدل گئی ہے۔ دور جدید میں پٹرول کی دریافت کے بعد آل سعود کے ہاں دولت کی ریل پیل ہوگئی ہے۔ اُن کی ایلیٹ کلاس اب الف لیلوی محلوں میں رہتی ہے۔ صحرانشین اب لمبی چوڑی ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں

سفر کرتے ہیں۔ اُن کے لئے ہر روز، روزِ عید اور ہر شب، شبِ برأت ہے۔ المختصر سعودیوں کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا ہے لیکن اس انقلاب کا تعلق صرف ان کی مادی زندگی سے ہے۔ یہ انقلاب ان کے ذہنوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ انھوں نے ابھی تک بدویانہ جہالت نہیں چھوڑی۔ ان کی ذہنیت اور ان کا اخلاق نہیں بدلا اور ان کے دل کشادہ نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح تنگ نظر ہیں۔ دیگر اقوام اور قبائل کے ساتھ آلِ سعود کے طرزِ معاشرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس معاملے میں وہ طرزِ کہن پر ہی اڑے ہوئے ہیں۔

اس سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ سعودی حکومت کی مادی اور معنوی زندگی میں ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ یا تو صحرا اور اونٹ ہونا چاہیے یا مہذب زندگی اور مہذب سوچ کیونکہ ذہنی تہذیب اور دنیاوی تہذیب کو جدا جدا کرنا تناقض کی دلیل ہے۔ سعودیوں کے جسم تو ''وال اسٹریٹ'' (نیو یارک) میں ہیں مگر اُن کے ذہن صحرائے ربع الخالی میں ہیں۔

ایک واقف حال دوست نے مجھے بتایا کہ سعودی عرب میں:

۱۔ اگر ایک شیعہ مدعی ہو تو اس کی گواہی قبول نہیں کی جاتی لیکن اگر کوئی شیعہ کے خلاف دعویٰ دائر کرے تو اس آدمی کی گواہی قبول کر لی جاتی چنانچہ شیعہ کو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو وہ جرمانہ وصول نہیں کرتا۔ اگر اُس کے خلاف اور اُس کے حق میں دی گئی گواہی رد کر دی جاتی تو اتنی تکلیف نہ پہنچتی جتنی اس بات سے ہے پہنچتی ہے کہ وہ شیعوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں اس لئے اُن کی گواہی قبول نہیں کرتے۔ وہ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ گواہ عادل ہونا چاہیے اور جب اُس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے تو اُس کی گواہی بھی ثابت ہو جاتی ہے خواہ ایک بدو ایک شہری کے خلاف گواہی دے البتہ حنبلی کہتے ہیں کہ ایک شہری کے خلاف ایک بدو کی گواہی نا قابلِ قبول ہے بجز اس کے کہ بدو نجدی اور شہری غیر

نجدی ہو۔[۱] جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ اَبٰی اِلَّا اَنْ لَا یُقْبَلَ لِاَوْلِیَآئِہٖ شَھَادَۃٌ فِیْ دَوْلَۃِ الظَّالِمِیْنَ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے کہ ظالموں کی حکومت میں اُس کے دوستوں کی گواہی قطعاً قبول نہ کی جائے۔

۲۔ سعودی عرب میں ایک سرکاری سنی جج کو دوسرے سرکاری ججوں کی طرح عدالت کا کمرہ، قالین، تنخواہ، مراعات اور اسٹیشنری سب کچھ ملتا ہے لیکن ایک سرکاری شیعہ جج کو ایسی کوئی چیز نہیں ملتی۔ وہ صرف نام کا جج ہوتا ہے جبکہ کویت، بحرین، عراق اور لبنان میں سنی اور شیعہ ججوں کو یکساں حقوق اور مراعات حاصل ہیں۔ سعودیوں کے اس عمل کو تعصب اور صحرائی سوچ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ سعودی عرب جو بہترین کام کرتا ہے وہ مسجدوں اور قبرستانوں کی دیکھ بھال اور مرمت ہے۔ اس پر وہ خطیر رقم صرف کرتا ہے لیکن یہ کارِ خیر سنی مساجد سے مخصوص ہے۔ شیعوں کی مسجدوں اور قبرستانوں کو کوئی مالی مدد نہیں ملتی حالانکہ مسجدیں اور قبرستان بلاشبہ اللہ، قرآن اور اسلام کے لئے ہیں۔ اے کاش! سعودی حکومت کوئی مدد نہ دیتی لیکن احساء کا قبرستان اور مسجد المطیرہ مسمار نہ کرتی۔

مسجد المطیرہ کے لئے اگرچہ شیعوں نے ضلعی حاکم ابن جلودی اور میونسپل کمیٹی سے باقاعدہ اجازت حاصل کی تھی اور اسے اپنے خرچ سے تعمیر کیا تھا لیکن سعودیوں نے یہ اجازت نامہ منسوخ کر دیا اور مسجد تعمیر ہو جانے کے بعد اعلان کیا کہ مَنْ ھَدَمَ لَبِنَۃً مِّنْہُ بَنَی اللّٰہُ لَہٗ قَصْرًا فِی الْجَنَّۃِ '' جو کوئی مسجد کی ایک اینٹ بھی اکھاڑے گا اللہ اُس کے لئے جنت میں ایک محل تعمیر کرے گا۔'' یہ سننا تھا کہ ''ایمان کی حرارت'' والے کدالیں اور پھاوڑے لے کر پہنچ گئے اور آن کی آن میں مسجد گرا دی۔

۱۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ مجھے اس بات سے خوف آتا ہے کہ ایک بدو کی ایک دیہاتی کے خلاف گواہی قبول نہ کی جائے۔ (میزان الشعرانی، باب شہادت۔ المغنی، ج ۹، ص ۶۷ المغنی حنبلی فرقے کی معتبر کتاب ہے)۔

۴۔ سعودی حکومت شیعہ مصنفین کی کتابیں درآمد کرنے کی اجازت نہیں دیتی حالانکہ یہ کتابیں دینی، تاریخی، ادبی اور فلسفی موضوعات پر لکھی جاتی ہیں اور اُن کا سعودی سیاست سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نیز سعودی عرب کے شیعہ مصنفین کے ساتھ توہین آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ اُن کا واحد قصور یہ ہے کہ وہ آل رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور ایسا وہ اللہ کے حکم کے مطابق کرتے ہیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہیں قوم کو تعلیم حاصل کرنے سے روکنا اس کی روحانی ترقی کو روکنے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بیشتر حکومتیں اور یونیورسٹیاں مختلف زبانوں میں کتابیں شائع کرتی ہیں اور تعلیم و تعلم کو خاص اہمیت دیتی ہیں۔ وہ طالب علموں کو وظائف دیتی ہیں اور تحصیل علم کے لئے دیار غیر میں بھی بھیجتی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اسرائیل کا ہداسا پرنٹنگ پریس یہ کتابیں عربی میں چھاپتا ہے لیکن سعودی حکومت ان کتابوں کو چھاپنے کی اجازت نہیں دیتی۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ "علم حاصل کرو چاہے چین ہی جانا پڑے۔" (بحار الانوار بحوالہ میزان الحکمہ)

امام علیؑ نے فرمایا ہے: "سب سے بڑا عالم وہ ہے جو اپنے علم کے ساتھ دوسروں کا علم بھی بڑھاتا ہے۔"

یہودی وغیرہ تو اس اسلامی اور انسانی حقیقت پر عمل کرتے ہیں لیکن وہ لوگ، جو دعویٰ کرتے ہیں کہ علم صحرائے نجد تک محدود ہے بالخصوص وہابیوں کا اور اس سے بھی بڑھ کر اُن کے متعصب امراء کا حصہ ہے، دوسروں کو کافر اور خود کو مومن تصور کرتے ہیں۔ یہ بات اُس واقعہ سے واضح ہو جائے گی جو ترکی کے ابراہیم پاشا اور درعیہ شہر کے وہابی اکابرین کے درمیان پیش آیا تھا۔ یہ واقعہ آگے بیان کیا جائے گا۔

اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ علم صحرائے نجد تک محدود ہے تب بھی اسلامی کتابوں پر پابندی کیوں لگائی جائے اور استعمار پسندوں کی چھاپی ہوئی کتابیں کیوں درآمد کی جائیں؟ سعودی بک شاپس میں مغرب سے درآمد شدہ واہیات رسالے

کھلے بندوں فروخت کیوں ہوں اور مجتہدوں کی کتابوں پر پابندی کیوں ہو؟

سعودی عرب میں ایسی کتابیں امپورٹ کیوں کی جاتی ہیں جو لوگوں کو فساد، کفر اور بے دینی کی طرف مائل کرتی ہیں اور انھیں فلسفۂ حیات کو سمجھنے سے باز رکھتی ہیں؟ سعودی حکومت نے رسالہ رایۃ الاسلام کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ مسلمانوں کے امام اور رسول اکرمؐ کی اولاد کی توہین کرے۔ اُس نے یہ فتویٰ کیوں چھاپا ہے کہ شیعوں کا خون حلال ہے۔ وہ لوگوں کو شیعہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے لئے کیوں اکساتا ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں؟ اس کے برعکس سعودی العرفان درآمد کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے جو پچھلے ۵۰ سال (اب تقریباً ۱۰۰ سال) سے استعمار اور بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔ نیز العرفان نے مسلمانوں اور عربی زبان کی بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ یہ اعتدال پسند رسالہ مشرق اور مغرب کے درمیان غیر جانبدار رہا ہے۔

العرفان فلسطین اور الجزائر کی آزادی کی حمایت کرتا ہے۔[1] اُس نے لوگوں میں آزادی کی جوت جگا دی ہے۔ اس کی سرکولیشن کیوبا، کانگو، لاؤس اور انگولا تک میں ہے لیکن سعودی عرب میں اس کی درآمد ممنوع ہے۔

کیا یہ اسلام کے مصائب میں سے نہیں کہ بحرین میں شیعوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک احساء اور قطیف میں شیعوں کے ساتھ سعودیوں کے سلوک سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ کیا بحرینی اور سعودی شیعوں میں یہ فرق اسلام کی بدنامی نہیں ہے؟ کیا احساء اور قطیف کے شیعہ یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ انھیں بھی بحرینی شیعوں کی طرح دینی فرائض اور مذہبی مراسم بجا لانے کی آزادی ہونی چاہیے

۱۔ یہ الجزائر کی جنگ آزادی کے زمانے کی بات ہے۔ ۱۹۶۲ء میں فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد محمد بن بیلا الجزائر کے پہلے وزیر اعظم بنے تھے۔
افسوس کہ فلسطین اب تک پنجۂ یہود سے آزاد نہیں ہوا ہے اور اُن پر اسرائیلیوں کے حملے روزانہ کا معمول ہیں لیکن بہادر فلسطینیوں کی تحریک انتفاضہ جاری ہے۔

کیا یہ بات باعث شرم نہیں کہ شیعوں کو اپنی مساجد اور قبرستان تعمیر کرنے کا حق نہ ہو اور انھیں یہ بھی اجازت نہ ہو کہ وہ اپنی پسند کے رسالے اور کتابیں پڑھ سکیں؟ میں یہ بات کہتے وقت استعمار اور مشرق و مغرب میں ان کے ایجنٹوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اُن پر بھی لعنت بھیجتا ہوں جنھوں نے مجھے یہ سب کچھ کہنے پر مجبور کیا ہے۔

آل سعود ''دین'' کے نام پر حکومت کرتے ہیں (وہ لوگوں کو وہابی بنانے کے لئے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کو نیز مدارس اور مساجد کو ہر سال اربوں ریال چندہ دیتے ہیں اور مفت وہابی لٹریچر تقسیم کرتے ہیں)۔ انھوں نے اپنے جھنڈے پر لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لکھ رکھا ہے لیکن شیعوں کے ساتھ اُن کا سلوک اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔[۱]

اگرچہ لبنان، عراق، ایران وغیرہ کے شیعوں کو ان باتوں کا علم ہے لیکن انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور یہ فرض کر لیا ہے کہ سعودی عرب میں

۱۔ No god but God کا مصنف رضا اسلان اپنی کتاب میں An Awakening in the East کے ذیل میں لکھتا ہے: ''محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کے سیاسی اور دینی اشتراک عمل نے جب حقیقت کا روپ دھارا تو ایک نئی داستان نے جنم لیا۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب محمد بن عبدالوہاب اور اُس کے پیروکار وہابیوں نے جزیرۃ العرب میں توڑ پھوڑ مچا رکھی تھی۔ وہ مقبرے گرا رہے تھے، مقدس درختوں کو کاٹ رہے تھے اور اُن مسلمانوں کو قتل کر رہے تھے جو وہابی عقائد کو بلا چون و چرا قبول نہیں کرتے تھے... وہابیوں نے دانستہ طور پر اپنی تحریک کا رشتہ اولین مسلم شدت پسند خوارج کے ساتھ جوڑا اور اپنے متشدد بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی اپنے دل کی بھڑاس اُن عناصر کے خلاف نکالی جن کو وہ مسلمانوں کی ناکامیوں کا ذمے دار ٹھیراتے تھے۔ حجاز پر اپنا کنٹرول مستحکم کرنے کے بعد وہ اپنا پیغام صوفی اور شیعہ کافروں تک پہنچانے کے لئے شمال کی طرف بڑھے۔ سن ۱۸۰۲ء میں عاشور کے مقدس دن وہابیوں نے کربلا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور دو ہزار شیعہ زائرین کو جو عزاداری میں مصروف تھے قتل کر دیا۔ غصے سے بے قابو وہابیوں نے علی (ع)، حسین (ع) اور اماموں کے مزارات میں توڑ پھوڑ کی۔ انھوں نے خاص طور پر دختر رسول فاطمہ (ع) کے مزار کو ویران کر کے اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کربلا کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد وہابیوں نے شمال یعنی میسوپوٹیمیا اور عثمانی سلطنت کے مرکز کی

شیعہ رہتے ہی نہیں۔ بلاشبہ ہمیں مشرق اور مغرب کے لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ سعودی حکومت ہمارے مذہبی بھائیوں کے ساتھ کیسا امتیازی سلوک کرتی ہے۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ وہابی امام احمد بن حنبل اور محمد بن عبدالوہاب کی پیروی کرتے ہیں اور محمد بن عبدالوہاب کا کہنا ہے کہ اسلام کے ارکان پانچ ہیں:

جانب پیش قدمی کی کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ خلیفہ کی توجہ حاصل کر سکتے تھے۔

۱۸۱۸ء میں مصری خدیو محمد علی (۱۸۴۹ء۔۱۷۶۹ء) نے عثمانی خلیفہ کی درخواست پر جزیرۃ العرب میں اسلحے سے لیس ایک بھاری لشکر بھیجا۔ مصری لشکر نے آسانی سے وہابیوں پر قابو پالیا کیونکہ وہ اعلیٰ تربیت یافتہ نہیں تھے اور اُن کے پاس جدید اسلحہ بھی نہیں تھا۔ اس طرح مکہ اور مدینہ ایک مرتبہ پھر ''شریف'' کے کنٹرول میں آگئے اور وہابیوں کو بزور بازو نجد میں دھکیل دیا گیا۔ مصری لشکر کے واپس جاتے جاتے سعودیوں نے یہ اہم سبق سیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے بل بوتے پر عثمانی سلطنت کو نہیں گرا سکتے۔ اس مقصد کے لئے سعودیوں کو وہابیوں سے بھی کہیں زیادہ مضبوط اتحادی کی ضرورت تھی۔

۱۹۱۹ء میں اُن کو Anglo Saudi Treaty کے ذریعے انگریزوں کو اتحادی بنانے کا موقع مل گیا۔ برطانیہ نے جو خلیج فارس پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے بیتاب تھا سعودیوں کی حوصلہ افزائی کی اور اُن سے کہا کہ وہ عثمانی کنٹرول سے نکل کر جزیرۃ العرب پر دوبارہ قبضہ کر لیں۔ اس بغاوت میں اُن کی مدد کے لیے برطانیہ انھیں برابر پیسہ اور اسلحہ دیتا رہا۔ ابن سعود کے جانشین عبدالعزیز (۱۹۵۳ء۔۱۸۸۰ء) کی کمان میں یہ برطانوی منصوبہ کامیاب ہوگیا۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر جب عثمانی سلطنت شکست و ریخت سے دوچار ہوگئی اور خلافت ختم ہوگئی تو ابن سعود نے مکہ اور مدینہ دونوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور شریف کو وہاں سے نکال دیا۔ چالیس ہزار آدمیوں کو سرعام قتل کرنے کے بعد اور ساری آبادی پر وہابیت مسلط کرنے کے بعد عبدالعزیز ابن سعود نے جزیرۃ العرب کا نیا نام المملکۃ السعودیۃ العربیۃ رکھ دیا نجد کے قدیم قبیلے اور اُن کے بنیاد پرست وہابی اتحادیوں نے خانہ کعبہ کا کنٹرول سنبھال لیا اور اُس کے کلید بردار بن گئے۔

اسی زمانے میں اُس مبارک سرزمین پر جہاں محمد (ص) نے خدا سے وحی کا تحفہ حاصل کیا تھا وہاں سعودیوں نے معجزانہ طور پر ایک اور خدائی تحفہ حاصل کیا۔ یعنی اس سرزمین پر تیل نکل آیا جس نے چھوٹے سے سعودی قبیلے کو عالمی معیشت میں خصوصی مقام دلا دیا۔ چنانچہ سعودیوں نے اپنے تئیں سمجھا کہ اب اُن پر خدا کی طرف سے یہ ذمے داری آپڑی ہے کہ وہ اپنے غیر تحریف شدہ اور بدعتوں سے پاک خالص توحیدی عقائد باقی دنیا تک پہنچائیں اور ہمیشہ کیلئے مسلمان عقیدے کو دینی اور گروہی انحراف سے بچالیں۔

اخوان المسلمین بڑے اچھے موقع پر سعودی عرب میں آئے تھے کیونکہ یہ وہ واحد ملک تھا جس میں

(۱) کلمہ شہادت (۲) نماز (۳) روزہ (۴) حج (۵) زکات

یہ پانچ ارکان وہی ہیں جن پر شیعہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ علمائے امامیہ بھی یہی کہتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج اور زکات کو ترک کرنے والا — اگر ترک کو جائز سمجھے تو — کافر ہے اور ان اعمال کی ادائیگی میں سستی کرنے والا فاسق ہے اور اپنی روش

لوگوں پر علماء کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور سعودی عرب ایک مطلق العنان وہابی ملک بن گیا تھا۔ یہاں جدیدیت پسند اور اسلام پسند کی بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مسلم دنیا میں نیشنل ازم، پان عرب ازم، پان اسلام ازم اور اسلامی سوشل ازم کی جو پرزور اور متاثر کن تحریکیں چل رہی تھیں اُن کا سعودی سلطنت میں نام ونشان تک نہیں تھا۔ وہاں صرف اسلامی بنیاد پرستی پر مبنی وہابی عقیدہ برداشت کیا جاتا تھا اس سے کسی طرح کا انحراف پوری قوت اور شدت سے کچل دیا جاتا تھا... مسلم دنیا میں جمال ناصر کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے شاہ سعود نے عسکریت پسند اخوان المسلمین سے ہاتھ ملا لیا۔ اس تنظیم میں مصر سے بیدخل کئے گئے اخوان کے علاوہ دیگر سیکولر عرب ممالک مثلاً شام اور عراق کے اخوان بھی شامل تھے۔ سعودیوں نے اخوان کو اپنے اپنے ملکوں میں نیشنل ازم کو کچلنے کے لئے دامے درمے سخنے ہر طرح کی امداد فراہم کی لیکن اخوان نے سعودی عرب میں "پناہ" سے بڑھ کر جو چیز حاصل کی وہ وہابیت تھی۔ اب وہ تنہا نہیں تھے...

۱۹۹۶ء کے موسم خزاں میں پشتون بولنے والے دینی طلباء کا انتہائی غریب، انتہائی قدامت پسند اور انتہائی ناخواندہ گروپ جو پاک افغان سرحدی علاقوں سے تعلق رکھتا تھا بغیر کسی مزاحمت کے کابل میں داخل ہوگیا۔ وہ اپنا مخصوص سفید جھنڈا لہرا رہے تھے جو کسی رنگ آمیزی سے پاک ہونے کی علامت تھا۔ ان طلباء نے اقوام متحدہ کے کمپاؤنڈ پر پتھراؤ کیا جہاں افغان صدر چھپا ہوا تھا۔ وہ اسے گھسیٹ کر سڑک پر لے آئے اور اسے مار مار کر ہلاک کر ڈالا اور صبح ہونے تک اُس کی لاش بجلی کے کھمبے پر لٹکا دی۔ اس خوفناک انداز میں طالبان نے پوری دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلایا۔ طالبان عالمی منظرنامے پر مسلم عسکریت پسندوں کے ساتھ نمودار ہوئے جو مجاہدین کہلاتے تھے اور CIA کی طرف سے مشرق وسطی اور مشرق بعید، وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا، شمالی اور مشرقی افریقہ میں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۲ء تک روسیوں کے قبضے کے خلاف افغان جہاد کے لئے بھرتی کئے جاتے تھے اور مسلح کئے جاتے تھے۔

یہ مجاہدین سعودی سرمائے سے پاکستان گئے جہاں انھوں نے ضیاء الحق کے بنیاد پرست رژیم میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کی اور سی آئی اے کے چیف William Casey کی نگرانی میں شاہ ولی اللہ کے جہادی نظریات اور انتہا پسند وہابی عقائد کی عملی تربیت حاصل کی۔

امریکا طویل عرصے تک اس "عظیم کھیل" میں وہابیوں کو اپنا اہم اتحادی سمجھتا رہا جو "بے خدا"

پر اصرار کرنے اور توبہ نہ کرنے والا واجب القتل ہے۔

المغنی کا مصنف (جلد ۸، ص ۱۳۲ پر) لکھتا ہے:

خوارج کئی صحابہ اور تابعین کو کافر سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اُن کا خون حلال اور اُن کا مال مباح ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ ایسے لوگوں کو قتل کرکے وہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے اس عقیدے کے باوجود فقہاء انھیں کافر نہیں سمجھتے کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُس میں اجتہاد کرتے ہیں۔ بنا بریں جو لوگ شیعوں کو کافر

کمیونزم کے خلاف کھیلا جارہا تھا۔ دراصل سعودی حمایت حاصل کرنے کے لئے امریکا نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے دولتمند سعودیوں مثلاً اسامہ بن لادن کی ہمت افزائی کی جو حکومت اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے تاکہ وہ افغان جہاد میں مالی مدد کریں۔ سی آئی اے اور امریکی صدر رونالڈ ریگن نے اُن لوگوں کو مجاہدین آزادی کا نام دیا۔ اس طرح ان غیر ملکی مجاہدین نیز افغانی اور پاکستانی طالبان نے نہ صرف روسیوں کو افغانستان سے جانے پر مجبور کر دیا بلکہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھیر دیا اور سرد جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ افغانستان میں امریکیوں کا مشن مکمل ہو چکا تھا لہٰذا فاتح مجاہدین پاکستانی عسکری تربیت، سعودی بنیاد پرستی اور امریکی اسلحہ لے کر اپنے اپنے ملک روانہ ہوگئے تاکہ وہ فلسطین، چیچنیا، مراکش اور انڈونیشیا میں اپنا جہاد جاری رکھ سکیں۔ طالبان بھی پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں اپنے گھروں کو لوٹ گئے جو پشتون علاقوں میں تھے تاکہ وہ اپنی مذہبی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ امریکا سرد جنگ جیت کر افغانستان سے نکل گیا اور افغانستان لاقانون جنگجو قبائلی سرداروں کے رحم وکرم پر رہ گیا جو اس ملک کو ایک مافیا کی طرح چلا رہے تھے۔ وہ لوگوں کو قتل کر رہے تھے، اُن پر تشدد کر رہے تھے اور اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے بلا امتیاز عورتوں کی بے حرمتی کر رہے تھے۔ ۱۹۹۴ء میں طالبان نے اپنے روحانی استاد ملا عمر کی قیادت میں پھر سے متحد ہونے کا فیصلہ کیا تاکہ افغانستان پر دوبارہ قبضہ کرکے اسے لڑتے بھڑتے جنگجو سرداروں سے واپس لے لیں۔ اس دفعہ پھر امریکا، سعودی عرب اور پاکستان نے اُن کی مدد کی۔ پاکستانی آئی ایس آئی کی مدد سے طالبان نے ۱۹۹۴ء میں اپنے آبائی علاقے قندھار کو فتح کرلیا۔ دو سال بعد انھوں نے شیعہ شہر ہرات پر قبضہ کرلیا اور ۱۹۹۶ء میں کابل بھی فتح ہوگیا۔ تقریباً ۷۵ فیصد ملک پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد انھوں نے رسوائے زمانہ وہابی تعلیم کے زیر اثر مسلم اور غیر مسلم مذہبی مقامات کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور تمباکو اور کافی کو ممنوع قرار دے دیا۔ لوگوں کو داڑھی رکھنے پر مجبور کیا، عورتوں کو خانہ نشین کر دیا اور ملک کی خاصی بڑی شیعہ اور صوفی آبادیوں کو (بامیان اور مزار شریف وغیرہ میں) قتل کر دیا۔

سمجھتے ہیں نیز خوارج جو کئی صحابہ اور تابعین کو کافر سمجھتے ہیں اور رضائے الٰہی کے لئے اُن کا قتل جائز سمجھتے ہیں اگر چہ میں ان کو کافر نہیں کہتا لیکن وہ غلطی پر ضرور ہیں۔

محمد بن عبد الوہاب اور ابن تیمیہ کو بھی کافر کہا گیا ہے۔ ابن تیمیہ کو اُس کے عقائد کی بنا پر قید کیا گیا تھا اور قید خانے میں ہی اسے موت آئی۔

اہل سنت نے پہلے بھی کہا ہے اور آج بھی کہتے ہیں کہ وہابیت، بدعت ہے اور اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ابن تیمیہ کے نظریات سلف (پہلی سے پانچویں صدی کے علماء) اور خلف (پانچویں صدی کے بعد کے علماء) دونوں سے جدا ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو سلف صالحین کا امین کہتا تھا۔ علمائے اہل سنت نے ابن تیمیہ کے نظریات کو مسترد کر دیا تھا اور اس پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ وہابیت ابن تیمیہ کے نظریات پر قائم ہے اور اسی کے نظریات کی اشاعت میں مصروف ہے۔

دور حاضر میں سعودی حکومت ابن تیمیہ کے افکار پھیلانے میں پیش پیش ہے اور سالانہ اربوں ریال خرچ کر رہی ہے۔

ابراہیم پاشا

شیعوں کی طرح وہابیوں نے بھی عقیدہ کی راہ میں سختیاں دیکھی ہیں۔ انھیں بھی قتل کیا گیا ہے۔ پیرے کربٹیس اپنی کتاب ابراہیم پاشا (صفحہ ۴۰، طبع ۱۹۳۷ء) میں لکھتا ہے: جب ابراہیم پاشا سعودیوں کو فتح کرتا ہوا نجد کے دارالحکومت درعیہ پہنچا تو تمام سعودی جرنیلوں نے اُس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس نے وہابی علماء کو بلوایا جن کی تعداد تقریباً پانچ سو تھی اور اُن سے کہا: تمہارا ایک وفد میرے ساتھ قاہرہ چلے اور وہاں سنی علماء سے مباحثہ کرے تاکہ پتا چل سکے کہ تمہارے اور سنیوں کے عقائد میں کیا فرق ہے۔

ابراہیم پاشا کے حکم سے دونوں فرقوں کے نمائندوں نے تین دن بحث کی اور دونوں مکاتب کے اختلافات کی نشاندہی کی۔ ان تین دنوں کے دوران ابرہیم پاشا خاموش بیٹھا اُن کی باتیں سنتا رہا اور سویا تک نہیں۔ چوتھے دن اُس نے بحث کا خاتمہ کرتے ہوئے وہابیوں کے شیخ سے کہا:

کیا تم یہ مانتے ہو کہ اللہ ایک ہے۔ سچا دین ایک ہے اور وہ تمہارا دین ہے؟

شیخ نے کہا: ہاں۔

پاشا نے کہا: سور! جنت کی وسعتوں کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟

شیخ نے کہا: یہ زمین و آسمان کی طرح وسیع ہے اور اسے متقین کیلئے بنایا گیا ہے

پاشا نے کہا: اگر جنت اتنی بڑی ہے تو تم اور تمہارے پیرو ایک درخت کے سائے میں رہو گے۔ اللہ نے باقی جنت کس کے لئے بنائی ہے؟

شیخ اور اُس کا طائفہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ابراہیم پاشا نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان کی گردنیں اڑا دو۔

مختلف مذاہب کے پیرو ہر وقت اور ہر جگہ اپنی مذہبی رسوم بجا لاتے ہیں تاوقتیکہ کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو اور سرکاری اداروں میں اُن کی ایک خاص حیثیت ہوتی ہے۔ تاہم سعودی حکومت میں یہ صورت نہیں ہے کیونکہ شیعوں کی توقعات کے برعکس جو لوگوں کے معاملات اور حکومت کی پالیسیوں میں دخل نہیں دیتے اُن کے لئے اپنی بہت سی مذہبی رسوم ادا کرنے کی ممانعت ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ بغض، کینہ اور خونریزی کی سیاست اب ختم ہونے کو ہے اور آزادی اظہار اور عقیدے کی آزادی کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ بلاشبہ فقط وہ حکومت قائم رہ سکے گی جو تمام شہریوں کی بہبود، حفاظت اور آسائش کے لئے کوشاں ہوگی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ دَوْلَةُ الْبَاطِلِ سَاعَةٌ وَ دَوْلَةُ الْحَقِّ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَةِ باطل حکومت عارضی ہوتی ہے لیکن حق کی حکومت قائم و دائم رہتی ہے۔

شیعہ اور استعمار

ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے پوچھتے رہتے ہیں کہ مسلمان ممالک ترقی کی دوڑ میں پیچھے کیوں ہیں اور تعلیم، سائنس وٹیکنالوجی میں امریکا اور یورپ کی ترقی کا راز کیا ہے؟ ہم یہ بھی پوچھتے رہتے ہیں کہ تمام عرب ممالک میں سعودی عرب علمی اور سائنسی میدان میں سب سے پسماندہ کیوں ہے؟

ہمیں اس ملک کے پسماندہ ہونے پر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کیونکہ یہ ملک خطے کے دیگر ممالک سے پہلے آزاد ہوا تھا اور حاجیوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہر سال یہاں آتی ہے۔ یہ حاجی جب واپس آکر ہمیں بتاتے ہیں کہ بھوکے ننگے لوگ ہر قدم پر اُن کا پیچھا کرتے ہیں تو ہم یہ باتیں باور نہیں کرتے۔ ہم انھیں کیوں باور کریں؟ تیل کے اُن کنوؤں کو کیا ہوا جو ظہران، فواز، سفائنہ اور ربع الخالی سے ابل رہے ہیں؟ اور دنیا بھر کے حجاج سے حاصل ہونے والی ساری دولت کہاں جاتی ہے؟ تاہم رایۃ الاسلام شمارہ ۵ (مورخہ یکم ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) کا مطالعہ کرتے ہی ہماری حیرت دور ہو جاتی ہے کیونکہ جب کسی چیز کی وجہ معلوم ہو جائے تو اُس کے بارے میں حیرت باقی نہیں رہتی۔ اس میگزین نے جو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض سے شائع ہوتا ہے ساری صورتحال واضح کر دی ہے۔

بلاشبہ کچھ بدترین خلائق علماء اور صحافی سعودی عرب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے حالات سدھارنے کی بجائے جو جہالت،

بیماری، بھوک اور افلاس میں زندگی بسر کر رہے ہیں سعودیوں کی دولت کی نمائش کرتے ہوئے بدوؤں کی جھونپڑیوں کے عین درمیان وارسا اور کریملین کی طرز پر عالیشان عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔

رایۃ الاسلام کے مذکورہ شمارہ میں ابراہیم جبہان کا ایک مقالہ چھپا ہے جس میں اس نے اسلامی فرقوں کو بدعتی قرار دیا ہے اور رہبران دین اور مجاہدین اسلام پر رکیک حملے کیے ہیں لیکن اُس نے حکومت سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ سیال سونے سے کمائے گئے اربوں ڈالر کہاں گئے؟ راک فیلر برادران کا سعودی عرب میں اتنا اثر نفوذ کیوں ہے؟ اور تیل کا سارا منافع "وال اسٹریٹ" کے کھاتوں میں جمع کیوں ہے؟ جبکہ غریب لوگوں کو اس کی اشد ضرورت ہے۔

جبہان نے جامع الازہر کے ریکٹر جناب شیخ محمود شلتوت پر کڑی تنقید کی ہے اور مسلمانوں کے دینی پیشواؤں کے بارے میں نازیبا زبان استعمال کی ہے۔ ہم ذیل میں اُس کے کچھ جملے نقل کریں گے اور پھر انھیں رد کریں گے۔

جبہان لکھتا ہے کہ "ہمارے اور شیعوں کے درمیان اختلاف" اصول دین" کے بارے میں ہے اور یہ اختلاف تمام اختلافات کی جڑ ہے۔"

اس طرح جبہان نے یہ تسلیم کیا ہے کہ وہ خدا و رسولؐ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ یہی وہ "اصول" ہیں جن پر شیعہ ایمان رکھتے ہیں یعنی توحید، رسالت اور قیامت۔ یہ "اصول دین" شیعوں کی ہزاروں کتابوں میں چھپ چکے ہیں اور ہر روز مسجد کے میناروں سے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه کہہ کر اس کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اگر جبہان اس عقیدے سے بیزار ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اُس کے بزرگ بھی اُسی کی طرح سوچتے تھے اور امام علیؑ سے نفرت کرتے تھے اور اُن کے دین سے بیزار تھے حالانکہ حضرت علیؑ کا دین وہی تھا جو اُن کے ابن عم سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین تھا۔ شیعہ حقیقی

مسلمان ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ خداوند عزوجل کی ذات پاک ہر قباحت سے پاک و پاکیزہ ہے۔ شیعہ وہ بات مانتے ہی نہیں جو کچھ مسلمان فرقے مانتے ہیں اور وہ اکابرین مانتے ہیں جنھیں وہابی مسلمانوں کا پیشوا سمجھتے ہیں۔ شیعہ یہ نہیں مانتے کہ ''خداوند قدوس کا کوئی کام (حتیٰ کہ ظلم) قبیح نہیں ہوتا۔ وہ نیکوکاروں اور پیغمبروں کو دوزخ میں ڈال سکتا ہے اور مشرکین کو جنت میں بھیج سکتا ہے۔'' شیعہ یہ نہیں مانتے کہ ''خدائی پیمانے کے حساب سے خدا کا قد سات وجب ہے۔ وہ یہ بھی نہیں مانتے کہ خدا گوشت اور خون کا بنا ہوا ہے۔ اور نہ یہ مانتے ہیں کہ طوفان نوحؑ کی وجہ سے خدا اس قدر رویا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر گئیں اور فرشتے اُس کی عیادت کو گئے۔'' شیعہ یہ بھی نہیں مانتے کہ خداوند سبحان ایک خوبصورت بچے کا ہم شکل ہے۔ وہ ہر شب جمعہ گدھے پر سوار ہو کر زمین پر آتا ہے اور بام خانہ سے ندا کرتا ہے: ''ہے کوئی توبہ کرنے والا؟''[1]

اس کے برعکس شیعہ رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ باتیں منسوب نہیں کرتے جو آپ کی رسالت، منزلت اور عظمت کے خلاف ہیں مثلاً نعوذ باللہ آپ سوتے رہے اور آپ کی نماز قضا ہو گئی، آپ نماز میں بھول جاتے تھے اور

۱۔ ایک وہابی عالم نے مجھ سے پوچھا کہ یہ بات کہاں لکھی ہے؟ جب میں نے اسے اُس کا ماخذ بتایا تو اُس نے کہا: ''اگرچہ اس کتاب کا مصنف سنی ہے لیکن وہ وہابی یا حنبلی نہیں ہے لہٰذا ہم اُس پر اعتماد نہیں کرتے۔ چنانچہ میں نے وہابیوں کی کتابیں دیکھیں۔ ابن تیمیہ نے رسالۃ العقیدۃ الوسطیہ میں ''فی سنت رسول اللہؐ'' کے زیر عنوان لکھا ہے:

''ہر رات جب ایک پہر گزر جاتا ہے ہمارا پروردگار آتا ہے اور کہتا ہے: ''ہے کوئی جو مجھ سے دعا کرے تاکہ میں اُس کی دعا قبول کروں۔ ہے کوئی جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اُسے عطا کروں۔ ہے کوئی جو مجھ سے مغفرت چاہے تاکہ میں اسے معاف کردوں۔'' پھر ابن تیمیہ لکھتا ہے: یہ متفق علیہ ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ لوگ مسلسل دوزخ میں پھینکے جاتے رہیں گے یہاں تک کہ دوزخ سے ھل من مزید کی آواز آئے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنا پاؤں دوزخ میں ڈال دے گا اور دوزخ کہے گی بس بس یہ کافی ہے۔ وہ لکھتا ہے: یہ متفق علیہ ہے۔ (مؤلف)

حبشیوں کا ناچ دیکھتے تھے یا گانا سنتے تھے۔[1]

۱۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اُن باتوں سے بہت زیادہ بلند ہے جو ہم اہل سنت کی تاریخ و حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں دیکھتے ہیں۔ یہی باتیں اسلام دشمنوں کے ترکش میں وہ تیر ہیں جو وہ گاہے گاہے چلاتے رہتے ہیں اور اسلام کے اور رسول اسلامؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کتابوں میں سے صرف ایک دو نمونے پیش خدمت ہیں۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ سے روایت ہے:

رسول اکرمؐ نے ہمارے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور نماز مکمل ہونے سے پہلے ہی نماز کا سلام پھیر دیا پھر آپ اٹھ کر مسجد میں موجود ایک تختے کی جانب چلنے لگے جس پر ٹیک لگا کر آپ خطبہ دیتے تھے... ذوالیدینؓ اٹھے اور کہنے لگے: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَنَسِیْتَ اَمْ قُصِرَتِ الصَّلٰوۃُ (یا رسول اللہؐ آپ بھول گئے ہیں یا نماز مختصر ہو کر دو رکعت ہو گئی ہے؟) رسول اکرمؐ نے فرمایا: نہ میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز مختصر ہوئی ہے۔ پھر آپ نے دوسروں سے پوچھا: کیا ذوالیدینؓ صحیح کہہ رہے ہیں کہ میں نے نماز کم پڑھائی ہے۔

''ایک دن رسول اکرمؐ مسجد میں تشریف فرما تھے، آپ نے ایک مسلمان کو قرآن مجید پڑھتے سنا تو فرمایا: خدا اس پر رحمت کرے۔ اس نے مجھے وہ آیات یاد دلا دیں جو میں بالکل بھول چکا تھا اور قرآن کے فلاں سورے سے ساقط کر دیتا تھا۔'' (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۳۳، ج ۶ ص ۱۹۳ مطبوعہ بولاق، مصر۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب الامر بتعھد القرآن)

صحیح بخاری، کتاب العیدین اور صحیح مسلم، کتاب صلاۃ العیدین میں ام المومنین بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ عید کا دن تھا۔ حبشہ کے کچھ لوگ خوشیاں منا رہے تھے اور مسجد میں اپنا مخصوص تلوار کا ناچ دکھا رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے مجھ سے پوچھا: کیا تم ان لوگوں کو ناچتے اور خوشی مناتے دیکھنا چاہتی ہو؟ میں نے کہا: جی! تب رسول اکرمؐ نے مجھے اپنے کندھے کا سہارا دیا اور اس حالت میں کہ میرا چہرہ اُن کے چہرے پر تھا حبشیوں کو مسجد میں تلوار کا رقص کرتے دیکھنے لگی۔ وہ ناچ رہے تھے اور میں دیکھ رہی تھی آنحضرتؐ بار بار فرما رہے تھے: اے حبشیو! ناچتے رہو۔ یہ ناچ کافی دیر تک جاری رہا اور میں بدستور آنحضرتؐ کے کندھے کے سہارے کھڑی رہی حتیٰ کہ تھک گئی۔ آنحضرتؐ کو میری تھکن کا احساس ہوا تو آپ نے پوچھا: کیا اتنا دیکھنا کافی ہے؟ میں نے کہا: ہاں! اس پر آپ نے فرمایا: اچھا تو جاؤ۔

ربیع بنت معوذ بن عفراء کہتی ہے کہ میری شادی کے دن رسول اکرمؐ ہمارے گھر تشریف لائے اور جو جگہ میرے لیے مخصوص تھی وہاں میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جو لڑکیاں وہاں موجود تھیں انھوں نے ڈھولک پر گانا شروع کر دیا۔ سبھی لڑکیاں وہ گیت گا رہی تھیں جو عام طور پر شادی بیاہ کے موقع پر گائے جاتے ہیں سوائے ایک کے جس نے یہ شعر گایا: فِیْنَا نَبِیٌّ یَّعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ (یعنی ہمارے درمیان ایک

جہان لکھتا ہے: "شیعوں کا اسلام حیلہ گر یہود کی نقل کے سوا کچھ نہیں ہے"[۱]

ہاں! ہاں! جہان کی نظر میں شیعہ برے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی سرزمین امریکا کے حوالے نہیں کی جو اسرائیل کا مائی باپ ہے اور جو اسے وجود میں لایا تھا۔

ایسا نبی ہے جو مستقبل کے واقعات کا علم رکھتا ہے)۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اس کو رہنے دو۔ وہی گاؤ جو گا رہی تھیں۔ (صحیح بخاری ج ۷، کتاب النکاح، باب ضرب دف)

"ایک دن مکہ میں زید بن عمرو بن نفیل رسول اکرمؐ اور زید بن حارثہ کے پاس سے گزرا تو وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے زید کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ زید نے کہا: بھتیجے! میں وہ چیز نہیں کھاتا جو بتوں کے لئے ذبح کی گئی ہو۔" سعید کا کہنا ہے کہ اس کے بعد نہیں دیکھا گیا کہ رسول اکرمؐ نے بتوں کے لئے دی گئی قربانی میں سے کچھ کھایا ہو۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۱، ح ۱۶۴۸۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۴۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب الذبائح، باب ما ذبح علی النصب والاصنام، ج ۳)

ایسی نازوا باتیں پہلے تو صرف اہل علم پڑھتے تھے لیکن اب ایسی باتیں صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل، مجمع الزوائد، سیرت ابن ہشام اور سیرت ابن اسحاق کے صفحات سے نکل کر مختلف زبانوں میں چھپنے والی رضا اسلان کی کتاب No god but God کے ذریعے پوری دنیا کے عوام پڑھ رہے ہیں۔

It was, the chroniclers say, "one of the hot days of Mecca" when Muhammad and his childhood friend Ibn Haritha were returning home from Taif, ...

Muhammad accepted this explanation without comment and opened his bag of sacrificed meat. "Eat some of this food, O my uncle", he said. But Zayd reacted with disgust." Nephew, that is a part of those sacrifices of yours which you offer to your idols, is it not?" Muhammad answered that it was. Zayd became indignant."I never eat of these sacrifices and I want nothing to do with them," he cried. " I am not one to eat anything slaughtered for a divinity other than God."...

The notion that a young pagan Muhammad could have been scolded for his idolatry by a Hanif flies in the face of traditional Muslim views regarding the Prophet's perpetual monotheistic integrity. (Page 16)

۱۔ تصوف میں شیخ جنید بغدادی اور فقہ میں امام احمد بن حنبل کے پیرو شیخ عبدالقادر جیلانی (۴۷۱ھ۔ ۵۶۱ھ) جو غوث اعظم اور پیران پیر کہلاتے ہیں اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں لکھتے ہیں: "شعبی کہتے ہیں کہ جس نے روافض سے محبت کی اس نے یہود سے محبت کی کیونکہ یہود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امامت آل داؤد کے لیے مخصوص ہے اور روافض کہتے ہیں کہ امامت علی بن ابی طالبؑ کی اولاد سے مخصوص ہے۔ یہود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسیح دجال کی آمد تک جہاد حرام ہے اور روافض بھی کہتے ہیں کہ جب تک ظہور مہدی کے لیے آسمان سے منادی کی ندا بلند نہ ہو اُس وقت تک جہاد حرام ہے۔

شیعہ اُس کی نظر میں اس لئے برے ہیں کہ وہ یہودیوں کو پیسہ اور اسلحہ فراہم نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کریں اور فلسطینیوں پر ظلم کریں۔

(کیا شیعہ اس لئے برے ہیں کہ ۲۰۰۶ء میں لبنان کی حزب اللہ نے مکتب عاشورا کے پروردہ سید حسن نصراللہ کی جرأت مند قیادت میں اسرائیل کو شکست فاش دے کر ساری عرب اور اسلامی دنیا کے دلوں سے امریکا اور اس کے بغل بچہ اسرائیل کا خوف نکال دیا ہے اور فلسطینیوں کو حوصلہ بخشا ہے)۔

کیا شیعہ اس لئے برے ہیں کہ انھوں نے اپنی سرزمین امریکا کو نہیں دی کہ وہ اسرائیل کی مدد کے لئے خفیہ فوجی اڈہ بنائے۔

کیا شیعہ اس لئے برے ہیں کہ وہ فرانس کے حمایتوں کے ساتھ مل کر الجزائر کے مسلمان عوام کے خلاف نہیں لڑے۔

جہان لکھتا ہے: اگر ہمیں سیاسی اتحاد کی ضرورت ہے تاکہ ہم سیاسی استعمار کا تختہ الٹ دیں تو اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری نہیں کہ ہم اپنے آپ کو دینی استعمار کے حوالے کر دیں اور دین کو "دلوں کے اتحاد" کا ذریعہ سمجھ لیں کیونکہ یہ خلا اُسی وقت پُر ہو سکتا ہے جب کچھ ایسے آدمی ہمارے ساتھ ہوں جو ہمارے مقاصد اور مشکلات میں ہمارے ہم نوا اور ہم قدم ہوں۔

جہان کا واحد مقصد امریکی آئل کمپنی Aramco کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مشرق و مغرب تک تمام مسلمان آرامکو کی اطاعت کریں۔ ہر وہ شخص جو اس کمپنی کے احکام نہ مانے وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اگر جہان کا مقصد آرامکو کی اطاعت کرنا نہیں ہے تو اُس نے کس بنا پر شیعوں کو کافر اور بدعتی قرار دیا ہے؟

کیا شیعوں نے ۱۹۲۰ء میں عراق میں انگریز استعمار کے خلاف جنگ نہیں لڑی؟ کیا وہ ہزاروں کی تعداد میں نہیں مارے گئے؟ کیا وہ لبنان میں فرانس کے خلاف

معرکہ آرائی میں شریک نہیں ہوئے؟ کیا اس کے نتیجے میں اُن کے گھر کھنڈروں میں تبدیل نہیں ہوئے؟ کیا وہ ۱۹۵۶ء میں پورٹ سعید پر حملے کے دوران شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہوئے اور کیا اُن میں سے کئی ایک جن کا تعلق نجف وغیرہ سے تھا مارے نہیں گئے؟ (کیا فرنگیوں کے خلاف تحریک آزادی میں اور تشکیل و تعمیر پاکستان میں شیعہ علماء اور عوام نے نمایاں حصہ نہیں لیا؟)

تاریخ گواہ ہے کہ شیعوں نے ہمیشہ جرم، ظلم، جبر اور استبداد کے خلاف جنگ کی ہے اور شیعہ ادب استبداد اور آمریت کے خلاف معرکہ آرائی سے بھرا پڑا ہے۔ اُن کی فقہ اور اصول دین پر لکھی گئی کتابوں میں جابر اور آمر حکمرانوں کے خلاف معرکہ آرائی کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

بلاشبہ شیعہ وہ عقیدہ نہیں رکھتے جو جبہان اور رایۃ الاسلام کی انتظامیہ کا ہے شیعہ اُن کی طرح یہ نہیں کہتے کہ حکمران خواہ کتنے ہی ظالم کیوں نہ ہوں اُن کے خلاف اٹھنا جائز نہیں ہے۔ (المذاهب الاسلامیه از ابوہریرہ، ص ۱۵۵، طبع اول)

جبہان جامع الازہر کے ریکٹر جناب شیخ شلتوت سے کہتا ہے: اللہ سے ڈرو اور اپنے آپ کو اور اسلامی ممالک کو معرض خطر میں نہ ڈالو کیونکہ جھوٹ کے خلاف جھوٹ سے نہیں لڑا جاسکتا اور مذہبی منافقت کو سیاسی منافقت سے ختم نہیں کیا جاسکتا

جبہان کے مطابق شیخ شلتوت جھوٹے ہیں، منافق ہیں اور اُن کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے امت مسلمہ کو اخوت و اتحاد کی دعوت دی ہے تاکہ مسلمان مل کر استعماری طاقتوں اور ذخیرہ اندوز کمپنیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں اور اپنی اقتصادیات کی حفاظت کریں لیکن وہ خود مومن ہے کیونکہ اُس کا مقصد مسلمانوں کی طاقت تباہ کرنا اور انھیں منتشر کرنا ہے تاکہ مارکسزم یا یہودیت کے پھیلنے کے لئے میدان ہموار ہوجائے اور وہ عرب (اور اسلامی) ممالک کو اپنے زیرنگیں لاسکیں۔ شیخ شلتوت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور اس مقصد کے

لئے انھوں نے جامع الازہر کے نصاب میں شیعہ فقہ کی تعلیم کو بھی شامل کرلیا ہے۔ یہ اقدام انھوں نے شیعوں کی خاطر یا شیعہ عقیدے کی توسیع کی خاطر نہیں کیا اور نہ ہی نجف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے اور وہاں کے علماء سے دوستی پیدا کرنے کے لئے کیا ہے۔ انھوں نے یہ اقدام الازہر، اسلام اور مسلمانوں کی خاطر کیا ہے۔

شیخ شلتوت نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ وہ دین کا درد رکھتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص تھے۔ تاہم جبہان نے جو کچھ کہا ہے ڈالروں کی خاطر کہا ہے اور مسلمان ملکوں کو بیچنے کے لئے کہا ہے (اور مذہبی اختلافات پیدا کرنے کا طریقہ استعمال کیا ہے) منافقوں پر اللہ کی لعنت ہو۔

جبہان لکھتا ہے: شیعوں کے جھوٹے صادق جیسا شخص یا وہ جو اُس کی پیروی کرتا ہے یا اس کے مذہب کی طرف توجہ دیتا ہے یا شیعوں کے جھوٹے صادق سے منسوب تمام یا کچھ احمقانہ روایات کو صحیح سمجھتا ہے کافر ہو جاتا ہے۔ اس پر لعنت بھیجنا اور اسے ایذا دینا واجب ہے۔

خدایا! ان کافروں پر اپنی لعنت اور اپنا غضب نازل فرما جو اتنے جری ہو گئے ہیں کہ تیرے اولیاء اور تیرے دین کے حامیوں اور تیرے رسولؐ کی عترت کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اور ان سے جھوٹی باتیں منسوب کرتے ہیں۔

خدایا! آرامکو، صیہونی پارٹی، استعمار گروں اور ان کے حامیوں پر اپنا غضب نازل فرما۔ اگر جبہان حضرت امام جعفر صادق علیہ الصلوۃ والسلام کو (معاذ اللہ) جھوٹا کہتا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ اُس سے پہلے اُس جیسی فطرتی لوگوں نے سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہتان لگائے تھے۔

رسول اکرمؐ مشرکین مکہ سے فرمایا کرتے تھے: قُولُوا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا "کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تاکہ تم نجات پاؤ" لیکن ابولہب آپ پر پتھر پھینکتا تھا اور کہتا تھا: محمد (ص) کی باتوں پر دھیان نہ دو۔ یہ جھوٹے ہیں۔

ہمارا زمانہ زمانہ رسولؐ کی مانند ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے نانا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مانند ہیں اور جیہان ابولہب کی مانند ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: (اے رسول) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی ان رسولوں کو جھٹلایا گیا تھا جو واضح نشانیاں، صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۸۴)

امام جعفر صادقؑ نے قرآن مجید کی تفسیر اور اپنے نانا کی احادیث کو منطقی استدلال اور ثبوت کے ساتھ عام کیا لیکن وہ لوگ جو خدا و رسولؐ کے دشمن ہیں امام کے بارے میں وہی باتیں کہتے ہیں جو اُن کے نانا کے متعلق کہتے تھے۔

ابن حجر اپنی کتاب **صواعق محرقہ** میں لکھتا ہے:

لوگوں نے امام جعفر صادقؑ سے اتنی علمی باتیں نقل کیں کہ کاروان علم اسے اپنے ساتھ شہر بہ شہر لے گیا اور علم کی یہ شاخیں تمام شہروں میں مشہور ہو گئیں۔

شہرستانی اپنی کتاب **الملل والنحل** میں لکھتا ہے:

امام جعفر صادقؑ دین، ادبیات، حکمت اور زہد کا وسیع علم رکھتے تھے۔

امام ابوحنیفہ سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟

انھوں نے جواب دیا: امام جعفر صادق (علیہ السلام)۔

امام جعفر صادقؑ کے فضائل، عظمت اور علم کے بارے میں روایات اور اُن کی اسلام کے لئے خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ خدا و رسولؐ کے دشمنوں کی نظر میں اُن کا واحد قصور یہ ہے کہ ان کا علم قرآن مجید پر مبنی تھا اور وہ ہمیشہ مسائل اسلام پر بحث کرتے تھے۔ لہٰذا اُن پر حملہ کرنا قرآن مجید پر حملہ ہے اور انھیں جھٹلانا اسلام کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

مقالے کے آخر میں جیہان لکھتا ہے: ''وہابی علماء کو جاننا چاہیے کہ وہ اسلامی مشن اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتے ہیں جب وہ اُن باتوں کو چھوڑ دیں جو انھیں اسلام کے قریب لاتی ہیں۔''

ان سطور سے ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ اس گفتگو سے اس خطرناک مقالہ نویس کا اصلی مقصد کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شیعوں کی وہ قلیل تعداد جو حجاز اور قطیف میں باقی رہ گئی ہے ختم ہو جائے۔ لہٰذا ہر مسلمان پر اور بالخصوص شیعہ علماء پر اور سب سے بڑھ کر نجف اور ایران کے عالی قدر مراجع پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس مقالے کی اشاعت پر احتجاج کریں اور جس طرح بھی ممکن ہو اس میگزین کی انتظامیہ کا اور اُن لوگوں کا جنھوں نے یہ مقالہ چھاپنے کی اجازت دی ہے محاسبہ کریں اور اُن سے پوچھیں کہ انھوں نے ایسا زہریلا مواد کیوں چھپنے دیا۔ یوں وہ صیہونی قوت اور مارکسزم اور آرامکو کے منصوبوں کا سدباب کریں جو دین اسلام کے نام پر تفرقہ پھیلا رہے ہیں۔

میں نے نجف اور قم کے علماء کو اس صورتحال سے آگاہ کیا تھا اور انھوں نے بلاشبہ معاملے کی سنگینی کا احساس کیا اور اپنا فرض ادا کیا۔

جہاں تک جبل عامل کے لبنانی علماء کا تعلق ہے انھوں نے شاہ سعود کو احتجاجی مراسلے بھیجے۔ وہ بیروت میں واقع سعودی سفارت خانے بھی گئے اور انھوں نے اخباروں میں اور مجلسوں میں اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی کیا۔

یہ نفرت کا اظہار اُس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک سعودی حکومت مجرموں کے ہاتھ روک نہ دے اور ایسے کاموں کے برے نتائج کا سدباب نہ کر دے۔ بہر حال اس میں کوئی کلام نہیں کہ اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

سفیانی کتاب

قاہرہ — جہاں تیس ہزار علماء اور دینی طلباء جامع الازہر میں قرآن وحدیث کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، انھیں حفظ کرتے ہیں اور دیگر ممالک کے لوگوں کو اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کے اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔

وہی قاہرہ جس کے دانشور دین وملت کے خلاف کام کرنے والی شیطانی طاقتوں سے لوگوں کو چوکنا کرتے ہیں اور اُن کے اتحاد کے فروغ کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور انھیں دیانتدار اور حکومت کا فرمانبردار بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔

وہی قاہرہ جو عرب معاشرے کا مرکز ہے اور خود کو عربوں اور عرب شہروں کا محافظ سمجھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ عربی بولنے والا ہر عرب اُن کی روحانی اور مادی قوت سے فائدہ اٹھائے۔

وہی قاہرہ جہاں ایشیائی اور افریقی تنظیمیں استعمار کے فوجی اڈوں اور جارحانہ معاہدوں کے خلاف احتجاجی جلسے کرتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ نسلی امتیازات اور قبائلی تعصبات کو مٹا کر اسلامی ممالک کی آزادی کی راہیں تلاش کریں۔

اسی قاہرہ میں ۱۹۵۹ء میں یعنی اسرائیل کے فلسطین پر قبضے اور پورٹ سعید پر حملے کے بعد ایک کتاب ابوسفیان شیخ الاموین چھپی تھی۔

مستشرقین اور استعمار کے مقاصد

جدید استعمار نے مال واسباب لوٹنے، قوموں کا خون چوسنے، منڈیوں پر

اجارہ داری قائم کرنے، حب الوطنی کے جذبات کو کچلنے اور قومی یادگاروں کے دفاع کی قوت ختم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے جو کچھ بھی اسلام میں مقدس ہے اُس پر حملہ کیا ہے۔ انھوں نے ہمارے عقیدے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں اور ہماری تاریخ اور تہذیب کو معیوب قرار دیا ہے۔ اس غلط راہ پر وہ لوگ چلے ہیں جنھوں نے مکروفریب کے مکتب میں تعلیم پائی ہے اور جنھوں نے مختلف قوموں کے خلاف منصوبے تیار کرنے کی کافی مشقیں کر رکھی ہیں۔

سامراج نے طے کیا ہے کہ وہ کوئی اور کام کرنے سے پہلے اسلام اور اُس کی تاریخ پر حملہ کریں چنانچہ انھوں نے قرآن مجید، رسول اکرمؐ اور ائمہ علیہم السلام پر جو مسلمانوں کی آزادی واستقلال اور عظمت کا قلعہ ہیں حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس سلسلے میں انھوں نے پہلے قدم کے طور پر کچھ لوگوں کو مستشرقین کے نام سے فنڈز دیکر سرزمین مشرق میں بھیجا۔ بظاہر انھیں عربوں کی زبان، تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ قوم کو گہری نیند سلانے کے لئے آتے ہیں۔ اُن کا مقصد اسلام پر اعتراض کرنا اور اس کی توہین کرنا ہوتا ہے۔ اپنے منحوس منصوبوں کے ذریعے وہ ملت کے مختلف فرقوں کے دلوں میں کدورتیں پیدا کرتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں۔

مستشرقین نے اپنا یہ مشن پورے خلوص سے انجام دیا۔ انھوں نے سینکڑوں ضخیم کتابیں شائع کی ہیں اور قرآن مجید پر بحثیں کی ہیں۔ انھوں نے آیات قرآن کی تشریح کی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ علمی تحقیق اور آزادانہ بحثوں پر مبنی ہے۔ ان مستشرقین نے قرآن مجید کے تمام پہلوؤں پر رائے زنی کی ہے یہاں تک کہ انھوں نے حروف مقطعات کی تشریح بھی کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ حروف مقطعات میں رسول اکرمؐ کے اُن صحابہ کے ناموں کی طرف اشارہ ہے جن کے پاس قرآن مجید تھا مثلاً الٓمٓ میں "م" کا اشارہ مغیرہ بن شعبہ کی طرف ہے

طسٓ میں "س" کا اشارہ سعد بن ابی وقاص کی طرف ہے، کٓھٰیٰعٓصٓ میں "ھ" کا اشارہ ابوہریرہ کی طرف ہے اور نٓ والقلم میں "ن" کا اشارہ عثمانؓ بن عفان کی طرف ہے اور یہ تمام صحابہ حافظ قرآن تھے۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرتے تھے جیسا کہ سورۂ یونس میں آیا ہے: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ ایمان لے آئیں۔[1] (آیت ۹۹)

مستشرقین کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اپنے غلام زید بن حارثہؓ کی بیوی (زینبؓ بنت جحش) ان سے زبردستی چھین لی تھی۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ (معاذ اللہ) گمراہ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ہم نے تمھیں گمراہ پایا تو سیدھے راستے کی طرف تمہاری ہدایت کی۔ (سورۂ ضحیٰ: آیت ۷) اس آیت میں مستشرقین نے لفظ ضَآلًّا کا ترجمہ "گمراہ" کیا ہے حالانکہ اس کے معنی "متحیر ہونا" ہے۔

الختصر مستشرقین یہ خرافات لکھ کر اسلام کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ (جو لوگ غیر ملکی چھاپ دیکھ کر کتابیں خریدنے کے شوقین ہیں وہ دراصل درخشندہ اسلامی حقائق غیروں سے جاننا چاہتے ہیں اور چونکہ مستشرقین اپنے مقصد کو بھولے نہیں ہیں اس لئے وہ اسلام کو الٹا پیش کرکے ایک طبقے کو گمراہ کر دیتے ہیں)

یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ اسلام اور رسول اسلامؐ کے دشمن جو ہمارے دین سے نابلد ہیں اور اپنے آپ پر مغرور ہیں ہمارے دین میں تحقیق کرکے ہمیں بتائیں کہ کون سی چیز ہمارے لئے مقدس ہے اور وہ آکر ہمیں ہماری تاریخ بتائیں اور ہماری تہذیب سکھائیں۔ (یہی حماقت ہالینڈ کے Greet Wilders نے قرآن مجید کے بارے میں "فتنہ" فلم بنا کر کی ہے)۔ اس اقدام کے بعد صحابہ اور تابعین کی کیا

۱۔ میں نے اس سلسلے میں ایک کالم العرفان شمارہ اول سال ۱۹۵۹ء میں لکھا تھا۔ (مؤلف)

ضرورت رہ جائے گی؟ اسلام کے فقہاء اور مؤرخین کی کیا ضرورت رہ جائے گی؟ فلاسفہ اور متکلمین نے جو کچھ کہا ہے اُس کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی؟ کیا ہم اُن سب کو بھول جائیں اور اپنے دینی اور تہذیبی علوم مستشرقین سے سیکھیں؟

مستشرقین اس قدر مجرمانہ ذہنیت کے حامل ہیں کہ وہ کہتے ہیں:

"محمد (ص) نے عیسائی اور یہودی علماء سے تعلیم حاصل کی" اور "محمد (ص) مشرکین کے ساتھ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔"

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب رسول اکرمؐ مجبور تھے تو وہ اپنے دین کو دین رحمت قرار دیتے تھے اور خون نہیں بہاتے تھے لیکن جب انھوں نے کچھ مہاجرین اور انصار اپنے گرد جمع کر لئے اور دولت و طاقت حاصل کر لی تو وہ اپنا رسالت کا مشن بھول گئے اور خونریزی اور لوٹ مار میں لگ گئے۔ (نعوذ باللہ)

یہ ہیں وہ الزامات جو مستشرقین لگاتے ہیں۔ تاہم اسلام اور رسول پاکؐ اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ اگر تمام جن و انس اور مستشرقین اور استعمار ایک دوسرے کی مدد کے لئے جمع ہو جائیں تب بھی وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

استعمار اور حفناوی

چونکہ اکثر مسلمان ان مستشرقین کے اس منصوبے کو بھانپ گئے اس لئے وہ اپنے اس منصوبے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ایسے ملت فروش ایجنٹ کی تلاش شروع کر دی جو بظاہر تو مسلمان اور عرب ہو لیکن اپنے دین اور عربوں کو شیطان کے سرمائے کے عوض بیچنے پر تیار ہو۔ استعمار نے جب حفناوی کو "برائے فروخت" دیکھا تو بہت خوش ہوا اور اُس نے اسلام میں تحریف کرنے کا کام اُس کے سپرد کر دیا۔ اُس نے اسے بتایا کہ دینی پیشواؤں کی توہین کرنی چاہیے اور سمجھا دیا کہ یہ کام کس طرح انجام دینا ہے۔ حفناوی نے استعمار کا منصوبہ اپنی ایک کتاب میں شائع کیا جس کا نام اُس نے

ابوسفیان شیخ الاموین رکھا۔ (آج کل استعمار اپنے ایجنٹوں کے ذریعے شیعوں کی مضبوط دفاعی لائن "مرجعیت" کو کمزور کرنے کے لئے خوب پیسہ خرچ کر رہا ہے کیونکہ اُس نے دیکھ لیا ہے کہ مرجعیت "ایک عظیم انقلاب" کا سرچشمہ بن سکتی ہے چنانچہ اُن ایجنٹوں نے ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ سیدھے سادھے عوام اُن کے پروپیگنڈا سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ملا امین استر آبادی کی پھیلائی ہوئی اخباریت کو سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے دفن کر دیا تھا لیکن اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ میں اُس آدمی کی فکر و نظر پر نثار جو مسائل کو "کشف" کرنے میں اتنی سی بات نہیں سمجھ سکا کہ رسولؐ اور امام اپنے اپنے زمانے میں واحد "مرجع" ہوتا ہے اور تقلید کا موضوع حضرت ولی عصر روحی لہ الفداء کی غیبت کبریٰ کے زمانے سے متعلق ہے۔

یہ نظر نظر کے چراغ ہیں　　کہیں جل گئے کہیں بجھ گئے

نیز استعمار شیعوں میں علی اللّٰہی فرقہ بنانے کی سازش کر رہا ہے جیسا کہ برطانوی جاسوس ہمفرے نے اپنی کتاب Ideal Colonization میں اعتراف کیا ہے)۔

۱۔ امام علیؑ پر الزام تراشی

حفناوی امام علیؑ کی بدگوئی کرتا ہے کیونکہ انھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا، اُس کی پیشرفت کے لئے جان کی بازی لگائی تھی اور خندہ پیشانی سے اسلام کی خاطر ہر مصیبت برداشت کی تھی نیز پہلی وحی سے آخری دم تک اپنی تلوار اور زبان سے رسول اکرمؐ کی اعانت کی تھی۔ آپ جنگ احد میں ایک چٹان کی مانند جمے رہے تھے اور آپ نے رسول اکرمؐ پر حملہ کرنے والوں کو مار بھگایا تھا جبکہ دوسرے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ جنگ خندق میں تمام مسلمانوں کے دل عمرو بن عبدود کے خوف سے دہل گئے تھے لیکن امام علیؑ کا دل فولاد سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ عمرو بن عبدود کو جو ضرب حیدری لگی تھی وہ اتنی اہم تھی کہ رسول اکرمؐ

نے فرمایا تھا: خندق کے دن علیؑ کی لگائی ہوئی ایک ضرب قیامت تک کے انسانوں اور جنوں کی عبادتوں سے افضل ہے۔ خیبر جب دوسروں سے فتح نہ ہو سکا تو رسول اکرمؐ نے علم امام علیؑ کو عطا فرمایا جو خدا اور اُس کے رسولؐ کے محبوب تھے اور انھوں نے خیبر کا معرکہ خدا اور مسلمانوں کے لئے جیت لیا۔

امام علیؑ نے مشرکین کے خلاف نیز جمل و صفین و نہروان کی لڑائیاں لڑیں۔ امام علیؑ قرآن کی تنزیل اور اُس کی تاویل کے لئے لڑے۔ آپ ہی کے متعلق رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا: "علیؑ کل ایمان ہیں۔"

امام علیؑ نے جو جنگیں لڑیں اور جو جہاد کیا اس کے باوجود حفناوی کہتا ہے کہ علیؑ کو جہاد سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا کیونکہ صحیح جہاد وہ ہوتا ہے جو رائے اور زبان سے ہو اور عمرؓ کی زبان اور ابوبکرؓ کی رائے کے مقابلے میں علیؑ کے جہاد کی کوئی قیمت نہیں۔ (ص ۱۹۰) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حفناوی کی بات درست ہے تو پھر اس سوال کا کیا جواب ہوگا کہ جب مشرکین نے جو ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس تھے بدر، احد اور خندق کی جنگیں ابوسفیان کی سرکردگی میں رسول اکرمؐ کو قتل کرنے کے مقصد سے لڑیں تو کیا آنحضرتؐ کو عمرؓ کی زبان یا ابوبکرؓ کی رائے نے بچایا یا امام علیؑ کی تلوار نے آنحضرتؐ کا دفاع کیا تھا؟ کیا اسلام کی مدد مسند حکومت پر بیٹھنے اور رائے ظاہر کرنے سے ہوتی ہے یا اس کے لئے ثابت قدمی، جرأت اور دلاوری سے جنگ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؟

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی:

"اے پروردگار! اُس سے محبت کر جو علیؑ سے محبت کرے اور اس سے دشمنی رکھ جو علیؑ سے دشمنی رکھے۔ اُس کی مدد کر جو علیؑ کی مدد کرے اور اسے رسوا کر جو علیؑ سے دغا کرے۔" احادیث رسولؐ اس بات کی دلیل ہیں کہ "واضح ثبوت" حفناوی کی نظروں سے اوجھل ہیں (کیونکہ اللہ کا دشمن واضح چیزیں نہیں دیکھ سکتا)۔

اگر صرف تقریر کرنا اور رائے دینا مفید ہوتا تو فلسطین نہ چھنتا اور اگر تقریر اور رائے کا اظہار مؤثر ہوتا تو حفناوی اور اُس جیسے لوگوں کی موجودگی کے باوجود عرب صدیوں پیچھے نہ رہ جاتے۔

۲۔ اسلامی مأخذ پر نکتہ چینی

استعمار نے حفناوی کو حکم دیا ہے کہ وہ اسلامی مأخذ بالخصوص کتب تاریخ پر کڑی تنقید کرے۔ اسلام کے حقائق کو سمجھنے کے لئے قدیم تاریخی کتابیں سب سے زیادہ معتبر اور مستند مأخذ ہیں۔ وہ مسلمانوں کی قربانیوں کے بارے میں بتاتی ہیں جن کے اخلاق، اعتقادات اور تعلیمات کی بدولت اسلام دور دور تک پھیل گیا اور مختلف قوموں کو غلامی سے نجات ملی۔ چونکہ استعمار اور استعماری ایجنٹ اسلام کی عظیم قوت کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اس لئے انھوں نے اپنے ناپاک حملوں کا رخ حفناوی کے ذریعے کتب تاریخ کی طرف موڑ دیا ہے۔

حفناوی کہتا ہے: قدیم اور جدید کتب تاریخ میں سے بیشتر درست نہیں ہیں۔ بہت سے گزشتہ مؤرخین نے عرب تاریخ سابق رومیوں سے مستعار نقل کی ہے جو معتبر نہیں ہے۔ حفناوی کی نگاہ میں مؤرخین کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ اُن کا تعلق ظہور اسلام کے قریبی زمانے سے تھا اور انھوں نے اسلامی واقعات چشم دید گواہوں سے سن کر لکھے تھے۔

بلاشبہ حفناوی کے نزدیک اگر قدیم یا بعد میں آنے والے مؤرخین اہل بیتؑ کو برا بھلا کہیں تو وہ سچے ہیں اور وہ مؤرخین جو اہل بیتؑ پر اعتراض نہ کریں اور اُن کی بدگوئی نہ کریں وہ جھوٹے ہیں۔

اگر ہم قدیم اور جدید اسلامی مأخذ کو نظر انداز کر دیں تو مسلمانوں کے پاس کوئی معقول مواد باقی نہیں بچے گا۔ یہی چیز تو استعمار چاہتا ہے۔ اُس کی خواہش

ہے کہ اسلامی مأخذ کالعدم ہو جائیں۔ تاہم حفناوی نے ایک معتبر مأخذ دریافت کیا ہے جسے وہ اہل بیتؑ کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ وہ مأخذ مستشرقین کی کتابیں ہیں جن میں ہمارے دین اور وطن کے دشمنوں کے اقوال درج ہیں۔ حفناوی زیادہ تر ایک جرمن مستشرق کارل بروکلمان Carl Brockelmann کی باتیں نقل کرتا ہے۔ مثلاً بروکلمان اپنی کتاب تاریخ الشعوب الاسلامیہ جلد اول میں لکھتا ہے:

''اسلامی اقوام چاہتی ہیں کہ وہ اپنے رسولؐ کو ایک عظیم شخصیت بنا کر پیش کریں مگر ہمارے پاس قرآن کی اس ایک آیت اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی کے سوا کوئی معتبر شہادت نہیں جس سے رسول اکرمؐ کی ماقبل رسالت کی زندگی معلوم ہو سکے۔ بروکلمان کو اس آیت کے سوا کوئی معتبر مواد نہیں مل سکا اور اگر اس آیت میں لفظ ضَآلًّا کا لفظ نہ ہوتا جس کے معنی وہ ''گمراہ'' کرتا ہے تو اسے رسول اکرمؐ کی سوانح حیات کے بارے میں کوئی مواد دستیاب نہ ہوتا۔

وہ کہتا ہے ''رسول اللہ (ص) نے اپنی گفتگو میں تاجرانہ طریقے اور مثالیں استعمال کیں۔'' (مثلاً رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ فلاں نیکی کا ثواب ستر گنا ہے) اُس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا دماغ (راک فیلر اور فورڈ کی طرح) کاروباری تھا۔

بروکلمان لکھتا ہے: ''روایت کی گئی ہے کہ محمد (ص) کے عیسائیوں اور یہودیوں سے روابط تھے۔'' نیز یہ کہ ''محمد (ص) اپنی راتیں عیسائی راہبوں کی طرح نمازوں اور مناجاتوں کے ساتھ ختم کرتے تھے اور تورات کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کا علم سطحی تھا اور انھوں نے کئی جگہ غلطی کھائی ہے۔''

''پیغمبر اسلامؐ نے اپنے عیسائی اساتذہ سے بچوں کی انجیل، اصحاب کہف اور سکندر (ذوالقرنین) کے قصے پڑھے تھے لیکن انھوں نے اُن میں ترمیم کر دی۔''

حفناوی کے لئے بروکلمان کا یہ کہنا ایک قطعی ثبوت ہے کہ رسول اکرمؐ نے

یہودیوں اور عیسائیوں کو دھوکا دیا اور اُن سے اصحاب کہف اور سکندر وغیرہ کے قصے حاصل کر کے قرآن میں بدل ڈالے لیکن اُس کے نزدیک اسلامی مآخذ اور تاریخ پر لکھی گئی مسلمان مؤرخین کی کتابیں صحیح تاریخ بیان نہیں کرتیں۔

بروکلمان جس پر حفناوی نے مسلسل انحصار کیا ہے کہتا ہے: "اپنی بعثت کے ابتدائی سالوں میں محمد (ص) کعبہ کی تثلیث پر ایمان رکھتے تھے۔" (ص ۳۷)

بروکلمان کے کہنے کا مطلب ہے کہ آنحضرتؐ لات، منات اور عزیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور انھوں نے قرآن مجید عیسائیوں سے حاصل کیا۔

اس قول کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے پاس کیا باقی رہ جاتا ہے؟ اس تمام الزام تراشی کے باوجود حفناوی بروکلمان کے اقوال پر انحصار کرتا ہے لیکن مسلمان مؤرخین پر اعتماد نہیں کرتا کیونکہ استعمار یہی چاہتا ہے۔ افسوس کوئی ایسا مسلمان نہیں جو حفناوی کی زبان کو لگام دے۔

۳۔ کفر اور جرم وظلم کی ترویج

استعمار نے حفناوی کو یہ کام سونپا ہے کہ وہ کفر، جرم، ظلم اور سازش کو ترویج دے مگر یہ ترویج بنی امیہ کی تعریف کی شکل میں کرے یعنی اُن لوگوں کی تعریف کرے جو کفر، فساد، بغض، حسد، دشمنی، عیاشی، جھوٹ، مکروفریب اور بہتان تراشی کا مجسمہ تھے۔ ان برائیوں کو اُن لوگوں میں پروان چڑھانا چاہیے جو مجرم کے مجرم، بدنسب کے بدنسب اور زناکار کے زناکار رہے ہوں۔

مقریزی النزاع والتخاصم ص۲۲ پر لکھتا ہے: بنی امیہ کے مورث اعلیٰ امیہ نے اپنی زندگی میں اپنی بیوی کی شادی اپنے بیٹے ابی عمرو سے کر دی تھی۔ یہ بیٹا اپنی ماں کے ساتھ سوتا تھا اور امیہ دیکھتا تھا۔

تفصیلات کے خواہشمند حضرات محمود عقاد کی ابو الشہداء، جارج جرداق کی

ندائے عدالت انسانی اور النصائح الشافیہ لمن یتولی معاویہ ملاحظہ فرمائیں۔

جو کچھ میں نے شیعہ اور معاویہ کے بارے میں لکھا ہے اُس کے لئے میری کتابیں المجالس الحسینیہ اور صلح الحسنؑ واستشہاد الحسینؑ نیز نوری جعفر کی کتاب الصراع بین الامویون و مبادی الاسلام ملاحظہ فرمائیں۔

کیا یہ باور کرنا ممکن ہے؟

استعمار نے حفناوی کو حکم دیا ہے کہ وہ امام علیؑ کی برائی کرے، اسلامی مآخذ پر نکتہ چینی کرے اور کفر اور الحاد کی تعریف کرے۔ حفناوی نے اُس حکم کی تعمیل میں اپنی شرانگیز کتاب شائع کی ہے تاہم جو شخص یہ کتاب پڑھے گا وہ اس کے مندرجات کی تائید نہیں کرے گا۔

کیا کوئی شخص قاہرہ میں یہ باور کرسکتا ہے کہ

"ابوسفیان جس نے قرآن اور اسلام کا مقابلہ کیا تھا عظیم اور واجب التعظیم ہے؟" کیونکہ جب جنگ احد اور جنگ خندق میں رسول خداؐ پر حملے کئے گئے اُس وقت ابوسفیان ہی مشرکین کا سردار تھا اور اُس کے دو بیٹے رسول اکرمؐ کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک تو مارا گیا جبکہ دوسرے کو قیدی بنا لیا گیا۔ ابوسفیان کو مؤلفۃ القلوب کی مد میں سے حصہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوجائے۔ ہمیں ابوسفیان کی خامیوں کا علم نہیں ہے سوائے اس کے کہ جنگ احد میں اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ کس ترکیب سے مسلمانوں کو ختم کردے۔

کیا کوئی شخص قاہرہ میں یہ باور کرسکتا ہے کہ

رسول اکرمؐ ابوسفیان کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر ترجیح دیتے تھے اور معاویہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ مختلف معاملات میں معاویہ کی رائے دریافت کریں اور اُس کی دیانتداری کی

بنا پر آنحضرتؐ کے وصال کے بعد اُس کے ہاتھ پر بیعت کرلیں۔

کیا کوئی شخص قاہرہ میں یہ باور کرسکتا ہے کہ

ہند جس نے لوگوں کو رسول اکرمؐ کے خلاف بھڑکایا تھا اور ان کے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا ایک نیک عورت تھی؟

کیا کوئی شخص قاہرہ میں یہ باور کرسکتا ہے کہ

حجاج بن یوسف متقی، عادل اور بہت بڑا مصلح تھا اور ابو موسیٰ اشعری نے حضرت علیؑ کو خلافت سے معزول کر دیا تھا کیونکہ وہ خلافت کے لائق نہیں تھے۔ حضرت علیؑ نے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا مگر ایک بھی کافر کو قتل نہیں کیا۔[1]

حفناوی لکھتا ہے کہ جنگ حرہ میں یزید کے اقدامات اور اُس کا کعبہ کو آگ لگا دینا اُس کے بہترین اعمال تھے کیونکہ اپنی حفاظت کے لئے اُسے اس سے بھی زیادہ کرنا چاہیے تھا مگر چونکہ وہ بردبار اور متحمل مزاج آدمی تھا اس لئے اُس نے اسی پر اکتفا کیا۔

بلاشبہ کوئی شخص یہ باور نہیں کرسکتا کہ قاہرہ میں جو اسلام کی حمایت کا مرکز اور مسلمان ملک کا دارالحکومت ہے کوئی شخص ایسی کفر آمیز باتیں لکھے اور پھر ایک منٹ کے لئے بھی زندہ رہ سکے لیکن حفناوی نے ایسی باتیں لکھی ہیں اور اب تک زندہ ہے۔ ہم حفناوی کی باتوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ انھیں رد کریں۔ وہ کہتا ہے کہ زیاد بن سمیہ ابوسفیان کا جائز اور حقیقی بیٹا تھا اور یہ چیز لغوی اور شرعی طور پر ثابت ہوگئی ہے۔ ایک مجرم کو وہ صالح اور مصلح بتاتا ہے اور ایک مومن کو وہ کافر اور مجرم بتاتا ہے اور ایک عادل کو ظالم اور گنہگار قرار دیتا ہے۔

۱۔ یہ بات حفناوی نے صفحہ ۱۴۳ پر لکھی ہے لیکن صفحہ ۷۰ پر وہ لکھتا ہے:
علیؑ نے جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کو قتل کیا۔ اس سے اُس بات کی وضاحت ہوتی ہے جو کفار کے بارے میں سورۂ حج کی آیت ۴۶ میں آئی ہے: ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوتے ہیں (حفناوی نے متضاد باتیں کہی ہیں)۔ (مؤلف)

ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنا تعارف مسلمان اور عرب کی حیثیت سے کراتے ہیں (لیکن درپردہ وہ اسلام کے خلاف کام کر رہے ہوتے ہیں) انھیں اس بات کا افسوس ہے کہ ابوسفیان اپنے دشمن (رسول اکرمؐ) پر فتح کیوں نہ پاسکا اور اُس نے آنحضرتؐ کے ساتھ وہی سلوک کیوں نہ کیا جو اُس کے پوتے نے آنحضرتؐ کے نواسے امام حسینؑ اور اُن کے بچوں کے ساتھ کربلا میں کیا تھا۔

حفناوی کے ان افکار پر الازہر کے اساتذہ اور دیگر مصنفین نے چپ سادھ رکھی ہے کیونکہ وہ اُن کی نظر میں وہ ایک کلمہ گو "مسلمان" ہے۔

سفیانی کتاب اور جامع الازہر

جو لوگ اس سفیانی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں جس پر جامع الازہر کے شعبہ اصول دین کے ایک پروفیسر نے تقریظ لکھی ہے یہ حقیقت تسلیم کی ہے کہ حفناوی اور اُن کالے کوؤں کا مقصد جنھوں نے حفناوی کی تائید کی ہے اسلام اور مقدسات اسلام کو رسوا کرنا، کفر و الحاد کو فروغ دینا نیز عیسائی مشنریوں کے مقاصد کے لئے کام کرنا ہے۔ حفناوی کا مقصد اُس وقت کھل کر سامنے آجاتا ہے جب ہم اس کے اقوال کا مقابلہ عیسائی مستشرقین کے اقوال سے کرتے ہیں۔

بروکلمان اپنی کتاب تاریخ الشعوب الاسلامیہ جلد اول میں لکھتا ہے کہ مکہ کے لوگ جنگ احد سے کوئی نتیجہ حاصل نہ کرسکے۔ اور حفناوی اپنی کتاب کے صفحہ ۳۷ پر لکھتا ہے کہ جنگ احد میں ابوسفیان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو کس طرح نابود کردے؟

بروکلمان اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵۴ پر لکھتا ہے کہ حسین (ع) نے عمرو بن سعد کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے کیونکہ انھوں نے اندازہ لگایا تھا کہ انھیں فرزند رسولؐ ہونے کی بنا پر تحفظ حاصل ہے لیکن اُن کا یہ اندازہ غلط تھا۔

بعینہ یہی الفاظ حفناوی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۹ پر نقل کیے ہیں۔

ان تمہیدی کلمات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابوسفیان شیخ الامویین عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے اقوال کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ درحقیقت ابتدا سے انتہا تک اس کا مأخذ استعمار اور عیسائیت کی سربلندی اور اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی ہے۔ اب اُن کے قدیم و جدید اسلامی مأخذ، تاریخ اور تفسیر، حدیث اور مسلمانوں کی سیرت و سوانح بیان نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ چونکہ تاریخ، تفسیر اور دیگر اسلامی کتابوں میں حقائق بیان کیے گئے ہیں اور امام علیؑ اور اُن کے فرزندوں کی تعریف کی گئی ہے اور بنی امیہ اور اُن کے پیروؤں کی مذمت کی گئی ہے اس لئے حفناوی نے اُن کتابوں پر کڑی تنقید کی ہے اور انھیں جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حفناوی کس حد تک سچ بولتا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۴ پر لکھتا ہے:

”میرا مقصد حقائق پر سے پردہ اٹھانا ہے اور میں دوسروں کی پیروی نہیں کر سکتا کیونکہ جن لوگوں نے بنی امیہ پر اعتراضات کیے ہیں انھوں نے شیعوں کی اندھی تقلید کی ہے۔“

بلاشبہ حفناوی قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ قرآن مجید نے بنی امیہ کو ”شجرۂ ملعونہ“ قرار دیا ہے۔

حفناوی حدیث پر بھی ایمان نہیں رکھتا کیونکہ احادیث بتاتی ہیں کہ علیؑ اور اولاد علیؑ ہمدوش قرآن ہیں اور حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں۔ اپنی گفتار و افکار میں حفناوی نے خدا و رسولؐ کے دشمنوں پر اعتماد کیا ہے اور اُس کی سوچ استعمار سے متاثر ہے۔ حدیث، تاریخ اور تفسیر کے علماء نے علیؑ اور اولاد علیؑ کے جو فضائل لکھے ہیں میں اس کتاب میں انھیں زیر بحث لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ ان پر میں اپنی کتابوں اهل البیتؑ اور علیؑ والقرآن اور المجالس الحسینیه میں

بحث کر چکا ہوں۔

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مفتی موصل شیخ حبیب محمد العبیدی کا جو عراق کے ممتاز سنی علماء میں سے ہیں ایک مختصر قول نقل کروں۔ وہ اپنی کتاب النواة فی حق الحیاة کے صفحہ ۱۰۹ پر صحیح مسلم سے زید بن ارقمؓ کی روایت کردہ یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ حج آخر سے لوٹتے ہوئے رسول اکرمؐ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان غدیر خم کے مقام پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کرنے کے بعد اور وعظ و نصیحت کرنے کے بعد حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ ! فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ فِيهِ الْهُدٰى وَالنُّورُ فَخُذُوا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ فَحَثَّ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِيهِ ثُمَّ قَالَ وَأَهْلُ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي اے لوگو! میں ایک بشر ہوں۔ قریب ہے کہ مجھے اپنے رب کی طرف سے بلاوا آجائے اور میں اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس چلا جاؤں۔ میں تمہارے درمیان دو بیش قیمت چیزیں چھوڑے جارہا ہوں۔ اُن میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں نور و ہدایت ہے۔ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کی بہت تاکید فرمائی اور ترغیب دلائی۔ پھر فرمایا: دوسری چیز میرے اہل بیتؑ ہیں۔ تم میرے اہل بیتؑ کے بارے میں اللہ کا حکم یاد رکھنا۔ تم میرے اہل بیتؑ کے بارے میں اللہ کا حکم یاد رکھنا۔ تم میرے اہل بیتؑ کے بارے میں اللہ کا حکم یاد رکھنا۔

(صحیح مسلم، حدیث ۲۴۰۸، کتاب الفضائل، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ)

یہ حدیث صحیح ترمذی شریف میں اس طرح آئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمْ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَحَدُهُمَا أَعْظَمُ

مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلُ بَيْتِيْ وَلَنْ يَّتَفَرَّقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوْا كَيْفَ تَخْلُفُوْنِيْ فِيْهِمَا

میں تمہارے درمیان دو ایسی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم انھیں میرے بعد مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ ان میں سے پہلی اتنی ہی عظیم ہے جتنی کہ دوسری۔ ایک اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے اور دوسرے میرے رشتے دار میرے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آملیں۔ خبردار! میرے بعد اُن سے اچھا سلوک کرنا۔ (صحیح ترمذی، حدیث ۳۸۷۶)

شاید اس حدیث میں رسول اکرمؐ نے اہل بیتؑ کے بارے میں جو تاکید اور سفارش فرمائی ہے وہ اُن واقعات کی طرف اشارہ ہے جو رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد اہل بیتؑ کو پیش آئے اور جنھوں نے مسلمانوں کو رسوا اور اسلام کو مجروح کیا۔

بلا شبہ مسلمانوں نے اپنے دین و عقائد اور اخلاق کو صحیح مآخذ یعنی قرآن، کتب حدیث اور دوسری معتبر اسلامی کتابوں سے حاصل کیا ہے اور وہ لامانس[1]، گول ڈزیہر، وزمار اور بروکلمان کی کتابوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ عیسائی مشنری اور کافر ہیں۔

ہمیں اس بات کا کوئی ڈر نہیں کہ حفناوی اور جرمن اور امریکن مستشرقین کی شرانگیزیوں کی وجہ سے شیعہ عقیدہ ختم ہو جائے گا اور اہل بیتؑ سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ دوسروں نے بھی شیعہ عقیدے کے خلاف سالہا سال جنگ کی ہے لیکن نتیجہ شیعہ عقیدے کی مضبوطی اور ترقی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ قرآن مجید کی طرح جو شیعہ عقیدے کا اصلی مآخذ ہے شیعیت کی عظمت اور اس کے پھیلاؤ میں بھی خدا

۱۔ Lammens کا تعلق بیلجیم سے ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے اس نے معاویہ اور یزید کی تعریف میں بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ (مؤلف)

کے فضل سے روز بروز اضافہ ہو رہا ہے (کیونکہ ہم نہیں بلکہ خود خدا اپنے نور کو مکمل طور پر پھیلا کر رہے گا)۔

شیعہ عقیدے کی اس عظمت کے مقابلے میں بنی امیہ کی کہانی نقصان اور رسوائی پر ختم ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے قرآن مجید اور اللہ کے رسولؐ کے خلاف جنگ کی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ہے: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ "جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور پانی جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔" (سورۂ رعد: آیت ۱۷)

حفناوی قولِ خدا کو رد کرتا ہے

حفناوی نے تاریخ کے معتبر اور قابل عمل ہونے کے لئے دو شرائط بتائی ہیں پہلی یہ کہ لکھنے والا غیر جانبدار ہو اور دوسری یہ کہ وہ شیعہ اور اہل بیت رسولؐ کا پیرو نہ ہو کیونکہ اُن سے محبت رکھنا بدعت ہے۔

ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (اے رسول!) کہہ دو میں تبلیغ رسالت کا تم سے سوائے اپنے قرابت داروں کی محبت کے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ (سورۂ شوریٰ: آیت ۲۳) لہٰذا اہل بیتؑ سے محبت کرنا واجب ہے۔

اس کے جواب میں، میں کہتا ہوں کہ اللہ نے اہل بیتؑ سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے لیکن یہ آیت تمام قریش کے لئے نازل ہوئی تھی اور قریش میں سے رسول اکرمؐ کا سب سے زیادہ نزدیکی رشتے دار ابوسفیان تھا۔

حفناوی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کے مقابلے میں ابوسفیان رسول اکرمؐ کا زیادہ نزدیکی رشتے دار تھا۔

کیا حفناوی کے لئے واقعی اپنے قلم اور زبان پر قابو رکھنا ممکن نہیں؟

کیا اُس کی کوئی مالی اغراض نہیں؟
کیا اسے استعمار کی خوشنودی مطلوب نہیں؟
ہاں! استعمار حکم دے اور حنفاوی لکھے۔ وہ جھوٹ بولے، جرم کرے اور جو چاہے چھاپ دے۔

جھوٹا کون؟

بلاشبہ قارئین کرام اس منطق پر ہنسیں گے لیکن جب حنفاوی کی منطق یہی ہے تو کیا کہا جاسکتا ہے؟

ذرا غور فرمایئے کہ حنفاوی کیا کہتا ہے: وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۹ اور ۱۶ پر کہتا ہے کہ شیعہ جھوٹے ہیں اور جو شخص شیعوں کی جانب مائل ہو وہ بھی جھوٹا ہے۔ بلکہ ہر وہ سنی جھوٹا اور غیر معتبر ہے جس کی باتیں شیعوں کی باتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔

حنفاوی کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ مسعودی بدعتی اور دھوکا باز شخص تھا کیونکہ شیعہ سمجھتے ہیں کہ وہ اُن میں سے تھا۔ اس کے برعکس یزید بن معاویہ زاہد و عابد شخص تھا اور مروان بن حکم اور عبدالملک کے فیصلے پر عمل ہونا چاہیے۔

مقریزی النزاع والتخاصم کے صفحہ ۱۷ پر لکھتا ہے: عبدالملک نے برسرِ منبر کہا کہ "میں ڈرپوک، بے پروا اور متردد خلیفہ نہیں ہوں۔" ڈرپوک سے اُس کی مراد عثمانؓ، بے پروا سے معاویہ اور متردد سے یزید ہے۔

اگر حنفاوی کے بقول ہمیں مروان کے فیصلے مان لینے چاہئیں تو عبدالملک کے فیصلے پر بھی عمل کرنا چاہیے جس کی نظر میں مذکورہ تینوں افراد ملعون تھے لیکن حنفاوی اُن سب سے محبت کرتا ہے۔ جو لعنت بھیجتا ہے اُس پر بھی ایمان رکھتا ہے اور جس پر لعنت کی جاتی ہے اُس پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

تاہم حنفاوی کے عقیدے کے مطابق ابن قتیبہ، ابوالفرج اصفہانی، جاحظ،

ابن عبد ربہ اور ان جیسے دوسروں نے اپنی کتابیں تاریخ کی خاطر نہیں بلکہ دھوکا دینے اور واقعات کو گڈمڈ کرنے کی غرض سے لکھی ہیں اور چونکہ بروکلمان نے واقدی اور طبری کی کتابوں کی توثیق نہیں کی اس لئے وہ معتبر نہیں ہیں۔

ابوسفیان شیخ الامویین کے چند مندرجات کے مطابق:

یزید جس نے امام حسینؑ کو قتل کیا، کعبے کو جلایا، مدینہ کو اپنی فوج کے لئے مباح قرار دیا اور جو شراب پیتا تھا، تارک الصلاۃ تھا اور جس نے عبداللہ بن حنظلہ کے بقول اپنی ماں، بہن اور بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا زاہد تھا تو ضروری ہے کہ (معاذ اللہ) تمام خاصان خدا فاسق و فاجر ہوں اور فسق و کفر شیعوں تک محدود نہ ہو۔

جھوٹا وہ ہے جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کہے اور کہے کہ "رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے: اللہ کی نظر میں تین افراد معتبر ہیں یعنی جبرائیل، میں اور معاویہ۔"

جھوٹا وہ ہے جو کہے کہ "جبرائیل نے رسول اکرمؐ سے کہا کہ وہ معاویہ کو سلام پہنچا دیں۔ اور رسول اکرمؐ نے معاویہ کی ماں ہند پر نزول رحمت کی دعا کی۔"

جھوٹا وہ ہے جو رہبران حق اور معتبر راویان حدیث اور مؤرخین کو جھوٹا کہے۔

جھوٹا وہ ہے جو زیاد بن سمیہ کے ابوسفیان کے ساتھ رشتے کی تصدیق کرے۔

جھوٹا وہ ہے جو کہے کہ "امام علیؑ نے کسی کافر کو قتل نہیں کیا اور اگر معاویہ نہ ہوتا تو اسلام مٹ گیا ہوتا اور عرب اپنی جہالت کی جانب لوٹ گئے ہوتے۔"

جھوٹا وہ ہے جو کہے کہ "رسول اکرمؐ نے مشرکین کے شر سے بچنے کے لئے ابوسفیان کے گھر میں پناہ لی۔"

جھوٹا وہ ہے جو کہے کہ "آیۂ مودّت کا تعلق ابوسفیان سے ہے کیونکہ وہ آنحضرتؐ کا سب سے قریبی رشتے دار تھا۔"

بہرحال یہ پہلا موقع نہیں کہ ہم نے ایسی جھوٹی اور شرانگیز باتیں سنی ہیں۔ بعض بھاڑو لکھنے والوں، استعماری ایجنٹوں اور وہابیوں نے اپنی ناپاک فطرت اور

اسلام دشمنی کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو فائدہ پہنچایا ہے اور ہمیں ایسے جھوٹ سننے کا عادی بنا دیا ہے لیکن یہ جھوٹ شیعوں کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ جھوٹی باتیں کھلم کھلا خدا و رسولؐ سے منسوب کی جا رہی ہیں اور قرآن و حدیث میں تحریف ہو رہی ہے۔

جامع الازہر کیوں خاموش ہے؟

جامع الازہر کے اساتذہ اور دوسرے مسلمانوں کی خاموشی کی وجہ سے جبہان، محب الدین خطیب اور میگزین التمدن الاسلامی کو حوصلہ ملا ہے کہ وہ شیعوں پر الزام تراشی کریں اور اُن کی دل آزاری کریں۔ یہ بڑا اہم اور سنگین معاملہ ہے۔ جامع الازہر کے اساتذہ کی خاموشی کی وجہ سے جھوٹی اور شرانگیز باتیں اللہ، قرآن، رسولؐ، اہل بیت رسولؐ، اسلام اور اُس کے حامیوں سے منسوب کی جا رہی ہیں۔

شیخ شلتوت اور شیخ مدنی جیسے بلند پایہ علماء نے اتحاد بین المسلمین کے لئے جو کوششیں کی ہیں اُن کی قدر کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں: ہزاروں افراد کے خاموش رہنے کے مقابلے میں دو تین آدمی کیا کر سکتے ہیں؟

کیا ہم بھی خاموش رہیں گے؟

ہم شیعوں پر یہ رکیک حملے ہوتے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

یہ غلط اندازِ فکر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدل جائے گا تاہم جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان قلمی حملوں کا دائرہ پھیل رہا ہے۔ اس کی وجہ سے اگر ہم برادران اہل سنت میں اعتماد کھو دیں تو کیا ہم قابل ملامت ٹھہریں گے؟ اگر کسی استعماری ایجنٹ کے مقابل ہم اپنا دفاع کریں تو کیا ہم قابل ملامت ٹھہریں گے؟ کیا یہ شرم اور دکھ کی بات نہیں کہ ہم جو ایک دین کے ماننے والے ہیں ایک دوسرے پر حملے کریں اور سب کے سب استعمار کے ہتھے چڑھ جائیں اور اپنے

غصب شدہ حقوق اور اقتصادی و معاشرتی مشکلات کی طرف توجہ نہ دیں۔

(امام خمینی نے فرمایا تھا کہ مسلمان ہاتھ کھول کر اور ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے پر جھگڑ رہے ہیں جبکہ دشمن اُن کے ہاتھ ہی کاٹ دینے کی فکر میں ہے)۔

ہم کسی مذہب یا قوم پر حملہ نہیں کرتے اور کسی فرد پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔ تاہم ان حالات میں ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ کوئی ہم پر حملہ کرے کیونکہ اگر کوئی ہم پر حملہ کرے گا تو ہمیں اپنی گھات میں پائے گا۔

ہم اس باب کو رسول اکرمؐ کے اس ارشاد کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

يَا عَلِيُّ اَلَا يُحِبُّكَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ[1]

''اے علیؑ! تمہارا دوست صرف مومن ہوگا اور تمہارا دشمن صرف منافق ہوگا۔ اس حدیث کی روشنی میں ''نفاق'' علیؑ سے دشمنی کا سبب اور ''ایمان'' علیؑ سے دوستی کا موجب ہے اور یہ ممکن نہیں کہ نفاق اور ایمان ایک جگہ جمع ہو جائیں سوائے اس کے کہ منافق مومن بن جائے یا مومن منافق ہو جائے۔

ہم شیعہ اللہ کو، اُس کے رسولؐ کو اور کردارِ حق کو حق کی خاطر کبھی ترک نہیں کریں گے۔ ہمارا عقیدہ کسی دور میں تبدیل نہیں ہوا اسی لئے استعماری ایجنٹوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے جب وہ فرماتا ہے:

وہ ہرگز تمھیں معمولی تکلیف کے سوا کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ پھر اُن کو مدد بھی کہیں سے نہیں ملے گی۔ یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت اُن سے چمٹ رہی ہوگی بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۱۱-۱۱۲)

---

[1] علامہ حلی کی کتاب نہج الحق کے جواب میں فضل بن روزبہان نے جو کتاب ابطال الباطل کے نام سے لکھی تھی اُس میں ترقیم ہے کہ ''بلاشبہ یہ حدیث درست ہے۔'' (مؤلف)

عید غدیر

جب لوگ امام علیؑ کے بارے میں لب کشائی کرتے ہیں تو آپ کی عظمت کی وجہ سے اُن کی زبان لڑکھڑانے لگتی ہے اور دانشوروں کی عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں آپ کی عظمت کی بنیاد دولت اور منصب پر نہیں بلکہ علم اور عدل پر ہے۔ آپ کی یہ عظمت حسب نسب پر نہیں بلکہ اخلاص اور جہاد فی سبیل اللہ پر ہے۔ آپ کی عظمت کی منطق ہدایت اور نور ہے اور اس عظمت کا ہتھیار فساد، شرارت اور منافقت کے خلاف جہاد ہے۔

اسی عظمت نے اسلام کے جھنڈے گاڑے ہیں اور اسلام کے بارے میں مصائب اور شکوک کا خاتمہ کیا ہے۔ اسی عظمت نے رسول اکرمؐ کی پریشانیوں اور مشکلوں کا خاتمہ کیا ہے۔ اسی عظمت کو اللہ تعالیٰ، رسول اکرمؐ، صحابہ کرام اور تابعین اور ہر ملت و مذہب کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے اور اس کی تصدیق کی ہے۔

اگر ایک شخص اپنی ہمت مجتمع کرے اور امام علیؑ کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو اسے اُن کے متعلق کیا کہنا چاہیے؟ اسے اُن کی کون سی عظمت بیان کرنی چاہیے کیونکہ علیؑ مرد لامتناہی ہیں۔

اگر ایک شخص امام علیؑ کے بارے میں ایک زاویے سے کچھ کہے تو وہ اپنے آپ کو سخت مشکل میں پاتا ہے کیونکہ اُس کی مثال اُس آدمی کی سی ہے جو ایسے پُل پر چلتا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔

نظامؔ کہتا ہے:

کسی سخنور کے لئے امام علیؑ کے اوصاف بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ اگر وہ اُن کے ساتھ انصاف کرتا ہے تو مبالغہ کرتا ہے اور اگر ان صفات کو بیان کرنے میں ناکام رہتا ہے تو جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور درمیانی راستا اختیار کرنا بڑا مشکل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس راستے پر چلنے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اُس نے لوگوں کو امام علیؑ کی عظمت بیان کرنے سے باز نہیں رکھا۔ اس کے برعکس یہی چیزیں اُن کے امام علیؑ پر ایمان لانے کا موجب بنی ہیں اور وہ انہیں ایک عظیم دینی اور سیاسی مدبر سمجھتے ہیں۔

امام علیؑ کی سیاست بیان کرتے ہوئے جو دقت پیش آتی ہے شعبی نے اُس کا خلاصہ ایک جملے میں پیش کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اِنْ اَحْبَبْنَاهُ افْتَقَرْنَا وَاِنْ اَبْغَضْنَاهُ کَفَرْنَا "اگر ہم علیؑ سے دوستی کریں تو فقیر ہو جاتے ہیں اور اگر اُن سے دشمنی کریں تو کافر ہو جاتے ہیں۔"

فقیری سے اُس کی مراد شیعیان علیؑ کے خلاف جابر سلاطین کا سلوک ہے۔

امام علیؑ کے بارے میں گفتگو کرتے وقت جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ امام علیؑ نے خود بیان فرمائی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

بہت جلد دو قسم کے لوگ میری وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو دوستی میں غلو کرتا ہے اور یہ دوستی اسے حق سے دور لے جاتی ہے اور ایک وہ جو دشمنی میں افراط کرتا ہے اور یہ دشمنی اسے حق سے دور رکھنے کا موجب بن جاتی ہے۔ بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے بارے میں اعتدال سے کام لیتے ہیں۔

اس تمہید سے پتا چلتا ہے کہ امام علیؑ کی عظمت عام عظمت کی طرح نہیں ہے کیونکہ عام عظمت میں افراط و تفریط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ امام علیؑ کی عظمت عام عظمت سے بلند ہے۔ (جس طرح نبیٔ محتشم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے کہا

گیا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر اسی طرح حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کیلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعد از نبیؐ بزرگ توئی قصہ مختصر۔ ابن عربی کے "انسان کامل" کا نمونہ بھی حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی ذات گرامی ہی ہے) نظامؔ کے کلام میں اسی دقت کی طرف اشارہ ہے۔

اس بات کے پیش نظر کہ امام علیؑ کے فضائل بیان کرتے ہوئے ہم کہیں افراط وتفریط کے خطرناک راستے پر نہ چل پڑیں ہم آپ کی عظمت کے بارے میں بحث خود آپ کے فرمودات کی روشنی میں جاری رکھتے ہیں جو آپ کے فضائل کو پرکھنے کا حقیقی معیار ہیں۔ اس طرح ہم آپ کے علم کی گہرائی کا اندازہ لگا سکیں گے۔

اپنا شہر

امام علیؑ حدود شہر کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَيْسَ بَلَدٌ بِاَحَقَّ بِکَ مِنْ بَلَدٍ ، خَيْرُ الْبِلَادِ مَا حَمَلَکَ "کوئی شہر تمہارے لئے اپنے شہر سے زیادہ اچھا نہیں ہے۔ بہترین شہر وہ ہے جس میں تم زندگی گزارتے ہو۔" یعنی دنیا کے تمام شہر تمہارا وطن ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ اپنے وطن کی شان بڑھاؤ اور اُس میں عدل قائم کرو۔ بہترین شہر وہ نہیں جس میں تم پیدا ہوئے تھے یا جس میں تمہارے ماں باپ اور رشتے دار رہتے ہیں بلکہ بہترین شہر وہ ہے جس میں تمہیں روزی، تحفظ، آزادی اور عزت میسر ہو۔ اس قول کی تصدیق اُن مہاجرین کے حالات سے ہوتی ہے جن کی نئی جائے سکونت پر روزی کی ضمانت موجود ہو۔

قرابت داری

امام علیؑ قرابت داروں کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلْقَرِيْبُ مَنْ قَرَّبَتْهُ الْاَخْلَاقُ "آدمی اُس کے قریب ہوتا ہے جس کے

اخلاق اچھے ہوں۔" یعنی تعلق اور رشتے داری کا انحصار صرف خون پر نہیں ہے کیونکہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ اس کے برعکس سچی قرابت داری، ہمدردی، وفاداری، دوستی، اخلاص، رحم اور راستگوئی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کو دھوکا دیتا ہے یا آپ سے بے پرواہ ہے تو وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں آپ سے دور ہے اور اگر کوئی شخص آپ سے دور رہتا ہے لیکن آپ کے ساتھ مخلص ہے اور آپ کے مفادات کا خیال رکھتا ہے تو وہ دوسروں کے مقابلے میں آپ کے زیادہ قریب ہے۔

ان الفاظ سے بھی امام علیؑ کی یہی مراد ہے۔ رُبَّ قَرِيْبٍ اَبْعَدُ مِنْ بَعِيْدٍ وَرُبَّ بَعِيْدٍ اَقْرَبُ مِنْ قَرِيْبٍ "ایسے قرابت دار بھی ہیں جو غیروں سے زیادہ دور ہیں اور ایسے غیر بھی ہیں جو قریبی عزیزوں سے زیادہ قریب ہیں۔"

اچھے اخلاق

امام علیؑ اچھے اخلاق کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

حُسْنُ الْخُلُقِ فِیْ تَجَنُّبِ الْحَرَامِ وَطَلَبِ الْحَلَالِ "اچھے اخلاق ناجائز چیزوں سے بچنا اور جائز چیزیں طلب کرنا ہے۔"

امام نے ایک فرد کے اخلاق کو اُس کی معاشرتی اقدار اور عام ضابطے سے منسلک کر دیا ہے اور افراد کی قیمت کا اندازہ اُن کی معاشرتی قیمت سے لگایا ہے کیونکہ جب تک ایک فرد معاشرے پر انحصار کرتا ہے ہم یہ نہیں کرسکتے کہ اُس کی انفرادی شخصیت کو مدنظر رکھیں اور اُس کی معاشرتی شخصیت کو نظر انداز کر دیں۔ اگر کوئی شخص مہمان سے اچھی طرح پیش آئے تو اسے منکسر المزاج کہنا یا اگر کوئی شخص گاہے بگاہے سچ بولے تو اسے راستگو کہنا یا اگر کوئی شخص قرضہ ادا کر دے تو اسے بروقت قرضے لوٹانے والا کہنا ایک غلط رائے ہوگی یہ ضروری ہے کہ ایک فرد کے

متعلق رائے قائم کرنے سے پہلے ہم اُس کے معاشرے کے متعلق افعال کا جائزہ لیں اگر اُس نے کسی شخص کو نقصان پہنچایا ہے اور بظاہر خوش ہے اور اس شخص سے اخلاص کا دم بھرتا ہے تو اسے انسان نہیں کہنا چاہیے اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچائے اور ہم کہیں کہ وہ اچھے اخلاق کا مالک ہے تو ہم اپنے ساتھ انسانیت، عقل، ایمان اور اخلاق کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

معاشرتی دستاویز

مالک اشتر کے نام طرزِ جہانبانی کے عنوان سے اپنے خط میں امام علیؑ نے انھیں جو ہدایات دی تھیں وہ اُن حکومتوں کے لئے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کی خواہشمند ہیں دستور العمل بننے کے قابل ہیں۔ امام علیؑ نے فرمایا تھا:

''اراضی کو ترقی دو اور تاجروں، مزدوروں اور صنعت کاروں کا خیال رکھو کیونکہ یہ لوگ عوام کی منفعت اور اچھی گزر اوقات کا ذریعہ ہیں۔''

امام علیؑ کی جانب سے دی گئی ہدایات کو آج کل ''ترقیاتی منصوبے'' کہا جاتا ہے۔ مختلف حکومتیں پنج سالہ، سات سالہ اور دس سالہ منصوبے بناتی ہیں تاکہ زمینیں لوگوں کو قسطوں پر دیکر اُن سے بہتر نتائج حاصل کئے جاسکیں اور ہر شخص کو قوت خرید مہیا کی جاسکے۔

واقعہ غدیر

ان تمہیدی کلمات کے بعد ہم مختصراً واقعہ غدیر اور امام علیؑ کے بالصراحت خلافت کے لئے نامزد کئے جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے خواہ امام علیؑ کو بالصراحت نامزد کیا ہو یا نہ کیا ہو خلافت ان کا قدرتی حق تھا کیونکہ لوگوں کو حق سے پہچانا جاتا ہے حق کو لوگوں سے نہیں پہچانا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ امام علیؑ کے فضائل سے واقف تھے۔ اُن کے یہی فضائل تھے

جن کی بنا پر عید غدیر وجود میں آئی۔ اگر اُن میں یہ فضائل نہ ہوتے تو لوگوں نے غدیر اور اُس کی عید کا نام بھی نہ سنا ہوتا۔

کون سا دن اس تہوار سے بہتر ہوسکتا ہے جب اللہ نے اپنا دین مکمل کر دیا اور امام علیؑ کی ولایت کے ذریعے مسلمانوں پر اپنی عنایات کی تکمیل کر دی۔ کون سا دن اس سے بہتر ہوسکتا تھا جس کے متعلق اللہ فرماتا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

یہ آیت جو دین کے اکمال اور نعمتوں کے اتمام کے بارے میں ہے غدیر کے دن نازل ہوئی تھی۔ تمام محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر ۱۸ ذی الحجہ کو رسول اکرمؐ مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہوئے اور امام علیؑ کا بازو پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّهُ وَابْغِضْ مَنْ اَبْغَضَهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ وَاَدِرِ الْحَقَّ مَعَهُ حَيْثُ دَارَ اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ جس کا میں مولا ہوں اُس کا علیؑ بھی مولا ہے۔ الٰہی! اُس سے محبت رکھ جو علیؑ سے محبت رکھے اور اُس سے دشمنی رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے۔ جو علیؑ سے محبت کرے اُس سے محبت کر اور جو علیؑ سے بغض رکھے تو بھی اُسے ناپسند کر۔ جو علیؑ کی مدد کرے تو بھی اُس کی مدد کر اور جو علیؑ کو چھوڑ دے تو بھی اُس کو چھوڑ دے اور حق کو اُس طرف موڑ دے جس طرف علیؑ مڑیں۔ اے لوگو! یہ باتیں اُن تک پہنچا دو یہاں موجود نہیں ہیں۔

اس سے پیشتر کہ لوگ منتشر ہوں جبریل امینؑ نازل ہوئے اور یہ آیت لائے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

''جن لوگوں نے کفر اختیار کیا آج کے دن وہ تمہارے دین سے مایوس ہوگئے ہیں

پس اُن سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔“

پھر رسول اکرمؐ نے فرمایا:

”عظیم ہے وہ پروردگار جس نے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمتیں تمام کیں اور میری رسالت پر مطمئن ہوا اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے خوش ہوا۔“

جب رسول اکرمؐ یہ ارشاد فرما چکے تو صحابہ نے گروہ در گروہ امام علیؑ کو مبارکباد دی۔ جن لوگوں نے سب سے پہلے مبارکباد دی وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ یہی کہہ رہے تھے: بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا عَلِیُّ! اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَمَوْلٰی کُلِّ مُؤْمِنٍ وَّمُؤْمِنَۃٍ اے علیؑ! مبارک ہو۔ اب آپ ہمارے اور ہر مومن مرد اور عورت کے مولا بن گئے ہیں۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں کاملیت سے دین اسلام کی کاملیت مراد ہے کیونکہ عبادت، انفرادی زندگی، جرائم کی سزا، ناقابل تنسیخ معاہدوں اور جائز اور ناجائز چیزوں وغیرہ کے بارے میں تمام قوانین نافذ ہو چکے تھے اور مزید کوئی قانون وضع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ

۱۔ احکام سے متعلقہ دوسری آیات (مثلاً وراثت اور سود سے متعلقہ آیت) عید غدیر کے بعد نازل ہوئیں جیسا کہ صحیح بخاری میں لکھا ہے آخری آیت جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوئی سود کے بارے میں تھی۔

۲۔ ایک مذہب اور ایک سیاسی ریاست کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے جب قانون وضع کرنے اور قانون نافذ کرنے کا اختیار محفوظ ہو۔ اگر قانون وضع کرنے کی طاقت ہو لیکن نافذ کرنے کی طاقت نہ ہو تو ایسی طاقت غیر مؤثر ہوتی ہے۔

زیر بحث صورت میں قانون نافذ کرنے کا اختیار رسول اکرمؐ کے ہاتھ میں تھا۔ کفار کا خیال تھا کہ آنحضرتؐ کے بعد قانون نافذ کرنے کی طاقت ختم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی اسلام بھی ختم ہو جائے گا مگر رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو اپنی جگہ نامزد کر دیا تاکہ آپ کے بعد اسلام محفوظ رہے اور امام علیؑ لوگوں کی بہتری کے لئے انتظام چلائیں اور اُن کی رہنمائی فرمائیں۔ آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو لوگوں سے متعارف بھی کرا دیا۔ اس سے آپ کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ جہاں ذوالفقار مومنین کے لئے رحمت ہے وہاں بدکاروں کے لئے زحمت بھی ہے۔

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو خلافت کے لئے نامزد کر کے کفار کی اسلام کو شکست دینے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور قانون وضع کرنے کا اختیار دینے کے بعد قانون نافذ کرنے کا اختیار دیکر لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکال دیا کہ اسلام کمزور ہے یا اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ لفظوں کو عملی جامہ پہنانے سے اور اختیار ایک عادل اور عقلمند حکمران کو منتقل کرنے سے اسلام کی کمزوری اور معدومیت کی تمام امیدیں نقش برآب ہوگئیں۔

سنی اور شیعہ محدثین نے تسلیم کیا ہے کہ امام علیؑ کی ولایت کے بارے میں حدیث غدیر صحیح ہے کیونکہ یہ حدیث ۱۱۰ صحابہ اور ۸۴ تابعین نے نقل کی ہے۔

وہ لوگ جو اس حدیث کی روایت کے بارے میں کوئی مشکل پیدا نہیں کر سکے انھوں نے اعتراض کا رخ حدیث کے متن کی طرف موڑ دیا ہے اور کہتے ہیں: ولایت سے رسول اکرمؐ کی مراد دوستی اور محبت تھی اور آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ وہ امام علیؑ کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھیں۔ اس حدیث کا خلافت اور امامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کا یہ فرمانا کہ اَلَسْتُ بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ اور مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ یہ ثابت کرتا

ہے کہ رسول اکرمؐ کا مومنین پر روحانی اور سیاسی اختیار بالخصوص امام علیؑ کے لئے تھا اور وہ کسی کمی بیشی کے بغیر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

اگر اہل سنت لفظ ''مولا'' کے ان ۲۰ معنوں کے علاوہ جو ان میں سے بعض نے جمع کئے ہیں ۱۰۰۱ مزید لغوی معانی دریافت کر لیں تب بھی حدیث کے متن اور واقعے کی ابتدا اور انتہا سے واضح ہے کہ اشارہ خلافت کی طرف تھا۔

کیا حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے امام علیؑ کو مبارکباد دوستی اور محبت کی بنا پر دی تھی یا یہ مبارکبادیاں حکومت اور خلافت کے سلسلے میں تھیں؟ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی معقول آدمی دوسرے کو دوستی کی بنا پر مبارکباد نہیں دیتا۔ شیعہ علماء نے اس اور دوسری احادیث پر تفصیل سے بحث کی ہے اور بہت سی ایسی روایات کے حوالے دے سکتے ہیں جو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ اس موضوع پر شیعہ علماء نے خاص کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: احتجاج (شیخ مفید)، الشافی (سید مرتضٰی)، اعیان الشیعہ (سید محسن امین)، المراجعات (شیخ شرف الدین) اور الغدیر (علامہ محسن امینی) کتاب الغدیر بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

شیعہ اپنے مذہب اور اعتقاد کے مطابق امام علیؑ سے محبت کرتے ہیں اور اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ ولایت کے لئے کسی دوسرے سے زیادہ موزوں تھے کیونکہ آپ خلافت کوئی فائدہ حاصل کرنے یا لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے نہیں چاہتے تھے آپ دنیاوی مقاصد کے لئے اُس کے طالب نہیں تھے۔ امام علیؑ کی روحانی قوت اس سے کہیں بلند تھی کہ آپ کسی منصب کی خواہش کریں کیونکہ آپ کی نگاہوں میں دنیا اُس گرد کی مانند تھی جسے بگولے اِدھر اُدھر اڑائے پھرتے ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں: جب امام علیؑ کو ظاہری خلافت ملی تو میں اُن سے ملنے گیا اور دیکھا کہ وہ اپنا جوتا مرمت کر رہے ہیں۔ میں نے کہا: اے علیؑ! آپ کیا

کر رہے ہیں؟ اس کام کو چھوڑیں۔ انھوں نے جب تک جوتا مرمت نہیں کر لیا مجھ سے بات نہیں کی۔ پھر میری طرف مڑے اور کہا: میرے اس جوتے کی کیا قیمت ہے؟ میں نے جواب دیا: کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے کہا: خواہ اس کی قیمت کچھ بھی نہیں پھر بھی اس کی قیمت کا اندازہ لگاؤ۔ میں نے کہا: اس کی قیمت ایک یا دو درہم ہے۔ اس پر انھوں نے کہا: ''میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ جوتا میری نگاہ میں تم پر حکومت کرنے سے بہتر ہے بجز اس کے کہ جو اختیار مجھے حاصل ہے اس کے ذریعے ایک حق کا دفاع کروں یا ایک جھوٹ کو مٹا دوں۔ وہ شخص خلافت کے لئے کس قدر موزوں ہوگا جس کی نگاہ میں حکومت اور دنیا کی قیمت جوتے کے ایک تسمے کے برابر بھی نہ ہو بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ساری دنیا اس کا جوتا ہو اور وہ اس پر حکومت کرے۔

جو کچھ امام علیؑ نے فرمایا وہ محض الفاظ اور آراء نہیں تھیں۔ دراصل یہ آراء امام علیؑ کے عظیم دل کی گہرائی سے نکلیں اور انھوں نے انھیں اپنی گرفت میں لیا اور زندہ رکھا۔ امام علیؑ نے اپنا یہ ایمان تمام مشکلات کے دوران قائم رکھا۔

المختصر امام علیؑ ایسے آدمی نہیں جن کی پیشوائی مسلمانوں تک محدود ہو۔ وہ مشرق یا مغرب کے آدمی نہیں ہیں۔ وہ دنیا کے ہر میدان اور انسانیت کا مکمل نمونہ ہیں۔ اگر ہم ''یوم علیؑ'' کے سلسلے میں جشن منائیں تو ہم یہ تہوار انسانیت کی فضیلت اور دنیا کے بہترین نمونے کے لئے منائیں گے۔ ہم اسے مذہب اور علم کی شان و شوکت کے لئے منائیں گے۔ ہم اسے اخلاص اور قربانی کی شان کے لئے منائیں گے۔ ہم اسے شجاعت و دلاوری کی عظمت کے لئے منائیں گے۔ ہم اسے دین کی تکمیل اور نعمتوں کے اتمام کے لئے منائیں گے اور ہم اسے اسلام کو مشرق اور مغرب میں پھیلانے کے لئے منائیں گے۔

تمت

محمد جواد مغنیہ

ضمیمہ (۱)

امام علیؑ کا خطبہ بسلسلہ عید غدیر

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی خلافت وحکومت کے زمانے میں ایک دفعہ عید غدیر جمعہ کے دن پڑی تو آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس سے عید غدیر کی شوکت وعظمت واضح ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''خدا کا شکر ہے جسے اگرچہ شکر ادا کرنے والوں کے شکر کی کوئی ضرورت نہیں مگر اس نے اسے اس بات کا وسیلہ بنایا ہے کہ لوگ اس کی ربوبیت کا اقرار کریں۔...

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

اللہ نے روز ازل حضرت محمد (ص) کو انھیں اپنے علم کے ساتھ ساری مخلوق میں سے چن لیا اور پیغمبروں کے درمیان بھی انھیں اونچا رتبہ بخشا تا کہ وہ پروردگار کی طرف سے لوگوں کو بعض کام کرنے کا حکم دیں اور بعض کاموں سے روکیں۔ خدا نے اپنے احکام کو پہنچانے کے لئے انھیں اپنا نمائندہ قرار دیا کیونکہ خدا آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا نیز دلوں اور وہم وگمان کی پیچیدہ تہوں میں نہیں سماتا۔ بلاشبہ اللہ ملک الجبار کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔

خدا نے حضرت محمد (ص) کی نبوت کے اقرار کو اپنی الوہیت کے اعتراف کے ساتھ منسلک کر دیا ہے اور انھیں ایسا خاص شرف عطا کیا ہے جس تک کسی دوسرے کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ حضرت محمد (ص) اس خصوصیت اور عنایت کے قابل بھی تھے کیونکہ انھوں نے اپنے آپ کو خدا کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور وہ خدا کے حبیب تھے۔ بلاشبہ جو شخص ہر لحظہ رنگ بدلتا ہے وہ یہ خصوصیت حاصل نہیں کرسکتا

اور جو دل ہر گمان کا شکار ہو جائے وہ خدا کی محبت کے رتبے تک نہیں پہنچ سکتا۔ خدا نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ان پر درود وسلام بھیجیں تا کہ اُن کی عزت بلند ہو اور یہ عمل درود بھیجنے والے کی دعا قبول ہونے کا موجب بھی بنے۔ خدا خود بھی اُن پر درود بھیجتا ہے اور انھیں بڑھ چڑھ کر عزت اور شرف بخشتا ہے اور ان کی بزرگی میں اضافہ فرماتا ہے حتیٰ کہ اُن کی بڑائی اور عظمت کی کوئی حد نہیں اور وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔...

پھر حضرت محمد (ص) کے بعد خدا نے اپنی مخلوق میں سے چند ہستیوں کو اپنے مخصوص بندے قرار دیا۔ اُس نے ان مخصوص بندوں کو حضرت محمد (ص) کی رفعت کی بدولت سرفرازی بخشی اور حضرت محمد (ص) کی ذمے داریاں ان کے سپرد کیں تا کہ وہ سچے داعیوں کی حیثیت سے لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں اور انھیں خدا شناسی کا سبق دیں۔ ہر زمانے اور ہر دور میں اس گروہ میں سے کوئی نہ کوئی موجود ہوتا ہے۔ خدا نے انھیں ازل میں پیدا کیا۔ انھوں نے نور کی شکل میں اُس کی تعریف کے لئے زبان کھولی اور اُس کے شکر اور تعریف نے ان کے دلوں میں جگہ پائی۔ پھر اُس نے انھیں ہر اُس شخص کے لئے اپنی حجت بنایا جو خدا کی ربوبیت اور اپنی بندگی کا اعتراف کرتا ہے۔...

ان تمام باتوں کے باوجود وہ اُس کے بندے ہیں اور بندے بھی ایسے جو اُس کے حکم کے بغیر کوئی بات نہیں کہتے۔ ہمیشہ اس کے فرمان کے مطابق چلتے ہیں خدا خود ان کی کیفیت اور احوال سے بخوبی واقف ہے۔ وہ کسی شخص کے لئے مغفرت کے طالب نہیں ہوتے بجز اُس شخص کے جسے خدا پسند کرتا ہو۔ ان کا دل خدا کے خوف سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ وہ اس کے سبھی احکام بجا لاتے ہیں اور سنت الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ خدا کی حدود سے تجاوز نہیں کرتے اور اس کے فرمان کے مطابق چلتے ہیں۔

نیز یہ کہ خدا نے اپنے بندوں کو اندھا بہرا نہیں رکھا۔ اُس نے انھیں عقل دی

ہے جو اُن کے وجود میں گندھی اور اُن کی روح میں مضبوطی سے جمی ہوئی ہے۔ اُس نے حواس کی قوت کو عقل کا خدمتگار بنایا اور اسے کان، آنکھ اور بدن کے اندرونی حصے میں رکھا۔ یوں اُس نے سب پر حجت تمام کی اور انھیں روشن راستا دکھایا۔ اُس نے اپنی قدرت سے لوگوں کو بولنے والی زبان دی تاکہ انھیں حواس اور غور وفکر کے ذریعے جو کچھ پتا چلے اسے بیان کرسکیں۔

اے مومنین کی جماعت! اس کے بعد میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خدائے عزوجل نے آج کے دن تمھیں دو عیدیں فراہم کی ہیں۔ یہ دو ایسی بڑی عیدیں ہیں جن میں سے ایک دوسری کے بغیر قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ اُس نے یہ اس لئے کیا ہے تاکہ بھلائی کو تمہارے حق میں مکمل کردے اور انھیں راہ راست سے آگاہ کردے اور تمھیں ایسے روشن دل لوگوں کے پیچھے لے جائے جنھوں نے اُس کی ہدایت کی چمک سے روشنی حاصل کی ہے اور تمھیں اپنے دین مبین کی راہ پر چلائے اور تمھیں اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازے۔

اسی بنا پر اُس نے جمعہ کو اجتماع کا دن قرار دیا اور سب کو اس میں شریک ہونے کو کہا تاکہ جو کچھ تم نے ہفتے بھر میں کیا ہو اس کی صفائی ہو جائے اور اپنے کام کاج میں جو خرابی اور کمی تم نے کی ہو اُس میں ہر جمعہ کو باقاعدگی اور صحت پیدا ہو جائے۔ اسی دن مومنین ایک دوسرے کو یاد کرتے ہیں۔ اسی دن متقین تقویٰ کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی دن خدا نیکوکاروں کو اُن کے اعمال کی جزا دوسرے دنوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ دیتا ہے لیکن معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ضروری ہے کہ اس نے جو حکم دیا ہو اسے بجالاؤ اور جس چیز سے منع کیا ہو اُسے چھوڑ دو اور جن کاموں کے کرنے کا حکم اُس نے تاکید سے دیا ہو ان کی تعمیل کے لئے پوری عاجزی کے ساتھ کمر کس لو۔

اب تمھیں یہ جان لینا چاہیے کہ توحید پر اعتقاد اُس وقت تک قابل قبول نہیں

جب تک حضرت محمد (ص) کی رسالت کا اقرار نہ کیا جائے اور کوئی اعتقاد اور عمل قبول نہیں ہوتا جب تک اُس شخص کی ولایت قبول نہ کی جائے جسے خود خدا نے ولی بنایا ہے۔

اور خدا کی اطاعت قاعدے کے مطابق نہیں ہوتی بجز اس کے کہ تمھیں خدا کی رحمت اور حمایت اور اُن لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو جو اس کے اہل ولایت ہیں یعنی وہ لوگ جن کے بارے میں غدیر کے دن اُس نے آیت بھیجی اور اپنے خاص اور چنے ہوئے بندوں کے حق میں اپنا ارادہ ظاہر کیا اور رسول اکرم (ص) سے فرمایا کہ وہ پیغام وحی لوگوں تک پہنچا دیں اور گمراہوں اور منافقوں کی کوئی پروا نہ کریں اور خود اس بات کی ضمانت دی کہ وہ آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

خدا نے بداندیش لوگوں کے شر سے رسول اکرم (ص) کی حفاظت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُن لوگوں کی دلی کیفیت ظاہر کردی جو شک میں مبتلا تھے اور اُن لوگوں کے باطن سے پردہ ہٹا دیا جو ارتداد کے راستے پر چل رہے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب مومن اور منافق دونوں کو جو کچھ جاننا چاہیے تھا وہ جان گئے۔ اس کے بعد جو شخص بے پروا تھا اُس نے سچائی سے منہ موڑ لیا اور جو شخص ثابت قدم اور مستقل مزاج تھا وہ سچائی قبول کرنے پر مضبوطی سے جما رہا۔ یہی وہ وقت تھا جب منافقوں کی جہالت اور نافرمان لوگوں کی دیدہ دلیری میں اضافہ ہوگیا۔ انھوں نے بہت دانت پیسے اور ہاتھ پاؤں مارے۔ ایک نے بات کہی۔ دوسرا چیخا چلایا اور جس شخص نے نافرمانی کو اپنا شعار بنا رکھا تھا وہ اپنی نافرمانی پر ڈٹا رہا۔ اُن میں سے کچھ لوگوں نے اعتراف بھی کیا لیکن یہ اعتراف تہہ دل سے یا ایمان کی رو سے نہیں تھا جبکہ ایک اور گروہ نے زبان سے بھی اور دل و جان سے بھی اعتراف کیا۔

یوں خدا نے اپنے دین کو مکمل کردیا اور دین کو مکمل کرکے رسول اکرم (ص) اور مومنین اور ان کو متابعت کرنے والوں کی آنکھیں روشن کردیں اور یہ وہی

واقعہ غدیر تھا جس کے تم میں سے کچھ تو خود گواہ تھے اور کچھ دوسروں کو اس کی خبر ملی
تھی اور اس واقعے سے "صابر لوگوں" کے لئے خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس نے
فرعون، ہامان اور قارون کے پروردہ لوگوں اور اُن کی سپاہ اور تخت گاہ کو تباہ کر دیا
لیکن ایک گمراہ گروہ بچ گیا جو حالات خراب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں
کرتا۔ انھیں بھی خدا اپنی انہی جگہوں میں قابو کرے گا اور ان کے آثار تباہ کر دے
گا اور ان کی نشانیاں مٹا دے گا اور اس کے بعد ان کے دلوں کو افسوس اور دکھ سے
بھر دے گا اور انھیں ایسے گروہ میں شامل کر دے گا جن کے ہاتھ اس نے کھلے
رکھے اور ان کے بدن مضبوط بنائے اور نھیں طاقت دی حتیٰ کہ (اپنے اختیار اور خدا
کی نعمتوں کا غلط استعمال کر کے) انھوں نے خدا کے دین کو دگرگوں کر دیا اور اس
کے احکام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور بہت جلد، لیکن مناسب وقت پر، خدا اپنے
دشمنوں پر فتح پائے گا اور خدا لطیف اور خبیر ہے۔

(میرے لئے اتنی باتیں کہنا ضروری نہ تھا کیونکہ) اطلاع دینے کے لئے اس
سے کم گفتگو بھی کافی تھی۔ اے لوگو! تم پر خدا کی رحمت ہو۔ جس چیز کی طرف خدا
نے تمھیں بلایا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے اس کے بارے میں سوچو اور اُس کے
دین کی طرف توجہ دو اور اُس کی راہ پر چلو۔ ٹیڑھے میڑھے راستے اختیار نہ کرو تا کہ
خدا کی راہ سے پیچھے نہ رہ جاؤ۔

بلاشبہ آج کا دن بہت بڑا دن ہے۔

آج کے دن کشائش پہنچی اور آج کے دن ان لوگوں کے درجے بلند ہوئے
جو اس کے اہل تھے اور برہان الٰہی روشن ہوئی۔

ہاں! آج سچ کو اجاگر کرنے اور مقام مقدس (معصوم پیشوا) کے بارے میں
کھل کر اور "نص" کے حوالے سے گفتگو کرنے کا دن ہے۔

آج کا دن دین کے مکمل ہونے کا دن ہے۔

آج کا دن تجدید عہد کا دن ہے۔

آج کا دن گواہی اور گواہوں کا دن ہے۔

آج کا دن نفاق کی اصلیت ظاہر کرنے کا دن ہے۔

آج کا دن ایمان کی حقیقتیں بیان کرنے کا دن ہے۔

آج کا دن شیطان کی ناک رگڑنے کا دن ہے۔

آج کا دن وہ دن ہے جس دن حق کا فیصلہ کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

آج کا دن وہ دن ہے جسے بلندی کی جانب مائل لوگوں نے بھلا دیا ہے۔

آج کا دن راستے کی نشاندہی اور ہدایت کا دن ہے۔

آج کا دن لوگوں کو آزمانے کا دن ہے۔

آج کا دن رہنماؤں کی جانب رہنمائی کرنے کا دن ہے۔

آج کا دن پوشیدہ مقاصد کو ظاہر کرنے، منصوبہ بندی اور دوسروں کی تیاریوں
کا دن ہے۔

آج کا دن رہبران دین کے ناموں کی تصریح کا دن ہے۔

(امام علیہ السلام نے اس دن کے بارے میں اور بھی باتیں کیں، پھر فرمایا:)

اب تم اپنے اعمال کے سلسلے میں خدائے عزوجل کی طرف دھیان رکھو اور اس
سے بچے رہو اور اس کے ساتھ مکر و فریب نہ کرو۔ خدا کی توحید پر اعتقاد رکھ کر اور
اُس شخص کی اطاعت کر کے جس نے تمھیں اُس کی اطاعت کا حکم دیا ہے قرب الٰہی
حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ گمراہی کا راستا چھوڑ دو اور اُن لوگوں کی پیروی نہ کرو
جو گمراہ ہو گئے اور جنھوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ خدا نے ایک گروہ کی مذمت
کرتے ہوئے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ وہ کہتے تھے: اِنَّآ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا
فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا رَبَّنَآ اٰتِهِمۡ ضِعۡفَيۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَالۡعَنۡهُمۡ لَعۡنًا كَبِيۡرًا ہم نے
اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہنا مانا اور انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے

پروردگار! ان لوگوں پر دوہرا عذاب نازل کر اور ان پر بڑی سے بڑی لعنت کر۔ (سورۂ احزاب: آیت ۶۷-۶۸) اور خدا یہ بھی فرماتا ہے کہ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ جب یہ لوگ جہنم میں باہم جھگڑیں گے تو جو لوگ "استکبار" کرتے تھے تو اُن کے پیرو اُن سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے تو کیا تم عذاب کا کچھ حصہ ہم سے ہٹا سکتے ہو؟ (سورۂ مومن: آیت ۴۷) اور وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ جب سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو زیردست اپنے زبردست لوگوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے کیا تم آج خدا کا کچھ عذاب ہم سے ہٹا سکتے ہو۔ (سورۂ ابراہیم: آیت ۲۱)

کیا تم جانتے ہو کہ "استکبار" کیا چیز ہے؟ استکبار اُس (امام) کی اطاعت کا ترک کرنا ہے جس کی اطاعت کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور اُس شخص کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہونا ہے جس کے بارے میں خدا چاہتا ہے کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ قرآن مجید میں اس قسم کے متکبر لوگوں کی بہت سی داستانیں بیان کی گئی ہیں اور اگر انسان ان آیات پر غور وفکر کرے تو یہ اُسے برے راستے سے باز رکھتی ہیں اور سبق آموز ہیں۔ اے ایمان والو! جان لو کہ بیشک خدا ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں یوں پرا باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہوں۔ (سورۂ صف: آیت ۴)

کیا تم جانتے ہو کہ فِيْ سَبِيْلِهٖ سے کیا مراد ہے اور صِرَاطُ اللّٰهِ اور سَبِيْلُ اللّٰهِ کون ہے؟ میں ہوں خدا کی صراط۔ جو اس پر نہیں چلتا (اس کی اطاعت نہیں کرتا) وہ گمراہی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ میں ہوں سبیل اللہ جسے پیغمبرؐ کے بعد اُس نے مقرر کیا ہے اور اس کی نشاندہی کی ہے۔

میں ہوں جنت اور جہنم کو تقسیم کرنے والا۔

میں ہوں حجت خدا۔ تمام بنی نوع انسان پر۔

اب تم غفلت کی نیند سے جاگو اور موت کے آنے سے پہلے نیک اعمال کرو اور خدا کی بخشش حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو قبل اس کے کہ (قیامت برپا ہو اور) ایک دیوار کھڑی کر دی جائے جس کے اندر کی جانب جنت اور باہر کی جانب جہنم ہوگا۔ اُس وقت تم آواز دو گے اور تمہاری آواز کوئی نہیں سنے گا اور دہائی دو گے لیکن کوئی اس کی پروانہیں کرے گا۔ (ہوش میں آؤ) قبل اس کے کہ تم فریاد کرو اور کوئی تمہاری فریاد کو نہ پہنچے۔ وقت نکل جانے سے پہلے اطاعت کرنے میں جلدی کرو۔ (یہ مت سمجھو کہ سزا اور جزا کا دن دور ہے بلکہ) یوں سمجھو کہ خوشیوں کو تباہ کرنے والی (موت) بس آپہنچی ہے اور پھر کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پہنچا جائے اور اُس سے نجات حاصل کی جائے۔

اب یہ اجتماع اختتام کو پہنچنے والا ہے اور تم سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاؤ گے۔ خدا تم پر رحمت کرے اور اپنے گھر والوں کے لئے تمہارا حوصلہ فراخ ہو اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو۔ خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں اُن کے لئے اُس کا شکر ادا کرو۔ متحد ہو جاؤ تا کہ خدا تمہاری مدد کرے۔ بھلائی سے پیش آؤ تا کہ خدا تمہاری دوستی کو پائیدار کر دے۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک دوسرے کو تحفے بھیجو۔ آج کے دن خدا دوسری عیدوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اجر دیتا ہے ایسا اجر تمہیں عید غدیر کے علاوہ کبھی نہیں ملے گا۔ آج کے دن اچھے کام کرنا مال میں اضافہ کرتا ہے، عمر لمبی کرتا ہے اور صلہ رحم کرنا خدا کی رحمت کا موجب بنتا ہے آج کے دن اپنے بھائیوں اور اہل خاندان کو خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے جتنا دے سکو دو۔ اپنا چہرہ ہمیشہ ہشاش بشاش رکھو۔ جب ایک دوسرے سے ملو تو خوشی کا اظہار کرو اور خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ جاؤ اور جن لوگوں کی توقعات تم

سے وابستہ ہیں اُن سے جتنی بھلائی کرسکو کرو۔ کھانے پینے میں خود اپنے اور اپنے ماتحتوں کے درمیان برابری برتو اس برابری اور مساوات کو جہاں تک تم سے ہوسکے عملی شکل دو کیونکہ آج کے دن ایک درہم کا بدلہ ایک لاکھ درہم کے برابر ہے اور برکت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

اس دن روزہ رکھنا بھی خدا نے مستحب قرار دیا ہے اور اس کا بہت بڑا اجر مقرر کیا ہے لیکن اگر کوئی شخص آج کے دن اپنے (دینی) بھائیوں کی خواہش کے بغیر اُن کی حاجت پوری کرے اور برضا و رغبت اُن سے بھلائی کرے تو اس کا بدلہ اُس شخص کے برابر ہے جو آج کے دن کا روزہ رکھے اور تمام رات طلوع فجر تک عبادت کرے اور جو شخص آج کے دن کسی روزہ دار کو افطاری دے اس کا یہ فعل ایسا ہی ہے جیسے کہ اُس نے لوگوں کے کئی ایک گروہوں کو افطاری دی ہو ...

جونہی تم ایک دوسرے سے ملو سلام کہنے کے ساتھ ساتھ مصافحہ کرو اور جو نعمت آج کے دن تمہیں میسر ہوئی ہے اُس کے لئے ایک دوسرے کو مبارک باد کہو۔

جو شخص یہاں موجود ہے اور یہ باتیں سن رہا ہے اسے چاہیے کہ ان باتوں کو اُس شخص تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں اور ان کو نہیں سن رہا اور دولت مندوں کو چاہیے کہ حاجت مندوں کا سراغ لگائیں اور طاقتور، کمزوروں کو تلاش کریں (یعنی امیر اور طاقتور لوگ، غریبوں اور کمزوروں کی مدد کریں) رسول اکرم (ص) نے ہمیں انہی چیزوں کا حکم دیا ہے۔

(ماخوذ از مستدرک نہج البلاغہ، علامہ ہادی کاشف الغطاء نجفی)

اس خطبے میں حضرت علی علیہ السلام نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ خدا نے خود رہبر مقرر کیا ہے اور اُس کے بارے میں آیت نازل کی ہے۔ یہ بات اُن لوگوں کی ہرزہ سرائی کا جواب ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام میں کسی خاص شخص کو امام

اور خلیفہ نامزد نہیں کیا گیا اور قرآن مجید میں اس بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ یوں وہ اسلام کو ایک ایسے دین کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جس میں سیاسی فلسفے کا کوئی وجود نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن اور اسلام اور آیات کی کیفیت اور شان نزول کے متعلق کون زیادہ علم رکھتا ہے؟ امام علی علیہ السلام یا کوئی متکلم یا دربار خلافت سے وابستہ کوئی قاضی القضاۃ یا کوئی یہودی مستشرق یا تاریخ ادبیات کا کوئی پروفیسر یا معاشرتی حقوق کا کوئی ڈاکٹر یا اسلام سے ناواقف عمرانیات کا کوئی نام نہاد محقق۔

درحقیقت رسول اکرمؐ سے امام مہدیؑ اور اُن کے انقلاب کے بارے میں جو کچھ روایت کیا گیا ہے اور مسلمان دنیا کے مستقبل اور امام مہدیؑ کی عادلانہ حکومت کے قیام کے متعلق جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ "شہر غدیر" کا قیام عمل میں لانا ہے۔ سچے مسلمانوں اور قرآنی حکومت پر اعتقاد رکھنے والوں کا ہر روز اور ہمیشہ یہ فرض ہے کہ وہ ہر نسل کے لئے ہر عہد میں اس شہر کو تشکیل دینے کی کوشش کریں اور جو کچھ امام مہدیؑ کو قائم کرنا ہے وہ خود اُن کا دینی فریضہ ہے جسے وہ اپنے ظہور کے زمانے میں انجام دیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ اللہ تو اپنے کام پر ہر طرح غالب اور قادر ہے۔

درحقیقت بعثت، غدیر، عاشورا اور مہدیؑ اسلام کی عمارت کی چار حقیقی سمتیں ہیں جو امام مہدیؑ کے زمانے میں ساری دنیا پر محیط ہوں گی۔

مفاتیح الجنان میں ہے کہ روز جمعہ اور روز غدیر "دعائے ندبہ" پڑھنا مستحب ہے۔

ضمیمہ (۲)

اسلامی افکار میں فکر اہل بیتؑ کی پختگی

(شیخ عباس علی براتی)

مسلمان ہمیشہ سے اسلامی عقائد کی گفتگو وجستجو کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اس جستجو میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعتقادی اختلاف پیدا ہوا اور کئی فرقے پیدا ہو گئے لیکن سب فرقے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اسلام کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے۔ دین کے سرچشمے میں متحد ہونے کے باوجود اس اختلاف کی کئی وجوہات ہیں جن میں حسب ذیل اسباب کو بڑی اہمیت حاصل ہے:

(۱) بحث و اجتہاد کے طریقۂ کار میں اختلاف
(۲) بدعات اور غلط تاویلات
(۳) جہالت اور نصوص سے عدم واقفیت
(۴) قبائلی اختلافات اور سیاسی خواہشات
(۵) مسلمان ہونے والے علمائے یہود و نصاریٰ کا جھوٹی روایات گھڑ کر اسلام میں تخریب کاری کرنا۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ میں ہی کچھ فکری اور اعتقادی اختلافات نے سر اٹھایا تھا لیکن وہ اختلاف اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ وہ مذہب کی شکل اختیار کرتا کیونکہ آنحضرتؐ موجود تھے اور آپ اس طرح کے اختلاف کا بروقت تدارک کرتے تھے اور اسے پھیلنے نہیں دیتے تھے۔

آپ کی مدبرانہ قیادت کی وجہ سے مسلمان معاشرہ ایسی محبت و اخوت کا ایسا گہوارا بن گیا تھا جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈھے سے نہیں ملتی۔ رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ ہی میں صحابہ کی اولاد میں مسئلہ تقدیر پر اختلاف پیدا ہوا تھا اور یہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ باقاعدہ بحثیں ہوتی تھیں۔ جب رسول اکرمؐ نے ان کی صدائیں سنیں تو گھر سے باہر تشریف لائے اور انھیں اس سے منع کیا۔ کتب حدیث میں اس کا تذکرہ موجود ہے جیسا کہ احمد بن حنبل نے عمرو بن شعیب سے، اس نے اپنے والد سے اور اس نے اپنے والد سے روایت کی کہ ایک دن رسول اکرمؐ گھر سے باہر تشریف لائے تو لوگ (مسجد میں) تقدیر کے موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ ان کی گفتگو سن کر آپ کا چہرہ انار کے دانوں کی طرح سے سرخ ہو گیا اور آپ نے ان سے کہا کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے بعض آیات کو بعض پر مار رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۳، ص ۱۲۸)

قرآن و حدیث میں اصول عقائد کی بنیادوں کا تذکرہ موجود ہے لیکن رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد کچھ ایسے سوال منظر عام پر آئے جن کا قرآن و حدیث میں واضح جواب موجود نہیں تھا چنانچہ استنباط و اجتہاد کی ضرورت محسوس کی گئی اور عقیدہ و شریعت میں اجتہاد کا حق فقہاء و مجتہدین کے سپرد کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بعض اعتقادی مسائل میں صحابہ کے مابین اختلاف دکھائی دیتا ہے۔

رسول اکرمؐ کی زندگی میں اختلاف اور آپ کی وفات کے بعد کے اختلاف میں بڑا فرق تھا۔ آپ کی زندگی میں اگر کہیں اختلاف پیدا ہوتا تھا تو آپ اس کا فیصلہ کر کے اسے ختم کر دیتے تھے[1] لیکن آپ کی وفات کے بعد وہ حالت قائم نہ رہی۔ حکمران کسی صحابی یا چند صحابہ کے اجتہاد کی سرپرستی کرتے تھے لہٰذا اختلاف ختم نہیں ہوتا تھا کیونکہ کئی صحابہ کے نظریات ان اصحاب کے نظریات سے ہم آہنگ

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۳۳۱-۳۳۲۔ مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ج ۱، ص ۷

نہیں تھے۔ بطور مثال حسب ذیل دو معاملات کو ہی دیکھ لیں:

(۱) رسول اکرمؐ کی جانشینی اور امامت کبریٰ کا مسئلہ۔[۱]

(۲) مانعین زکوٰۃ کو قتل کرنے اور مرتد قرار دینے کا مسئلہ۔

الغرض اس طرح کے مسائل مختلف کلامی اور اعتقادی مذاہب کے فروغ کا ذریعہ بنے ہیں چنانچہ ان مذاہب کے استدلال اور استنباط کے لئے جن نظریات نے جنم دیا وہ یہ ہیں:

(۱) **محض نقلی استدلال:** احمد بن حنبل اپنے دور میں اس طرز فکر کے امام تھے اور آج اہلحدیث اس طرز فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں جو اپنی ذمے داری صرف یہی قرار دیتے ہیں کہ روایات کی میراث کی حفاظت کریں۔ انھیں روایات کے مطالب کی گہرائی سے اور صحیح وسقیم کی پہچان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ فی زمانہ اس طرز فکر کے حامل سلفی کہلاتے ہیں۔ حنبلی اپنی فقہ میں بھی اسی طرز فکر کے قائل ہیں۔ ان کی نظر میں دینی مسائل پر غور وفکر کرنا حرام ہے اور ان کے متعلق سوال کرنا بدعت اور ان میں بحث کرنا بدعت پسندی کا درجہ رکھتی ہے۔ انھوں نے درس حدیث کو اپنے لئے ضروری لیکن غور وفکر کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ اسے ''اتباع'' اور اس کے سوا ہر طرز فکر کو ''بدعت پسندی'' کہتے ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اعتقادی مسائل کے باب میں جو احادیث آئی ہیں ان کی تدوین وتبویب کریں اور اگر ہوسکے تو لفظی تشریح اور روایات کی اسناد بیان کریں۔ چنانچہ بخاری، احمد بن حنبل، ابن خزیمہ بیہقی اور ابن بطہ کی کتابوں میں یہی انداز کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ ان لوگوں کی شدت پسندی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اعتقادی مسائل میں علم کلام اور عقلی سوچ کو حرام قرار دیا ہے یہاں تک

۱۔ اشعری کی مقالات الاسلامیین و اختلاف المصلین ج ۱، ص ۳۴ ۔ ۳۹۔ ابن حزم کی الفصل فی الملل والاھواء والنحل ج ۲، ص ۱۱۱۔ احمد امین مصری کی کتاب فجر الاسلام۔

کہ ابن قدامہ نے رسالہ تحریم النظر فی علم الکلام بھی لکھی ہے۔

امام احمد بن حنبل کہا کرتے تھے کہ علم کلام کا حامل شخص کبھی نجات نہیں پائے گا اور جو شخص علم کلام کا شائق ہوگا اس کے دل میں منافقت ضرور ہوگی۔ انھوں نے علم کلام کی پرزور مذمت کی ہے اور ان کی شدت پسندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے حارث محاسبی سے قطع تعلق کرلیا تھا حالانکہ حارث ایک زاہد اور پرہیزگار آدمی تھا۔ اس قطع تعلق کی وجہ یہ تھی کہ حارث نے اہل بدعت کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی جس پر تنقید کرتے ہوئے احمد بن حنبل نے کہا تھا کہ ''تم پر افسوس ہے کہ تم نے اپنی کتاب میں پہلے اہل بدعت کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کی تردید کی ہے۔ اس طرح تم نے درحقیقت لوگوں کو اہل بدعت کے نظریات پڑھنے اور ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے جس سے لوگ رائے اور بحث کی طرف مائل ہوں گے۔''

امام احمد بن حنبل اتنے شدت پسند تھے کہ کہا کرتے تھے: ''علمائے متکلمین بے دین ہیں۔''

زعفرانی کا بیان ہے کہ امام شافعی کا فیصلہ تھا:

''متکلمین کو کوڑے مارے جائیں اور پھر قبائل میں پھرایا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ قرآن اور حدیث کو چھوڑ کر علم کلام والوں کی یہی سزا ہے۔''

سلفی شروع ہی سے اس نظریے کے قائل رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس بات کے مدعی رہے ہیں کہ صحابہ باقی لوگوں کی بہ نسبت حقائق کو بہتر طور پر جانتے تھے اور دوسروں کی بہ نسبت الفاظ کی ترتیب سے بھی زیادہ آشنا تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے بہت سے مسائل میں سکوت کیا تھا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ ان مسائل سے برائیاں جنم لیں گی اور رسول اکرمؐ نے بھی فرمایا تھا: هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ، هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ یعنی زیادہ بحث مباحثہ کرنے والے

ہلاک ہوئے ، زیادہ بحث مباحثہ کرنے والے ہلاک ہوئے ، زیادہ بحث مباحثہ کرنے والے ہلاک ہوئے۔[۱]

سلفی خدا کے متعلق تجسیم وتشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ تقدیر کا یہ معنی کرتے تھے کہ انسان کسی بھی طور سے آزاد نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے مجبور محض ہے۔[۲] اس گروہ نے عقیدے میں تقلید کو جائز اور غور وفکر کو حرام قرار دیا۔ ڈاکٹر احمد محمود صبحی رقم طراز ہیں کہ عقیدے میں تقلید نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی جائز جبکہ عبیداللہ بن حسن عنبری ، **حشویہ اور تعلیمیہ**[۳] نے نیز رازی[۴] نے **المحصل** میں اس کی مخالفت کی ہے جبکہ جمہور علماء کا نظریہ ہے کہ عقیدے میں تقلید جائز نہیں ہے۔

شرح ترتیب میں استاد ابواسحاق لکھتے ہیں کہ علمائے حق کا اس امر پر اجماع ہے کہ عقیدے میں تقلید جائز نہیں ہے۔ امام الحرمین نے اپنی کتاب الشامل میں لکھا ہے کہ حنبلیوں کے علاوہ اصول دین میں تقلید کا کوئی بھی قائل نہیں ہے لیکن امام شوکانی نے اس اجماع سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ عقائد کو دلیل و برہان سے جاننا **تکلیف مالایطاق** ہے اور ہر شخص اس کی اہلیت اور طاقت نہیں رکھتا۔ بعد میں شوکانی نے ان علماء کے دلائل کی تردید کی جو اصول دین میں تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں شوکانی کے اس مقالے پر شدید تعجب ہے۔ شوکانی کہتے ہیں کہ اصول دین کو دلیل و برہان سے ماننا اس امت پر ظلم کے مترادف ہے۔ یہ ایسی تکلیف ہے جو ان کی اہلیت وطاقت سے زیادہ ہے۔ بہت سے صحابہ چونکہ درجۂ اجتہاد پر فائز نہیں تھے اس لئے انھوں نے اصول دین میں بھی تقلید کی تھی ... امت

۱۔ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی کتاب التوحید الخالص او الاسلام والعقل ص ۳۔۳۰۔

۲۔ صابونی ابوعثمان اسمٰعیل کی کتاب رسالة عقيدة السلف واصحاب الحديث (فی الرسائل المنیرة)

۳۔ آمدی ، الاحکام فی اصول الاحکام ج ۲ ، ص ۳۰۰۔

۴۔ شوکانی ، ارشاد الفحول ص ۲۶۶۔۲۶۷۔

کے افراد کی اکثریت کے لئے اصول عقائد میں غور وفکر کرنا حرام ہے اور یہ جہالت وضلالت کا پیش خیمہ ہے۔[۱]

یہ طرز فکر رکھنے والے علم منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام جانتے ہیں اور اسے معرفت بشر تک پہنچنے کا وسیلہ تسلیم نہیں کرتے جبکہ علم منطق دلیل و برہان کا علم ہے اور اس میں دلائل کی تنظیم کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس علم کے بنیادی اصول ارسطو نے اپنی کتاب الارغانون میں بیان کئے تھے اور انھیں ''میزان'' کا نام دیا تھا

روایات پرست گروہ علم منطق کی ناکامی کے لئے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ کندی ، فارابی ، ابن سینا ، غزالی ، ابن باجہ ، ابن طفیل اور ابن رشد عالم اسلام کے مشہور مفکر اور علم منطق کے ماہر تھے۔ اگر علم منطق کسی صحیح نتیجے پر پہنچانے میں معاون ہوتا تو ان میں باہمی اختلاف نہ ہوتا جبکہ علم منطق سے آراستہ ہونے کے باوجود ان کے افکار وآراء میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے منطق کو حق و باطل کی ''میزان'' قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہ گروہ اپنے ابتدائی ادوار میں اسی سوچ کا حامل رہا اور اس نے علم کلام اور علم منطق کی شدید مخالفت کی لیکن بعد کے میں اسے حالات سے مجبور ہو کر اپنے موقف سے پیچھے ہٹنا پڑا مثلاً جب ہم اس گروہ کے ایک اور سرخیل ابن تیمیہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے اندر علم کلام کے متعلق کافی لچک دکھائی دیتی ہے۔ وہ علم کلام کو مطلقاً حرام قرار نہیں دیتا بلکہ یہ کہتا ہے کہ بوقت ضرورت علم کلام حلال ہوجاتا ہے چنانچہ ابن تیمیہ نے ملاحدہ اور زنادقہ کے نظریات کی تردید کے لئے عقلی اور شرعی دلائل کا سہارا لیا۔[۲]

۱۔ امام الجوینی ، الارشاد الی قواطع الادلة ص ۲۵۔ امام غزالی ، الجام العوام عن علم الکلام ص ۶۶۔۶۷ اور ڈاکٹر احمد محمود صبحی ، علم الکلام ج ۱۔

۲۔ ابن تیمیہ ، مجموع الفتاوی ج ۳ ، ص ۳۰۶۔۳۰۷۔

ابن تیمیہ نے جہاں علم کلام سے مصالحت کرلی تھی وہاں اس نے نہ صرف علم منطق سے مخاصمت برقرار رکھی بلکہ ایک کتاب **الرد علی المنطقیین** بھی لکھی۔

ابن تیمیہ کے پیروکار کہتے ہیں کہ فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (۱۵۹۶ء - ۱۶۵۰ء) نے ارسطو کی منطق کی بجائے صحیح اور غلط کی پہچان کے لئے کچھ اصول وقواعد وضع کئے تھے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جو آدمی اس کے اصول وقواعد کی مکمل پیروی کرے گا وہ فکری غلطی سے محفوظ رہے گا اور یقین کی دولت سے مالا مال ہوگا۔ لیکن ہوا کیا؟ ارسطو کی منطق کی طرح ڈیکارٹ کے اصول وقواعد بھی انسان کو فکری غلطیوں سے محفوظ نہ رکھ سکے اور انسان آج بھی اصابت فکر کے لئے ہزاروں برس قبل کے انسان کی طرح ترس رہا ہے۔[۱]

بہت سے اسلامی مفکر عقلی طریقے کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ امام غزالی نے **تہافة الفلاسفه** لکھ کر فلاسفہ کی آراء کو دلائل سے ردّ کیا۔ غزالی کی کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ عقل پر انحصار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جہاں عقل تعمیر کرتی ہے وہاں تخریب کا باعث بھی ثابت ہوتی ہے۔ امام غزالی یہ ثابت کرتے ہیں کہ الٰہیات اور اخلاقیات کے متعلق انسانی عقل زیادہ سے زیادہ تخمین پیدا کرسکتی ہے یقین نہیں۔

ابن رشد اندلسی (متوفی ۵۹۵ھ) نے غزالی کی ردّ میں **تہافة التہافة** لکھی جس میں غزالی کے نظریے کا بطلان کرتے ہوئے لکھا کہ عقل صریح اور نقل صحیح میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اُس نے اس مسئلے کی مزید وضاحت اپنی کتاب **فصل المقال فیما بین الحکمة والشریعة من الاتصال** میں کی۔ اسے حالات کا جبر کہیں یا حسن اتفاق کہ جو نظریہ ابن رشد نے پیش کیا تھا بعینہ وہی نظریہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب **موافقة صریح المعقول لصحیح المنقول** میں پیش کیا ہے۔

ہمیں تو ابن تیمیہ کے دو متضاد مؤقف اختیار کرنے پر تعجب ہے۔ بہرنوع

۱۔ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، التوحید الخالص ص ۵ - ۲۰۔

اہلسنت میں سے اہلحدیث ہوں یا شیعوں میں سے اخباری[۱] وہ آیات اور روایات کے ظاہری الفاظ کی پیروی کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو رائے اور قیاس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔[۲]

آج کل سلفی اور اہلحدیث مذہب کو سعودی عرب (نجد) میں فروغ حاصل ہے ان کی تھوڑی بہت جماعتیں (پاکستان)، عراق، شام اور مصر میں بھی موجود ہیں۔[۳]

(۲) محض عقلی استدلال: معتزلی مذہب میں عقل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس مکتب کے افراد تاریخ میں اصحاب الرائے (اور اصحاب التوحید والعدل) کہلاتے ہیں۔ اس مکتب کے بانی واصل بن عطا (۸۰ھ - ۱۳۱ھ) اور عمرو بن عبید مصری (۸۰ھ - ۱۴۴ھ) تھے۔ اس وقت منصور دوانقی کا دور خلافت تھا۔ واصل اور عمرو کے بعد اس مکتب کی آبیاری احمد بن ابی داؤد نے کی جو مامون الرشید کا وزیر تھا اور قاضی عبدالجبار بن احمد ہمدانی (متوفی ۴۱۵ھ) نے بھی معتزلی عقائد کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ فرقہ معتزلہ میں نظام، ابوالہذیل، علاف، جاحظ اور جبائیان کو بھی خصوصی مقام حاصل ہے۔ معتزلہ عقل کو خصوصی اہمیت دینے کے سبب معرفت خداوندی اور صفات خداوندی اور شریعت کی تفہیم کیلئے عقل پر بھروسا کرتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ عقل کے بغیر دین کا ادراک اور اس کی تطبیق ممکن نہیں ہے۔

اب معتزلہ معدوم ہوچکے ہیں اور فی زمانہ کہیں دکھائی نہیں دیتے البتہ زیدی اور اباضی مذاہب میں معتزلی افکار کا پرتو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں مذاہب بہت سے عقائد میں معتزلہ سے متاثر ہیں۔ معتزلہ چند مسائل میں شیعہ اثناء عشری اور شیعہ

۱۔ شیخ مفید، اوائل المقالات۔

۲۔ سیوطی، صون المنطق والکلام عن علمی المنطق والکلام ص ۲۵۲۔ شوکانی ارشاد الفحول ص ۲۰۲۔ علی سامی النشار مناهج البحث عند مفکری الاسلام ص ۱۹۳۔ علی حسین الجابری، الفکر السلفی عند الاثنی عشریة ص ۱۵۴۔ ۲۰۳۔ ۳۳۹۔

۳۔ القاسمی، تاریخ الجهمیة والمعتزلة ص ۵۶۔

اسماعیلی سے بھی متفق تھے۔ اہلحدیث معتزلہ کو "قدریہ" کہا کرتے تھے کیونکہ معتزلہ انسانی ارادے کی مکمل آزادی کے قائل تھے۔ ان کے عقائد کی اہم کتاب قاضی عبدالجبار کی **شرح الاصول الخمسہ** ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں **رسائل العدل والتوحید** کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے جو مشہور معتزلی علماء حسن بصری، قاسم الرسی اور عبدالجبار بن احمد کے تالیف کردہ ہیں۔

معتزلہ ایسی تمام آیات و احادیث کی تاویل کرتے تھے جو ان کے عقیدے کے خلاف ہوتی تھیں اس لئے وہ مکتب تاویل کے افراد شمار ہوتے تھے۔ معتزلہ نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ عباسی دور کی ابتدا میں یونانی فلسفے کے فروغ کی وجہ سے اسلام کے خلاف جو بلاخیز فکری طوفان آیا تھا معتزلہ نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ مامون اور معتصم جیسے جابر بادشاہ بھی معتزلہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن متوکل کے عہد میں معتزلہ کا زوال شروع ہوا کیونکہ حکمران ان کے مخالف ہوگئے تھے اور اہلحدیث ان پر کفر، ضلالت اور فسق کے فتوے لگا رہے تھے چنانچہ آہستہ آہستہ یہ مکتب معدوم ہوتا چلا گیا۔ معتزلہ کو معصوم اور مظلوم کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ انھوں نے بھی اپنے زمانہ عروج میں اپنے مخالفین کو شدید اذیتوں کا نشانہ بنایا تھا۔ بعدازاں جو کچھ ہوا اسے مکافات عمل کا نام دیا جاسکتا ہے مزید وضاحت کے لئے اس عنوان پر لکھی گئی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔[۱]

معتزلہ مندرجہ ذیل پانچ اصول دین کے قائل تھے:

۱۔ توحید: یعنی اللہ مخلوقات کی صفات سے پاک ہے اور اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھنا محال ہے۔

۲۔ عدل: یعنی اللہ تعالی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا اور وہ اپنی مخلوق کو معصیت پر مجبور نہیں کرتا۔

۱۔ زہدی حسن جار اللہ، المعتزلہ، طبع دوم، بیروت دار الاھلیۃ للنشر والتوزیع ۱۹۷۴ء۔

۳۔ **المنزلۃ بین المنزلتین:** یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ تو مومن ہے اور نہ کافر ہے بلکہ وہ فاسق ہے۔

۴۔ **وعد و وعید:** یعنی اللہ پر واجب ہے کہ مومنوں سے جنت اور کافروں سے دوزخ کا وعدہ پورا کرے۔

۵۔ **امر بالمعروف و نہی عن المنکر:** جب ظالم حکام نصیحت سے باز نہ آئیں تو ان کی مخالفت واجب ہے۔

اشعری اور ماتریدی عقائد

اشعری مذہب جس کی نمائندگی موجودہ اہلسنت والجماعت کرتے ہیں معتزلہ اور اہلحدیث[۱] کے درمیان ایک اعتدال پسند مذہب ہے۔ اس مکتب کا بانی ابوالحسن اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) پہلے معتزلی تھا۔ وہ چالیس سال تک معتزلی عقائد پر کاربند رہا لیکن ۳۰۰ھ میں اس نے بصرہ کی جامع مسجد میں معتزلی عقائد سے تائب ہوکر اہلسنت والجماعت کا مذہب اختیار کیا۔ اس نے اہلحدیث اور معتزلہ کے درمیانی راستے کا انتخاب کیا۔ اس نے عملی طور پر اہلحدیث کو تقویت پہنچائی لیکن اس کے لئے اس نے معتزلہ کا عقلی طریقہ استعمال کیا۔ اس کی اسی روش کی وجہ سے معتزلہ نے اس کی مخالفت کی جبکہ اہلحدیث نے بھی اسے اپنے موضوع میں جگہ نہ دی۔ اہلحدیث آج تک اسے معاف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ اسے بنیادی اصول سے روگردانی کا مجرم قرار دیتے ہیں اور بعض شدت پسند اہلحدیث اس پر کفر کا فتویٰ بھی صادر کرتے ہیں۔

اشعری کے زمانے میں ابو منصور ماتریدی سمرقندی (متوفی ۳۳۳ھ) بھی

۱۔ اہلحدیث سلفی بھی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ متقدمین میں محمد بن عبدالوہاب نجدی اور متاخرین میں عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے عقائد ونظریات کی پیروی کرتے ہیں۔

بعینہ ان ہی خطوط پر عمل کر رہا تھا ماتریدی کو بھی عقائد میں اہلسنت کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اشعری اور ماتریدی دونوں مذہب اہلسنت کے عقائد کے امام تھے لیکن بعض مسائل میں دونوں کی رائے یکساں نہیں تھی۔ کچھ افراد نے ان کے اختلافات کی تعداد گیارہ تک بیان کی ہے۔[1] اشعری قرآن اور حدیث کے ظاہری الفاظ کی تاویل سے بہت اجتناب کرتا تھا اور وہ تشبیہ وتجسیم کے پاتال میں بلاکیف کہہ کر اور مسائل قدر میں بالکسب کہہ کر جبر کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچنے کی کوشش کیا کرتا تھا جبکہ دوسرے فرقے اُس کی اس کوشش کو فکری اور اعتقادی مسائل میں اس کی نارسائی تصور کرتے تھے۔ بہرحال اشعری مذہب اہلحدیث کے سامنے سینہ سپر رہا اور رفتہ رفتہ عالم اسلام میں پھیل گیا۔[2]

(۳) ذوقی و اشراقی استدلال: اسلامی مکاتب فکر میں ایک ایسا مکتب بھی گزرا ہے جو علم کلام کے مسائل کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتا تھا اور پھر اس نظریے کا انتخاب کرتا تھا جو صوفیاء کے ذوق سے مطابقت رکھتا تھا۔ یہ مکتب عقلیات پر قائم فلاسفہ و متکلمین کے مسلک سے بالکل جدا تھا۔ اس مکتب کا بانی حلاج تھا۔[3]

اس مکتب میں امام غزالی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے **الجام العلوم عن علم الکلام** میں لکھا ہے کہ یہ ''خاصہ'' کا طرز فکر ہے۔ اس کے سوا باقی طرز فکر ''عامۃ'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''عامۃ'' اور ان کے پیروکار ''اولہ'' کو تو جانتے ہیں

۱۔ محمد ابوزہرہ، تاریخ المذاہب الاسلامیہ، قسم الاشاعرۃ والماتریدیۃ۔ آیت اللہ جعفر سبحانی الملل والنحل ص ا۔۳۔ فرد بل، الفرق الاسلامیۃ فی الشمال الافریقی ص ۱۱۸۔ احمد محمود صبحی، علم الکلام ج ا۔

۲۔ سبکی، طبقات الشافعیۃ ج ۳، ص ۳۹۱۔ یافعی، مرآۃ الجنان ج ۳، ص ۳۴۳۔ ابن کثیر البدایہ والنہایہ ج ۱۴، ص ۷۶۔

۳۔ مشہور صوفی منصور حلاج مراد ہے۔ منصور دراصل اس کے باپ کا نام تھا اور اس کا نام حسین تھا جو ۳۰۹ھ انا الحق کہنے پر سولی دیا گیا اور اس کی لاش کو جلا کر دریائے دجلہ میں بہا دیا گیا تھا۔

لیکن ''استدلال'' سے محروم ہیں۔[1]

ڈاکٹر سلیمان دینا نے غزالی اور دوسرے صوفیاء کے طرز فکر پر **الحقیقۃ فی نظر الغزالی** کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ ڈاکٹر احمد محمود صبحی نے غزالی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غزالی نے ذات باری کی حقیقت کے متعلق یہ فتوٰی دیا تھا کہ عوام کو اس میں غور و فکر کرنا حرام ہے۔ ہمیں غزالی کے اس فتوٰی سے تو کوئی اختلاف نہیں لیکن غزالی کی انتہا پسندی یہ ہے کہ اس نے ادیبوں، نحویوں، محدثوں، فقیہوں اور متکلمین سب کو عوام کے زمرے میں شامل کیا ہے اور یہ فتوٰی دیا ہے کہ ذات باری کی حقیقت کے متعلق **راسخین فی العلم** سے مراد صرف بحر معرفت میں ڈوبے ہوئے اولیاء ہیں جو کہ خواہشات دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ غزالی کی یہ عبارت ان لوگوں کے لئے سند ہے جن کا یہ دعوٰی ہے کہ حکمت اشراقیہ اور فیض کے متعلق غزالی کا ایک علیٰحدہ نکتہ نظر تھا۔ اسی نظریے کی وجہ سے ابو حامد غزالی کو حجۃ الاسلام کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد ڈاکٹر صبحی کہتے ہیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ فقہاء، مفسرین اور متکلمین کو تو **راسخین فی العلم** کی صف سے باہر رکھا جائے اور صوفیاء کو ہی علم میں راسخ قرار دیا جائے؟ کیا اس سے صوفیاء کے لئے مزید ''شطحیات'' کا دروازہ نہیں کھل جاتا؟ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فیض و اشراق اور اس کے درآمد شدہ اصول اسلامی عقائد کے لئے اتنے ہی مضر ہیں جتنا کہ متکلمین کے خود ساختہ مسائل نقصان دہ ہیں۔[2] اس کے باوجود تصوف نے اسلامی عقائد سے متعلق بھاری میراث چھوڑی ہے جس میں ''فتوحات مکیہ'' سرفہرست ہے۔[3]

(۴) حسی اور تجرباتی استدلال: اسلامی عقائد کے متعلق یہ بالکل نئی فکر

۱۔ امام غزالی، الجام العوام عن علم الکلام ص ۲۶۔

۲۔ ڈاکٹر احمد محمود صبحی، علم الکلام ج ۲، ص ۲۰۳۔

۳۔ شعرانی عبدالوہاب بن احمد، الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر۔

ہے اور اس فکر کے حامل زیادہ تر وہ علماء اور دانشور ہیں جو مغرب سے زیادہ متاثر ہیں۔ یہ علماء اور دانشور مصر، ہندوستان، عراق اور ان اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جو انگلستان، امریکا، جاپان اور فرانس کی نوآبادیات رہے ہیں۔ اس طرز فکر کے حامل افراد معرفت بشری کے ذرائع کے متعلق ایک خاص نکتہ نظر رکھتے ہیں اور وہ حسی اور تجرباتی اسالیب پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں قدیم عقلی طرز فکر اور ارسطو کی منطق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے **مابعد الطبیعاتی** علوم یعنی Metaphysics اور معارف دینیہ کو سائنسی اور تجرباتی میزان پر پرکھنے کی کوششیں کی ہیں۔[۲]

اس مسلک کے علماء اور دانشور معجزات کی مادّی تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبوت انسانی عبقریت کا دوسرا نام ہے۔ کچھ محققین نے اس طرز فکر پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔[۳] مثال کے طور پر سرسید احمد خان کی تالیفات۔[۴]

سرسید نے اپنی تفسیر قرآن میں سخت مغرب پسند ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تفسیر جدید سائنسی انکشافات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ سرسید کو اگرچہ مذکورہ طرز فکر کا پورا علمبردار تو نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے قرآن کے متعلق معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے اور یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی کہ قرآن مجید مکمل طور پر جدید علوم کا حامی ہے۔ اس طرز فکر کی فی الحال کوئی سرحد معین نہیں کی جاسکتی البتہ اس کا پرتو مختلف دینی مسائل اور جدید سائنسی مقالات میں پوری طرح سے دیکھا جاسکتا ہے۔[۴]

۲۔ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، التوحید فی الخالص او الاسلام والعقل۔

۳۔ ڈاکٹر عبدالرزاق نوفل، المسلمون والعلم الحدیث. فرید وجدی، الاسلام فی عصر العلم۔

۴۔ ترجمہ تفسیر قرآن ج ۱، ص ۶۔۲۵۔

۴۔ شیخ محمود شلتوت، تفسیر القرآن الکریم کے پہلے دس پارے ص ۱۱ تا ۱۳۔ ڈاکٹر علامہ اقبال، احیاء الفکر الدینی فی الاسلام جس کا فارسی ترجمہ احمد آرام نے کیا ہے ص ۱۴۷۔۱۵۱۔ سید جمال الدین افغانی، العروۃ الوثقی ج ۷، ص ۳۸۳، مطبوعہ اٹلی۔

(۵) **فطری استدلال:** اہل بیتؑ کی تعلیمات میں فطری استدلال کے بنیادی عناصر موجود ہیں جن کے بغیر اسلامی عقائد کا صحیح ادراک ممکن نہیں ہے۔ اس طرز فکر کی اساس قرآن وسنت سے ماخوذ ہے جیسا کہ قرآن مجید بتاتا ہے: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ یقیناً یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔ (سورۂ روم: آیت ۳۰)

اس آیت میں یہ اعلان ہے کہ معارف دین تک پہنچنے کا بہترین راستا انسان کی فطرت ہے اور فطرت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بری معاشرت اور خراب تربیت سے تبدیل نہ ہوئی ہو اور خواہشات کی پیروی اور ناحق بحث و مباحثہ سے اس کا نور مدھم نہ ہوا ہو۔ انسانوں کی اکثریت حق وحقیقت تک اس لئے نہیں پہنچ پاتی کہ عصبیت کی وجہ سے ان کا چراغ فطرت بجھ چکا ہے اور ان کی ہٹ دھرمی حقائق کے ادراک میں مانع ہے۔

حدیث میں بھی فطرت سلیمہ کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے: کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ یعنی ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔[۱]

فطری طرز فکر میں عقل، نقل، شہود، اشراق اور سائنسی انداز سب ہی شامل ہیں۔ اس طرز تفکر کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف ایک ہی طریقے پر انحصار نہیں کرتا بلکہ

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز وکتاب التفسیر ۳۰۔ ۱قدر، ۳۔ صحیح مسلم، کتاب القدر حدیث ۲۲۔۲۳۔۲۴۔ مسند احمد ج ۲، ص ۲۳۳۔ ۲۸۱، ج ۳، ص ۳۵۳ نیز آصف محسنی قندہاری کی صراط الحق میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

خدائی ہدایت کے تحت جہاں جس طریقے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے استفادہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

ہدایت کی توفیق اللہ کی طرف سے ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ یہ آپ پر احسان جتاتے ہیں کہ اسلام لے آئے ہیں۔(اے رسولؐ) آپ کہہ دیجئے کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو۔ اگر تم اپنے ایمانی دعوے میں سچے ہو تو اللہ تم پر اپنا احسان جتاتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کی ہدایت دی ہے۔(حجرات: آیت ۱۷) ایک اور آیت میں ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا... اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی کبھی بھی پاکباز نہ بن سکتا تھا۔ (سورۂ نور: آیت ۲۱)

اس طرز فکر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیروکار علم کلام کے مناظرات اور شکوک وشبہات سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ ائمہ اہل بیتؑ سے ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن میں دین کے متعلق خواہ مخواہ کی مناظرہ بازی سے منع کیا گیا ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مخالفین ایک مذہب رکھنے کے باوجود سو سے زیادہ مسائل کے متعلق اختلاف کا شکار ہیں۔[1] اللہ کی پیدا کردہ فطرت کو روایات اہلبیتؑ میں کبھی طینت اور کبھی عقل مطبوع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے علم حدیث کے ذخیروں کی طرف رجوع فرمائیں۔[2]

۱۔ علی بن طاؤس، کشف المحجة لثمرة المهجة ص ۱۱۔۲۰، مکتبة الداوری، قم۔

۲۔ اصول کافی ج ۱، ۳۱۰، باب الهداية ج ۲۔۳ باب طينة المؤمن والكافر، طبع چہارم مکتبة الاسلامیہ، تہران ۱۳۹۲ھ۔

عقائد سمجھنے کے لئے اہل بیتؑ کا طرز فکر

عقیدے کی بحث میں اس کے مصادر کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ قبلاً ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ قرآن اور حدیث اسلامی عقائد کا سرچشمہ ہے۔ دوسرے مکاتب فکر اور اہل بیتؑ کے مکتب فکر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اہل بیتؑ کا مکتب کسی صورت میں بھی قرآن اور حدیث سے جدا نہیں ہوتا اور ہر مسئلہ قرآن اور حدیث کے سائے میں حل کرتا ہے۔ وہ قرآن اور حدیث کے مقابلے میں کسی خواہش اور عصبیت کو ترجیح دینے پر آمادہ نہیں یہ مکتب اجتہاد کے بنیادی اصول میں بھی قرآن اور حدیث کو ہی اولین ماخذ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے:

(۱) اس مکتب فکر کے افکار کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پیرو اجتہاد کو نص پر مقدم نہیں کرتے اور یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ نص معارض سے خالی ہو یا اگر معارض موجود ہو تو وہ نص کے مفہوم کی مقاومت نہ کرسکتا ہو۔ جبکہ دوسرے مذاہب کا نصوص کے ساتھ رویہ کچھ بہتر نہیں۔ ایسے مکاتب بھی موجود ہیں جو کمزور تاویلات کا سہارا لے کر نصوص کی پابندی سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی فکر میں دکھائی دیتے ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ نے حارث بن حوط سے فرمایا تھا:... إِنَّكَ لَمْ تَعْرِفِ الْحَقَّ فَتَعْرِفَ مَنْ أَتَاهُ وَلَمْ تَعْرِفِ الْبَاطِلَ فَتَعْرِفَ مَنْ أَتَاهُ یعنی تم نے ابھی تک حق کو ہی نہیں پہچانا تو حق والوں کو کیسے پہچانتے اور تم نے باطل کو ہی نہیں پہچانا تو بھلا اہل باطل کو کیسے پہچانتے؟ (نہج البلاغہ، حکمت ۲۶۲)

(۲) مکتب اہل بیتؑ میں نص پر کسی چیز کو مقدم نہیں رکھا جاتا بشرطیکہ نص قطعی اور متواتر ہو۔ اسلامی عقیدے کے لئے یہ بنیادی شرط ہے کیونکہ تخمین وظن سے عقیدے کا اثبات ممکن نہیں ہے۔ اہل بیتؑ کے پیروؤں کی روش کو مدنظر رکھ کر سلفی حضرات کو بھی اپنی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ وہ عقیدے کے متعلق ضعیف اور اخبار

آحاد کو بھی قبول کرتے ہیں اور اپنے طرز فکر کے دفاع میں مرنے مارنے سے دریغ نہیں کرتے اور بعض ضعیف روایات پر انحصار کر کے مسلمانوں کو کافر کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ انھیں صرف روایت پسند ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ روایت کے صدق و کذب اور عام و خاص، محکم و متشابہ اور راوی کے حفظ و وہم کی جستجو اور تحقیق بھی کرلینی چاہئے۔

(۳) اسلامی عقائد کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ''ضروری'' اور ''نظری''۔ ضروری سے مراد وہ عقائد ہیں جن کا منکر دین سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً توحید، نبوت اور قیامت جو ضروریات دین میں سرفہرست ہیں۔ نظری عقائد سے مراد ایسے عقائد ہیں جن کے لئے تحقیق اور دلیل کی ضرورت محسوس ہو اور جن میں ارباب مذاہب میں اختلاف ممکن ہو۔ پس ضروری عقائد کا منکر کافر ہوتا ہے جبکہ نظری عقائد کا منکر کافر نہیں ہوتا۔

(۴) عقیدے میں قیاس اور استحسان قابل قبول نہیں ہیں۔

(۵) مکتب اہل بیتؑ اس بات پر بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل کے صحیح تقاضے صحیح منقول کے موافق ہوتے ہیں بشرطیکہ دونوں کے تقاضوں کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے اور ظنیات کو بطور مسلمات پیش نہ کیا جائے۔ معقول صریح کے مقابلے میں منقول ضعیف کو اور صحیح متواتر روایت کی جگہ پر خبر واحد کو نہ لایا جائے۔

(۶) ایسے تمام اجتہادات اور تعبیرات ناجائز ہیں جن کا مقصد بدعت کی آبیاری ہو۔

(۷) مکتب اہل بیتؑ تمام انبیاءؑ اور بارہ ائمہ اہل بیتؑ کو دلائل قطعیہ سے معصوم جانتا ہے اور جب ان سے کوئی چیز ثابت ہوجائے تو اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ مجتہد سے صحیح اجتہاد بھی ممکن ہے اور اس سے اجتہادی غلطی کا بھی امکان ہے البتہ اگر اس نے اجتہاد کی تمام شرائط کے مطابق حق تحقیق ادا کیا ہو تو وہ معذور ہے۔

(۸) امت میں محدث بھی موجود ہیں اور وہ بھی جن کو الہام ہوتا ہے اور وہ بھی جنھیں سچے خواب دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان ذرائع سے حقیقتوں کو پالیتے ہیں لیکن یہ تمام امور اثبات کے محتاج ہیں۔ عقیدہ و عمل میں ان کا بھی ایک مقام ہے لیکن اس کے لئے شرائط مقرر ہیں۔

(۹) تقویٰ اور ادب آداب کے ساتھ کیا جانے والا مناظرہ جس کا مقصد اجالا پھیلانا، حق پہنچانا اور عقائد کی ترویج کرنا ہو تو وہ قابل تعریف ہے لیکن اپنا علمی تبحر دکھانے کے لئے مناظرہ کرنا قابل مذمت ہے۔ مناظرے کے دوران ایسی کوئی بات ہرگز نہیں کہنی چاہئے جس کا پورا علم اور یقین نہ ہو۔

(۱۰) مکتب اہل بیتؑ بدعت سے متنفر ہے اور ہر وہ کام بدعت ہے جسے دین کے نام پر رائج کیا جائے جبکہ وہ دین میں سے نہ ہو۔ بعض لوگ کسی چیز کو بدعت اور کسی چیز کو سنت سمجھ لیتے ہیں لیکن جب تحقیق کی جاتی ہے تو وہ چیز بدعت یا سنت نہیں ہوتی اس لئے پہلے اچھی طرح سے تحقیق کرلینی چاہئے پھر فتویٰ دینا چاہیے۔[۱]

(۱۱) کسی کو کافر کہنے کے لئے انتہائی غور و فکر ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص خود اپنے کفر کا اقرار نہ کرے یا اس کے خلاف ناقابل تردید شہادت نہ ملے اس وقت تک کفر کا فتویٰ نہیں لگانا چاہئے کیونکہ ''تکفیر'' حد شرعی کا سبب ہے اور حد شرعی کیلئے قاعدہ یہ ہے کہ ''حدود، شبہات سے ٹل جاتی ہیں۔'' کسی کو کافر کہنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہاں اگر کوئی واقعی کافر ہوجائے تو پھر اسے کافر کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۲]

(۱۲) اختلافات کی صورت میں کتاب، سنت اور عترت کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا

۱۔ شریف مرتضیٰ علی بن حسین موسوی متوفی ۴۳۶ھ، رسائل الشریف المرتضیٰ، رسالہ الحدود والحقائق۔

۲۔ ان لوگوں کی تکفیر جو کہتے ہیں کہ اللہ کی صفات ہیں اور وہ ان صفات سے موصوف تھا اور انھوں نے ان کے اثبات کے لئے حد تشبیہ کو عبور کیا۔

تَبِعْتُمُ الشَّیْطَانَ اِلَّا قَلِیْلاً اگر لوگ (اس امر کو) رسول اور اپنے صاحبان امر کے پاس پہنچاتے تو تحقیق کرنے والے (صاحبان امر) اس امر کی تحقیق کر لیتے۔ اور اگر تم پر فضل و کرم نہ ہوتا تو معدود چند لوگوں کے سوا سب شیطان کے پیرو ہوجاتے۔ (سورۂ نساء: آیت۸۳)

(۱۳) صفات باری کے متعلق مکتب اہل بیتؑ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ وہ بذات خود زندہ ہے، حیات کی وجہ سے زندہ نہیں ہے۔ وہ بذات خود قادر ہے اور بذات خود عالم ہے۔ اللہ ان معنوں میں صفات سے موصوف نہیں جیسا کہ مشبہہ کہتے ہیں۔ صفات باری کے متعلق جو بدترین نظریہ ابوہاشم جبائی نے پیش کیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اہل توحید سے جدا ہوا تھا مذہب اہل بیتؑ ایسے تمام نظریات کا ابطال کرتا ہے۔ صفات باری کے متعلق امامیہ اور معتزلہ کا مجموعی عقیدہ یہی ہے البتہ معتزلہ میں سے چند ایک نے اس بات سے اختلاف کیا ہے جن کی نشاندہی ابھی ہم نے کی ہے۔ امامیہ اور معتزلہ کے علاوہ زیدیہ، اکثر مرجہ اور اصحاب حدیث کی ایک جماعت کا تعلق یا تو اہل اثبات سے ہے یا پھر اہل تعطیل سے۔[۱]

(۱۴) مکتب اہل بیتؑ اشیا کے حسن و قبح کو عقلی جانتا ہے اور یہ مکتب اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے کہ عقل بعض اشیا کے حسن و قبح کو فوراً محسوس کر لیتی ہے۔

توحید کے متعلق نظریات: مکتب اہل بیتؑ توحید میں تنزیہ مطلق پر ایمان رکھتا ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے: لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ کوئی چیز اس کی مثل نہیں ہے اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ (سورۂ شوریٰ: آیت۱۱) علاوہ ازیں مکتب اہل بیتؑ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ حاسہ چشم سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنا محال ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے: لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ یعنی

۱۔ شیخ مفید، اوائل المقالات ص ۱۸۔

آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں جبکہ وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے۔ (سورۂ انعام: آیت۱۰۳) اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی صفات سے متصف کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ فرمان الٰہی ہے: سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ وہ ان باتوں سے جو اس کی نسبت بیان کرتے ہیں پاک ہے (اور اس کی شان ان سے) بلند ہے۔ (سورۂ انعام: آیت۱۰۱) سُبْحَانَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ جو کچھ یہ بیان کرتے ہیں آسمانوں اور زمین اور عرش کا پروردگار ان باتوں سے پاک ہے۔ (سورۂ زخرف: آیت۸۲)

عدل کے متعلق نظریات: مکتب اہل بیتؑ اللہ تعالیٰ کو عادل بتاتا ہے اور اس سے ظلم کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ ... بیشک اللہ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ (سورۂ نساء: آیت۴۰) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ بیشک اللہ تو انسانوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ (سورۂ یونس: آیت۴۴)

نبوت کے متعلق نظریات: نبوت کے متعلق مکتب اہل بیتؑ کا پیغام یہ ہے کہ انبیاء مطلقاً معصوم ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ... اور کبھی نہیں ہوسکتا کہ نبی خیانت کرے اور خیانت کرنے والوں کو قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز لاکر حاضر کرنی ہوگی (سورۂ آل عمران: آیت۱۶۱) قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (اے رسولؐ) آپ کہہ دیجئے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے یوم عظیم کے عذاب کا خوف ہے۔ (سورۂ انعام: آیت۱۵) مکتب اہل بیتؑ انبیائے کرامؑ کو وحی پہنچانے میں بھی معصوم سمجھتا ہے ارشاد باری ہے: وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْہُ بِالْیَمِیْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْہُ الْوَتِیْنَ اگر یہ پیغمبر اپنی طرف سے ہماری نسبت کوئی بات خود بنالیتے تو ہم ان کے ہاتھ کو پکڑ لیتے۔ پھر ان

کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ (سورۂ حاقہ: آیت۴۴تا۴۶) مکتب اہل بیتؑ فرشتوں کو بھی معصوم سمجھتا ہے: ... لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور انھیں جو حکم دیا جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔ (سورۂ تحریم: آیت۶)

امامت کے متعلق نظریات: مکتب اہل بیتؑ کا نظریہ ہے کہ امامت ایک خدائی عہدہ ہے اور غیر معصوم امام نہیں ہوسکتا مگر عصمت کی شرط امامت کبریٰ کے لئے ہے اور امامت کبریٰ سے مراد دنیا اور دین کے امور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی ہے۔ یہ شیعہ نظریہ اس آیت پر قائم ہے: وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیمؑ کو آزمایا تو وہ ان میں پورے اترے۔ خدا نے کہا کہ میں تم کو لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (امام بنانا)۔ ارشاد ہوا کہ ہمارا یہ عہدہ ظالموں کیلئے نہیں۔ (سورۂ بقرہ: آیت۱۲۴)

الغرض ان نصوص قطعیہ کی بنیاد پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انبیاء اور ائمہ کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں اور اللہ نے انھیں خواب کی غلطی سے بھی معصوم بنایا ہے۔[1]

مکتب اہل بیتؑ میں استنباط کے لئے عقل کا مقام

مکتب اہل بیتؑ معتزلہ کی افراط اور اہلحدیث کی تفریط کے بین بین عقل کو ایک خاصا مقام عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ شیخ مفید (متوفی ۴۱۳ھ) رقم طراز ہیں: اگر کوئی یہ کہے کہ مذہب امامیہ کے ائمہ کے متعلق متواتر روایات موجود نہیں ہیں بلکہ ان کے لئے اخبار آحاد ہیں تو ہمارے مذہب کی صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں

۱۔ شیخ مفید، اوائل المقالات.

پڑے گا کیونکہ اخبار احاد کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس ایسے عقلی دلائل بھی موجود ہیں جو ائمہ ہدیٰ کی امامت کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ مذکورہ نقلی روایات باطل ہوتیں جیسا کہ مخالفین کہتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ عقلی دلائل بھی باطل ہوجاتے جو ائمہ کی امامت کو ضروری قرار دیتے ہیں...[1]

شیخ مزید لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی توفیق و مشیت سے میں اس کتاب میں مذہب شیعہ اور مذہب معتزلہ کا فرق واضح کروں گا اور اس کے ساتھ ساتھ عدل الٰہی کا نظریہ رکھنے والے شیعوں اور عدل الٰہی کا عقیدہ رکھنے والے معتزلہ کا باہمی فرق بھی اجاگر کروں گا۔[2]

شیخ صدوق محمد بن بابویہ (متوفی ۳۸۱ھ) فرماتے ہیں: خدا کی سنت یہ ہے کہ پہلے وہ عقل میں کسی چیز کے حقائق کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اس کے بعد اس چیز کی دعوت دیتا ہے کیونکہ اگر عقل میں پہلے سے اس کی تصویر ہی موجود نہ ہو تو پھر دعوت کا کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ اشیا عقل میں اپنی صورت بناتی ہیں اور اپنے متضاد کی بھی خبر دیتی ہیں۔ اگر عقل میں انبیاء کا انکار پہلے سے موجود ہوتا تو خدا کبھی بھی کسی نبی کو مبعوث نہ کرتا۔[3]

شیخ صدوق مزید لکھتے ہیں: اس سلسلے کی صحیح ترین گفتگو یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ہم نے خدا کو خدا کے ذریعے سے ہی پہچانا ہے کیونکہ اگر ہم نے خدا کو اپنی عقل سے پہچانا تو عقل بھی تو خدا نے عطا کی ہے اور اگر ہم نے خدا کو انبیاء اور ائمہ کے ذریعے سے پہچانا تو انھیں بھی تو خدا نے مبعوث کیا ہے اور اسی نے ہی انھیں اپنی حجت قرار دیا ہے۔ اور اگر ہم نے خدا کو اپنے نفوس سے پہچانا تو ہمارے نفوس بھی تو

۱۔ شیخ مفید، المسائل الجارودیہ ص۳۶۔

۲۔ شیخ مفید، اوائل المقالات.

۳۔ شیخ صدوق، اکمال الدین واتمام النعمۃ.

خدا کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا ذریعہ معرفت جو بھی ہو اس کا آخری نتیجہ یہی ہوگا کہ ہم نے خدا کو خدا ہی سے پہچانا۔[۱] اور عقل کے متعلق یہ طرز عمل یعنی اسے انبیاءؑ اور ائمہ ہدیٰ کے پہلو بہ پہلو تسلیم کرنا مذہب امامیہ کا ہی طرۂ امتیاز ہے اور مکتب اہلبیتؑ کے علاوہ کسی بھی مذہب میں عقل کو یہ پذیرائی نہیں ملی۔

صادق آل محمدؐ سے اس سلسلے میں یہ حدیث مروی ہے: لَوْلَا اللّٰهُ مَا عُرِفْنَا وَلَوْلَا نَحْنُ مَا عُرِفَ اللّٰهُ یعنی اگر خدا نہ ہوتا تو ہماری پہچان نہ ہوتی اور اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی پہچان نہ ہوتی۔[۲]

شیخ صدوق اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا کی حجتیں نہ ہوتیں تو اس کی مکمل پہچان نہ ہوتی اور اگر خدا نہ ہوتا تو حجتوں کو کوئی نہ پہچانتا۔[۳]

علم کلام کے مناظروں کے متعلق مکتب اہل بیتؑ کا نظریہ

مناظرے کے متعلق دو قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ اہلحدیث علماء کے نزدیک علم کلام کے مسائل پر گفتگو کرنا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے جب کہ معتزلہ کا دارومدار ہی علم کلام کے مباحثوں پر رہا ہے۔ یہ دونوں نظریات افراط وتفریط پر مبنی ہیں جبکہ مکتب اہل بیتؑ کا نظریہ دونوں انتہاؤں کے بیچ میں ہے اور مکتب اہل بیتؑ مناظرہ کے لئے اعتدال پسندانہ نکتہ نظر رکھتا ہے۔

مذہب اہلبیتؑ قرآن کریم کی اتباع میں مناظرے کو دو قسموں میں تقسیم کرتا ہے:

(۱) اچھا مباحثہ (۲) برا مباحثہ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ

۱تا۳۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید ص۲۹۰۔

(اے رسولؐ) لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت سے اپنے رب کے راستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریقے سے ان سے مناظرہ کرو۔ جو راستے سے بھٹک گیا ہے تمہارا رب اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو راستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہے۔ (سورۂ نحل: آیت ۱۲۵)

شیخ مفید مناظرے کے متعلق مکتب اہل بیتؑ کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جماعت صادقین نے اپنے ماننے والوں میں سے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ مخالفین سے مناظرہ نہ کریں اور دوسرے گروہ کو حکم دیا کہ وہ مخالفین سے مناظرہ کریں اور انھیں حق کی دعوت دیں۔ معصومین نے دونوں گروہوں کے حالات کو مدنظر رکھ کر انھیں علیحدہ علیحدہ حکم دیا۔ جو گروہ حق کی صحیح ترجمانی سے قاصر تھا اسے مناظرہ کرنے کا اہل قرار نہیں دیا گیا اور جو گروہ احقاق حق اور ابطال باطل کی صلاحیت رکھتا تھا اسے اس کا حکم دیا گیا۔[۱]

شیخ مفید کے کلام میں جماعت صادقین سے مراد عترت طاہرہ کے وہ معصوم امام ہیں جن کی طہارت کی خبر خدا نے دی ہے اور جنھیں خدا نے ہر رجس سے پاک رکھا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا اے اہل بیتؑ! اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے ہر طرح کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمھیں اس طرح سے پاک رکھے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

اور جماعت صادقین سے مراد وہ معصوم ہستیاں ہیں جن کے متعلق خدا نے حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۱۹)

جماعت صادقین ان ائمہ ہدیٰ پر مشتمل ہے جن کی امامت پر رسول اکرمؐ نے نص فرمائی اور ہر پہلے امام نے دوسرے کے متعلق نص فرمائی یہاں تک کہ ان کی

۱۔ شیخ مفید، تصحیح الاعتقاد ص ۶۶۔

تعداد پوری ہوگئی۔ احادیث میں ائمہ ہدیٰ کے متعلق مختلف الفاظ میں اعلان موجود ہیں اور حدیث نبوی میں ان کی تعداد بھی موجود ہے اور ان کے پہلے امام پر واضح الفاظ میں نص بھی موجود ہے۔ جو حضرات تفصیل کے خواہشمند ہوں تو وہ اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔[1]

معرفت الٰہی کے متعلق غور وفکر واجب ہے

مکتب اہل بیتؑ میں عقل وشریعت کو ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ حلیف سمجھا جاتا ہے جیسا کہ شیخ صدوق نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے زُہرہ کو پھر چاند کو اور پھر سورج کو دیکھا اور جب سب کو غروب ہونے والا پایا تو فرمایا: یَا قَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ اے میری قوم! میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے مگر اس کے باوجود وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ دلیل کے بغیر توحید کو ثابت نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیان کردہ دلیل کو اپنی القائی حجت بتایا ہے: وَتِلْکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰھَآ اِبْرٰھِیْمَ عَلٰی قَوْمِہٖ یہ ہماری وہ دلیل تھی جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے پر دی تھی۔

معرفت توحید کے لئے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے مستغنی نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ سے فرمایا: فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ آپ جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔[2]

شیخ صدوق کا مقصود یہ ہے کہ عقل وحی کے بغیر معرفت پروردگار حاصل کرنے

۱۔ اس موضوع کے لئے ابن عیاش جوہری کی کتاب مقتضب الاثر فی النص علی عدد الائمة الاثنی عشر، ابن طولون دمشقی کی کتاب الشذرات الذهبية فی ائمة الاثنا عشرية، شیخ مفید کی کتاب المسائل الجارودیہ اور شیخ حر عاملی محمد بن حسن کی کتاب اثبات الهداة بالنصوص والمعجزات کا مطالعہ کیجئے۔

۲۔ شیخ صدوق، کتاب التوحید ص ۲۹۲۔

سے قاصر ہے لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ عقل بالکل ہی بے سود ہے اور جن نتائج پر عقل پہنچاتی ہے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

شیخ مفید لکھتے ہیں کہ عقل اپنے مقدمات اور نتائج کے لئے وحی کی محتاج ہے[1] اور ساتھ ہی وہ تفہیم عقائد کیلئے عقل کے استعمال پر بھی زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کے متعلق کلام کرنے سے جو منع کیا گیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو مخلوق سے تشبیہ نہ دی جائے اور اس پر مخلوق کے احکام جاری نہ کئے جائیں۔[2]

شیخ مفید اپنے مخالفین کو عقل استعمال نہ کرنے پر مطعون کرتے اور ضعیف الرائے قرار دیتے تھے۔ انہوں نے ایک مقام پر لکھا ہے: فِی الْعُدُوْلِ عَنِ النَّظَرِ الْمَصِیْرِ اِلَی التَّقْلِیْدِ الْمَذْمُوْمِ بِاتِّفَاقِ الْکَلِمَةِ یعنی فکر ونظر کو چھوڑ کر تقلید مذموم کو اختیار کرنا بالاتفاق قابل مذمت ہے۔[3]

مکتب اہل بیتؑ میں نقل کا مقام اور کردار

جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں دین کی معرفت کے لئے اگرچہ عقل کا کردار اہم ہے لیکن جب تک عقل کے ساتھ وحی کا نور شامل نہ ہو اس وقت تک وہ صحیح راستے کو ازخود تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی اور تمام اسلامی مذاہب اور کلامی مکاتب اس نکتے پر متفق ہیں۔

البتہ اگر اختلاف ہے تو وہ نقل (یعنی حدیث) کے حدود کے متعلق ہے کیونکہ نقل کبھی تو خبر متواتر کی صورت میں ہم تک پہنچتی ہے اور اس کے بیان کرنے والے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ دل اس پر مطمئن ہوجاتا ہے کہ رسول اکرمؐ یا عترت طاہرہ یا صحابہ نے یہ بات کہی ہے اور کبھی حدیث ہم تک متواتر نہیں پہنچتی

۱۔ اوائل المقالات ص ۱۱۔۱۲۔

۳،۲۔ تصحیح الاعتقاد بصواب الانتقاد یہ کتاب ۱۳۷۱ھ میں تبریز سے اوائل المقالات کے ساتھ ہی شائع ہوئی تھی۔

اور اس سے ایک قوی یا ضعیف قسم کا ''ظن'' پیدا ہوتا ہے۔ کبھی حدیث خبر واحد کی شکل میں بھی ہم تک پہنچتی ہے۔ اگر حدیث خبر واحد تک محدود ہو تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ''ظن'' شک سے کچھ زیادہ دور نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں مکتب اہل بیتؑ کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک ایسی روایت کے ساتھ کوئی ایسا قرینہ موجود نہ ہو جس سے اس کی صداقت ظاہر ہوتی ہو تو اس وقت تک اس روایت پر انحصار کرنا صحیح نہیں ہے۔

عقیدے کے لئے خبر واحد ناکافی ہے

جب کسی روایت کا تعلق عقیدے سے ہو تو مکتب اہل بیتؑ میں اس کے متعلق سخت احتیاط برتی جاتی ہے اور عقیدے کا استدلال ضعیف دلیل اور کمزور حجت کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ دور حاضر میں احتیاط کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ہمارے اور رسول اکرمؐ کے عہد میں چودہ سو سال کا طویل فاصلہ حائل ہے اس لئے ہمیں ظنیات سے اجتناب کر کے مسلمات کو اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم فتنوں سے محفوظ رہ سکیں۔ جب ہم مسلمات کو اپنائیں گے تو ایسے مباحثوں سے بچ جائیں گے جن سے اسلام اور اس کی رویات کو خطرات لاحق ہوئے۔

اس سلسلے میں شیخ مفید فرماتے ہیں: اور میں یہ کہتا ہوں کہ اخبار آحاد پر عمل واجب نہیں ہے۔ کسی شخص کے لے جائز نہیں ہے کہ خبر واحد کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرے تاآنکہ اس کے راوی کی صداقت کی کسی اور طریقے سے تصدیق نہ ہوجائے۔ اور یہی تمام شیعوں اور بہت سے معتزلہ اور محکمہ اور مرجئہ کے ایک گروہ کا نظریہ ہے لیکن فقہائے عامہ اور اصحاب الرائے اس سے متفق نہیں ہیں۔[1]

مذکورہ تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کے پیروکار اعتقادی مسائل میں

۱۔ اوائل المقالات ص ۱۰۰، مطبوعہ تبریز، ایران۔

کس قدر احتیاط برتتے تھے اتنی سخت احتیاط کا حکم بھی انھیں ائمہ اہل بیتؑ کی طرف سے ملا تھا۔ ائمہ اہل بیتؑ نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا تھا:

(۱) اَخُوکَ دِینُکَ فَاحۡتَطۡ لِدِیۡنِکَ یعنی تیرا دین تیرا بھائی ہے لہٰذا اپنے دین میں احتیاط کرو۔

(۲) اَوۡرَعُ النَّاسِ مَنۡ وَقَفَ عِنۡدَ الشُّبۡهَةِ یعنی وہ آدمی بڑا پرہیزگار ہے جو مشتبہ چیزوں سے رک جائے۔

اختتام بحث

اسلامی عقائد کے لحاظ سے مکتب اہل بیتؑ بہترین مکتب ہے اور علم و معرفت کے جتنے بھی ذرائع ہیں مکتب اہل بیتؑ ان سب سے استفادہ کرتا ہے لیکن وہ الٰہیات کے مسائل اور صفات باری کے متعلق مذکورہ ذرائع کی مداخلت کو درست قرار نہیں دیتا کیونکہ الٰہیات کے مسائل اس کی عقل کے دائرے سے باہر ہیں۔

مکتب اہل بیتؑ صرف ایک ہی ذریعے پر انحصار نہیں کرتا جیسا کہ اہلحدیث صرف نقل پر اور اہل تصوف صرف ذوق پر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مکتب اہل بیتؑ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی ذریعۂ علم کو اس کی قدر و قیمت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مثلاً وہ عقل کو اس کا مناسب مقام تو دیتا ہے لیکن اسے استقلالی حیثیت دینے پر آمادہ نہیں ہے اور حواس کی حدود سے غائب اشیا اور روز قیامت کی تفصیلات کے متعلق عقل سے ذرہ برابر بھی رہنمائی قبول نہیں کرتا مگر اس کے باوجود یہ مکتب عقل کی بے قدری بھی نہیں کرتا اور مکتب اہل بیتؑ نے صریح الفاظ کے ساتھ یہ پیغام دیا کہ نور عقل کی روشنی کے بغیر وحی کا سمجھنا مشکل ہے۔

مکتب اہل بیتؑ احتیاط پسند مکتب ہے اس لئے وہ ہر قسم اور ہر طرح کی روایت اور سنت و نقل پر اس وقت تک اعتماد کا اظہار نہیں کرتا جب تک اس کی

نسبت کے متعلق یقین نہ ہوجائے کہ واقعی رسول اکرمؐ یا صحابہ یا ائمہ ہدیٰ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ اور جب تک خبر واحد دوسری نصوص اور کتاب اللہ سے ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک اس پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔اور روایات و اخبار کے لئے خاص و عام، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور حقیقت و مجاز کا جاننا انتہائی ضروری ہے اور ان تمام چیزوں کے لئے جامع ترین لفظ ''اجتہاد'' ہے جس کے معنی نصوص سے مرادِ شرعی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنے کے ہیں۔

مکتب اہل بیتؑ میں مناظرہ فساد کا دروازہ کھولنے کے لئے نہیں بلکہ رب العالمین کے دین کی دعوت کے لئے کیا جاتا ہے اور ایسا مناظرہ احسن انداز سے کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مناظرے میں ہمیشہ حکمت اور نصیحت کے اصولوں کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ اور اگر مناظرہ صرف اپنی تجلیل اور دوسرے کی تذلیل یا فساد کی غرض سے ہو تو ایسے مناظرے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

ہم اپنے مضمون کا اختتام اس آیت قرآنی اور ارشاد ربانی پر کرتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا... اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ہم (اعمال میں) کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ایسے ہی لوگ جنتی ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ہم ان کے سینوں سے ہر کینہ کو الگ کر دیں گے۔ ان کے قدموں تلے نہریں جاری ہوں گی اور وہ کہیں گے کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں تک آنے کا راستا بتادیا اور اگر خدا ہم کو راستا نہ دکھاتا تو ہم راستا نہ پاسکتے تھے۔ بیشک ہمارے رب کے سب رسول دین حق لے کر آئے تھے اور (اس روز) انھیں آواز دی جائے گی کہ یہ وہ جنت ہے جس کا تمھیں تمہارے اعمال کی بنا پر وارث بنایا گیا ہے۔ (سورۂ اعراف: آیت ۴۲ـ۴۳)

صلی اللہ علی

محمد

و آلِ محمدؐ

طالبِ دعا: سید حسن علی نقوی